رزم بزم

جب ترکی کے نامور فاتح مراد ثانی نے وفات پائی تو بدقسمتی سے اس
سالہ بیٹا محمد خاں وطن سے دور ایشیا ئے کوچک کی مہمات میں الجھا ہوا تھا۔
قاصدوں اور تیز رفتار ہرکاروں نے نوجوان ولی عہد کو اس کے باپ کے سانحۂ
کی افسوسناک خبر پہنچا کر وطن فوراً واپس چلنے کی درخواست کی، محمد خان نے
ۂ دانیال عبور کیا اور ادریانوپل میں داخل ہو گیا۔

ادریانوپل میں بڑے بڑے فوجی عہدیدار اور نوجوان ولی عہد کے
راہ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ سب یہاں اس لئے نہیں جمع ہو رہے تھے
عہد کی رسم تاج پوشی کی تقریب میں حصہ لے سکیں بلکہ یہ لوگ نئے بادشاہ کی
ہی اور مصاحبت کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں اور کارنامے انجام دے کر اس
کا دل سلطان کے مزاج میں رسوخ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

مرحوم سلطان کی بیوی بھی اپنے آٹھ دس ماہ کے بیٹے کو سینے سے لگائے
شاہ کا انتظار کر رہی تھی، یہ ولی عہد کی سوتیلی ماں تھی اور مذہباً عیسائی تھی۔
ویا نے اپنی شرمناک اور فرقت آمیز شکست کے موقع پر اپنی بیٹی کی شادی
مراد ثانی سے کر دی تھی اور اب شاہ سرویا کی بیٹی بیوہ ہو چکی تھی۔ اسے جیسے
سلطان کے قریب آنے کی خبریں مل رہی تھیں، خوف سے اس کا دل بیٹھا جا
ا۔ وہ اپنے معصوم بیٹے کو بار بار اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیتی اور پھر خوب
پیار کرتی۔ پھر اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اپنے روبرو کر لیتی،
ایت افسوس سے کہتی "افسوس کہ تو لڑکا ہے، کاش تو بیٹی ہوتا۔ تیرا باپ مر
ے اور تیرا سوتیلا بھائی تاج و تخت سنبھالنے ادریانوپل میں داخل ہو چکا ہے
نہیں ہوں کہ تیرا کیا حشر ہو گا۔"

بچہ ماں کے رنج و غم سے نا آشنا، مسکرانے لگا ماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے بے اختیار بچے کے گالوں کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ بچے کا دم گھٹا تو وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اسی وقت ایک کنیز بھاگتی ہوئی آئی اور سروین شہزادی کو مطلع کیا۔

"شہزادی صاحبہ! یحییٰ جبری سردار آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

شہزادی نے خوفزدہ ہو کر بچے کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی آنکھیں ڈر سے ابل پڑی تھیں۔ پوچھا "یحییٰ جبری سردار کے ارادے کیسے لگتے ہیں؟"

کنیز نے جواب دیا "ارادے اچھے ہوتے تو وہ جبر و زیادتی سے کام نہ لیتا۔ جب آپ کے خدام اور محافظین نے اسے روکنا چاہا تو اس نے دھمکی دی کہ اگر اس کی راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے یحییٰ جبری دستے کی مدد سے آپ کے خدام اور محافظین کو قتل کر کے اندر چلا جائے گا۔"

سروپا کی بیوہ شہزادی زار و قطار رونے لگی۔ "میں جانتی ہوں کہ یحییٰ جبری سردار مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ مجھ سے نہیں اس بچے سے ملنا چاہتا ہے۔" پھر کنیز سے مؤرخانہ لہجے میں پوچھا "کیا تو اسے چھپا نہیں سکتی؟ تو اگر اسے کہیں چھپا دے تو میں بعد میں تجھے مالا مال کر دوں گی۔"

کنیز نے بے بسی سے جواب دیا "حضور ملکہ صاحبہ! اگر میری کوئی اولاد ہوتی تو میں اس وقت اسے آپ کے بیٹے پر قربان کر دیتی، آپ کا بیٹا میں نے لیتی اور اپنا آپ کہ دے دیتی۔ آپ میرے بیٹے کو شوق سے یحییٰ جبری سردار کے حوالے کر دیجئے۔"

شہزادی نے ایلوسی سے پوچھا "پھر اب میں کیا کروں، میری عقل تو کام نہیں کر رہی، کچھ تو ہی بتا۔"

کنیز نے جواب دیا "کسی بھی طرح اس وقت تک اپنے بچے کو یحییٰ جبری سردار یا اسی نوع کے دوسرے خونخواروں سے محفوظ رکھیے جب تک نیا بادشاہ رسم تاجپوشی نہیں ادا کرتا۔"

"پھر؟ پھر کیا ہوگا؟ پھر میں کیا کروں گی؟"

کنیز نے جواب دیا "جشن تاجپوشی میں آپ بھی شریک ہوں گی آپ اپنے بچے کو سینے سے لگائے نئے بادشاہ کے قریب پہنچ جائیے گا اور اسے تاج و تخت کی مبارکباد دیتے کہ روتے ہوئے اپنا بچہ اس کے حوالے کر دیجئے گا اور کہیئے گا کہ اسے

سلطان! یہ تیرے باپ کی امانت ہے اور تجھے پورا پورا اختیار ہے کہ چاہے تو اس امانت کو ایک امین کی طرح محفوظ کر دے ورنہ ماضی کے دوسرے ترک بادشاہوں کی طرح تو بھی اسے ہلاک کر دے کیونکہ ہر نیا ترک حکمران فتنہ و فساد کے ڈر سے اپنے بقیہ بھائیوں کو قتل کرتا چلا آیا ہے۔!"

شہزادی نے سوگوار آنکھیں اوپر اٹھا دیں اور سوال کیا۔ "تیرا کیا خیال ہے کیا اس طرح سلطان محمد خان اسے معاف کر دے گا؟"

"شہزادی صاحبہ!" کنیز نے بکنے کی بات سمجھائی۔ "انسانی مزاج کا اعتبار ہو یا نہ ہو، لیکن بادشاہوں کے مزاج کا واقعی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بڑی سے بڑی بات کو ہنس کر گوارا کر لیتے ہیں اور بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی معمولی سی بات پر زندگیاں چھین لیتے ہیں۔"

"میں تیری بات کی معنوی ترکیب پر عمل کرنے کو تیار تو ہوں، مگر اس وقت یہ بنی چہری سردار سے اپنے بیٹے کو کس طرح بچاؤں؟"

کنیز نے فوراً بے تکلفی اختیار کی، بولی۔ "اب میرے پاس اتنا فالتو دماغ نہیں ہے کہ جو بات میرے بس کی نہیں ہے اس میں بھی بلاوجہ سر کھپاؤں۔ یہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے اس پر جس دردمندی اور قلق سے آپ سوچیں گی، میں نہیں سوچ سکتی۔"

شہزادی سہم کر چپ ہو گئی۔ وہ اسی لئے ڈر گئی کہ اگر اب وہ زیادہ اصرار کرے گی تو کہیں یہ کنیز اس بنی چہری سردار کو لے کر ہی نہ آجائے کیونکہ جس ذات سے ان خدام اور کنیزوں پر اسی کا اقتدار اور رعب قائم تھا وہ رخصت ہو چکا تھا اور اب وہ سرتاپا انہی کمزوروں کے رحم و کرم پر زندہ تھی۔

شہزادی نے اپنے بچے کو آغوش میں چھپا لیا اور محل میں اس گوشے کی تلاش میں نکل گئی جہاں وہ اپنے معصوم کو بنی چہری سردار سے بچا سکتی تھی۔ ابھی وہ چند کمرے بھی نہ طے کر سکی تھی کہ بنی چہری سردار اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے شہزادی کو ڈانٹ دیا۔ "کہاں جاتی ہے ادنا مراد عورت! میں کہتا ہوں ٹھہر جا۔"

شہزادی سہم کر رک گئی اور اس نے اپنے بچے کو مضبوطی سے بھینچ لیا اور شامہ کرتی ہوئی بولی۔ "بنی چہری سردار! میں تمہارے قدموں میں گر جانے کو تیار ہوں۔ خدا کے لئے تم مجھ سے میرے معصوم کو مت چھینو۔"

بنی چہری سردار شہزادی کے سر پر پہنچ چکا تھا، اس کے گول سر تنگ پیشانی

کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں میں سفاکی اور بے رحمی اس طرح عیاں تھی جیسے کسی حبشی کے سیاہ چہرے پر موٹے موٹے ہونٹوں کے درمیان سفید سفید دانت۔ اس نے شہزادی کو حکم دیا۔ "سروبیا کی شہزادی! مجھے معلوم ہے کہ تو مرحوم بادشاہ کی بیوی رہ چکی ہے لیکن اب وہ بادشاہ چونکہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہے اس لئے اب ہم سب کی وفاداریاں نئے سلطان محمد خان کی طرف منتقل ہو جانی چاہئیں گی اور اگر خدا نے تجھے ذرا سی بھی عقل دی ہے تو تجھے بھی اپنے نئے بادشاہ کے لئے قربانی دینی چاہیئے۔"

شہزادی کی آنکھیں برسنے لگی تھیں اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بنی چری سردار کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بنی چری سردار! میں اپنے نئے سلطان پر اپنی جان قربان کر سکتی ہوں لیکن اپنے معصوم بچے کا گناہ کر کوئی گمنام سر گز نہ پہنچنے دوں گی۔"

بنی چری سردار نے بچے کی گردن پکڑ لی۔ بولا۔ "اے چھوڑ دے ورنہ یہ تیری گود ہی میں ہلاک ہو جائے گا۔"

اس شور و غل اور واویلا میں محل کے خدام اور محافظ بھی پہنچ گئے ان میں شاہی قرابت دار بھی تھے۔ بنی چری سردار نے ان سب کو ڈانٹ دیا۔ "تم سب اپنی اپنی جگہوں پر چلے جاؤ۔ نیا بادشاہ کسی بھی قیمت پر اپنی حکومت کے اس رقیب کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے ایک وفادار نمک خوار کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں کسی فرمان سے پہلے ہی یہ روا نئی اور رسمی قانون پا فرمان بجا لاؤں۔"

ایک محافظ آگے بڑھا اور اس نے بنی چری سردار کو دھکا دے کر بچے کی گردن اس کی گرفت سے چھڑا دی، بولا۔ "بنی چری سردار! میں جانتا ہوں کہ تم لوگ بادشاہ کے کتنے وفادار اور جاں نثار رہتے ہو لیکن شہزادی کی طرف سے میں تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ تم اس معصوم بچے کو کم از کم اسی وقت تک زندہ رہنے دو جب تک کہ نیا سلطان خود اس سلسلے میں اپنا کوئی فیصلہ نہ صادر کر دے۔"

شہزادی نے شکر گزار نظروں سے اپنے حامی محافظ کو دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

بنی چری سردار ایک دم مشتعل ہو گیا۔ بولا۔ "احمق کم حیثیت چرکیدار! تیری یہ مجال کہ تو میرے فرائض منصبی کی ادائیگی میں میری مخالفت کرے یا اس میں ٹانگ اڑائے؟ میں نے یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

محافظ نے کہا "میں بھی اس محل کا محافظ ہوں اور میرے ذمے بھی کچھ فرائض منصبی ہیں۔ تیرا کیا یہ خیال ہے کہ میں ان کی بجا آوری میں غفلت یا کوتاہی برتوں گا یا تجھ سے مرعوب ہو کر تیری دیکھا جاؤں گا؟"

یمنی چوری سردار نے ایک تند و تیز سیٹی بجائی اور محافظ کو حکم دیا "تو مجھ سے دس قدم دور ہٹ جا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔

محافظ نے بھی اپنی تلوار سونت لی اور یمنی چوری سردار کو للکارا "آ میرا اور اپنی نمک حرام، میرے اندر سے دل یہ گواہی دے رہا ہے کہ میں تیرے حق میں قضائے مبرم ثابت ہوں گا۔"

یمنی چوری سردار مسکرایا اور بولا "ہو سکتا ہے تو بہادری میں کچھ زیادہ ہو، اور میں تیرا ہم پلہ نہ نکلوں، لیکن یہ طے ہے کہ میں اپنے تجربوں میں بہت آگے ہوں اور اس کا فوری ثبوت تجھے اسی رقت ایسی جگہ مل جائے گا۔"

محافظ نے حکم دیا "تم فوراً ہی محل سے نکل جاؤ، اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

یمنی چوری سردار نے تعجب سے کہا "یہ تیری ہمت کہ تو مجھے محل سے نکل جانے کا حکم دے! خوب خوب!"

محافظ نے اچانک اپنی تلوار کی نوک یمنی چوری سردار کے پیٹ میں چبھو دی، بولا "بس اب تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ، ذرا یاد رکھو کہ جو تلوار تمہارے پیٹ کی جلد پر رک گئی ہے وہ اندر بھی جا سکتی تھی لیکن نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔"

یمنی چوری سردار بولا "بس ذرا دیر اور میرے مہربان دوست اس کے بعد تم جو کچھ بھی کہو گے میں اس کی حرف بہ حرف تعمیل کروں گا۔"

محافظ کو یمنی چوری سردار کی خوشامد سے رحم آ گیا۔ بولا "بہتر ہے میں تجھے چند لمحے دیتا ہوں، تو ان لمحات میں یہاں سے چلا جا ورنہ میں اس کے بعد جو قدم اٹھاؤں گا شاید تو اس کے لئے ابھی سوچ بھی نہ سکے۔"

شہزادی اپنے بچے کو لے کر جانے لگی۔ یمنی چوری سردار چیخا "اسے روکو، یہ ابھی ہمیں ملے۔"

محافظ نے جواب دیا "اب ان کی یہاں کوئی ضرورت نہیں، انہیں ہم دونوں کے سامنے سے ہٹ ہی جانا چاہیئے۔"

اچانک محل کے مختلف گوشوں سے شور غل بلند ہونے لگا۔ اور بھاگ دوڑ مچ گئی۔ چیخ پکار، آہ و بکا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لوگ کسی مصیبت سے بچنے کے لئے اپنی اپنی جانیں بچا کر بھاگتے پھر رہے ہیں، محافظ کی توجہ چیخ پکار کی طرف منعطف ہو گئی یہی چوری سردار نے اس کی اس غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور پیچھے سے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ رسید کر دیا۔ اسی وقت مختلف حصوں سے بہت سارے یہی چوری اپنی خون آلود تلواریں اٹھائے یہی چوری سردار کے پاس پہنچ گئے۔ ایک یہی چوری نے زور زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

"سردار! تمہاری سیٹی کی آواز سنتے ہی میں کسی روک ٹوک یا مزاحمت کی پروا کئے بغیر محل میں داخل ہو گیا۔ اور جس محافظ یا نگراں نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی کہ ہم جب اندر نہ داخل ہو سکیں لیکن ہم نے ان کا محاصرہ توڑ کر انہیں قتل اور زخمی کرتے ہوئے تمہارے پاس تک آ گئے۔"

یہی چوری سردار نے زخمی محافظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہی کام اس نے بھی کیا تھا لیکن اسے میں نے تقریباً دوسری دنیا میں پہنچا دیا ہے۔" پھر اچانک شہزادی کی طرف دیکھا جو جا چکی تھی۔ یہی چوری اس سمت بھاگا جدھر شہزادی تیز تیز قدم اٹھاتی حمام کے قریب پہنچ چکی تھی۔ یہی چوری سردار نے شہزادی کو گدی سے بالوں سے پکڑ لیا

"ٹھہر جا ادنا بدبخت عورت! میں تجھے حکم کچھ دیتا ہوں اور تو عمل کچھ اور کرتی ہے کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ اس محل کی موٹی موٹی دیواریں، مضبوط دروازے اور تنگ یا کشادہ کمرے تیرے بچے کو چھپا لیں گے؟ کبھی نہیں سمجھی نہیں۔"

شہزادی رونے لگی "یہی چوری سردار خدا کے لئے رحم کرو۔"

یہی چوری سردار نے بالوں کو ایک زور کا جھٹکا دے کر منہ زمین پر گرا دیا اور بچے کو زبردستی اس کی گود سے چھین لیا۔ شہزادی اتنی زور سے چیخی کہ گویا اسے ذبح کر دیا گیا ہے، اس نے بے بسی میں اپنا سر کئی بار زمین پر دے مارا، جس سے اس کی پیشانی لہولہان ہو گئی۔

یہی چوری سردار بچے کو لے کر حمام میں گھس گیا۔ بچہ بھی زور زور سے رو رہا تھا لہولہان ان دونوں کے پیچھے دوڑی لیکن جب وہ حمام کے دروازے پر پہنچی تو وہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سر دروازے سے ٹکرانا شروع کر دیا۔

یہی چوری سردار نے پانی کے حوض میں بچے کو ڈال کر ہاتھوں کی مدد سے تہہ

سے لگا دیا اور پھر دائیں ہاتھ سے اس کے پیٹ کو دبا کر اسے منہ سے لگائے رکھا۔ بچے نے ہاتھ پیر ادھر ادھر مارنا شروع کر دیئے۔ رونے کے لئے منہ کھولا تو ناک کے ساتھ ساتھ منہ سے بھی پانی اندر جانے لگا۔ حوض کی سطح پر پانی کے بلبلے نمودار ہوتے جو بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔ ادھر بچے کی قوت مدافعت بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ یحییٰ چرمی سردار کو جب بچے کی موت کا یقین ہو گیا تو اس نے اسے حوض سے باہر نکال لیا۔ بچے کا پیٹ پھول چکا تھا۔ دونوں آنکھیں بند تھیں۔ لیکن آس پاس کے آثار اس وقت بھی پائے جاتے تھے۔ منہ میں جمع پانی دونوں نتھنوں سے بہہ نکلا۔ وہ حمام سے باہر نکلا تو سیر چیوں پر نیم مدہوش شہزادی کو پڑا ہوا دیکھا۔ اس نے مردہ بچے کو شہزادی کے جسم پر پھینک دیا۔ اور کہا "لے سنبھال اپنے بچے کو، دیکھ اس میں کوئی حرکت تو نہیں ہوتی۔ اس کے سارے اعضا سلامت ہیں نا؟"

اور پھر ماں پر گرنے کی وجہ سے بچے کا پیٹ دب گیا۔ جس سے منہ سے پانی بہہ نکلا۔ شہزادی کو کچھ ہوش نہ تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ اس نے اس مدہوشی میں بھی محبت کی گرم جوشی سے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ جیسے جیسے اسے بھینچ رہی تھی پیٹ کا پانی منہ سے رستے گلیوں کی طرح ابل ابل کر باہر نکل رہا تھا۔

* * *

شہزادہ محمد خان اٹھ کر یا نوپل کے محل میں داخل ہوا تو اسے سلطنت اور فوجی عہدے دار اسی کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ ان سب کا خیال تھا کہ شہزادہ ابھی نو عمر اور ناتجربہ کار ہے اس لئے اس پر قابو پا لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ یحییٰ چرمی سردار نے سب سے پہلے تاج و تخت کے وارث کو خوشی آمدید کہا اور دعائیں دیتا ہوا بولا۔

"شہزادے! آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ اس نو عمری ہی میں آپ کو وہ شے مل گئی جس کی تمنا میں لوگ اپنی پوری زندگیاں گزار کر بحسرت دیاس چلے جاتے ہیں۔"

شہزادے نے ترشی سے جواب دیا "بے ادب، موقع ناشناس سردار سب سے پہلے تجھے والد مرحوم کی مجھ سے تعزیت کرنی تھی، اس کے بعد جشن تاجپوشی پر یہ مبارکباد بھی پیش کر دیتا۔"

یحییٰ چرمی سردار ڈر کر خاموش ہو گیا۔

جشن تاجپوشی کے موقع پر محل اور شہر کے در و دیوار سجا دیئے گئے۔ لوگوں

کے چہروں پر شگفتگی اور مسرت کھیلنے لگی۔ یہ شہزادہ اپنے باپ کی زندگی میں بھی دو بار تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس کا باپ مراد ثانی کاروبار سلطنت سے اکتا کر دو بار گوشہ نشین ہوا اور حکومت اپنے بیٹے کے حوالے کر دی ان دنوں شہزادے کی عمر سولہ سال کی تھی، جب پڑوس کی عیسائی حکومتوں کو مراد ثانی کی گوشہ نشینی اور ناتجربہ کار اور نوعمر شہزادے کی سلطانی کی خبریں ملیں تو انہوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ مراد ثانی بدرجۂ مجبوری گوشے سے باہر آ گیا اور سرکش فتنہ جو اور بدعہد عیسائی حکمرانوں کو سزائیں دے کر پھر خلوت گزیں ہو گیا اور اقتدار ایک بار پھر شہزادہ محمد کے ہاتھ میں چلا گیا۔ دشمنوں نے پھر سر اٹھایا اور مراد ثانی نے انہیں ایک بار پھر عبرت ناک سزا دی۔ شہزادے نے دونوں ہی مرتبہ کاروبار سلطنت جس طرح انجام دیا تھا اس سے دوست اور دشمن یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ بیٹے میں باپ جیسی صلاحیتیں نہیں ہیں اور اس کی ذات سے عثمانی سلطنت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔

ادرنہ یا ایڈرنپل میں شہزادے کے خود اپنے آدمی بھی کچھ اسی قسم کی رائے رکھتے تھے۔ ایک امیر نے دبے لفظوں میں یہاں تک کہہ دیا کہ "اب ہمیں کسی اور دربار کا رخ کرنا چاہیے، کیونکہ ایک اکیس سالہ نوعمر اور ناتجربہ کار بادشاہ کی چاکری میں آئندہ کا بوڑھا کے لئے عزت و آبرو کی بات نہیں رہ گئی ہے۔"

دوسرے تیس پینتیس سالہ امیر نے کہا "حالات کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہمیں کسی اور دربار میں جانے کے بجائے ہمیں قسمت آزمائی کرنا چاہیے چاکری چاکری ہی ہے وہ کسی عمر رسیدہ بادشاہ کی چاکری ہو، یا چھ سات کے انکو ٹھا چودہ سالے معصوم حکمراں کی چاکری ہو۔ آدمی کی انا اور خودداری تو دونوں ہی جگہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔"

کسی تیسرے تجربے کار نے کہا "اگر سچ پوچھو تو اس نوعمر سلطان کی چاکری میں زیادہ فائدے ہیں کیونکہ ہمارا تجربہ اس کی ناتجربہ کاری پر ہمیشہ حاوی رہے گا اور ہم اس سے مفید طلب فائدے اٹھا سکیں گے۔"

کسی اور نے تیسرے کی تائید میں کہا "میں اپنے ان بھائی کا ہم خیال ہوں، ہمیں ناتجربہ کار سلطان کی بیعت میں زیادہ تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔"

محمد خان کے جشن تاج پوشی کے موقع پر سابقہ دینے والوں کا ہجوم لگ گیا نذرانے پیش کئے گئے۔ دعائیں دی گئیں، قصیدے پڑھے گئے اور شہزادے تک کورنش و تسلیمات بجا لائے۔

شام کے وقت مردوں کو حصۂ خاص سے باہر نکال دیا گیا، اور عورتوں کو شرفِ باریابی بخشا گیا، باری باری عمدہ تحفے نذر کرتے بادشاہ کے روبرو جاتیں اور چند دعائیہ مبارکبادی کے کلمات ادا کر کے بادشاہ کے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت کو بوسہ دے کر دوسری کے لئے راستہ چھوڑ دیتیں اور الٹے پاؤں واپس چلی جاتیں۔ انہی میں سرویا کی شہزادی اپنے خوبرو سالہ بچے کے عم کو پیسے سے لگائے آگے بڑھی اور بادشاہ کو تاج و تخت سنبھالنے کی مبارکباد پیش کی۔ اس وقت اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور کپڑوں میں سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں اور آواز میں اضمحلال کے ساتھ ساتھ بھراہٹ بھی شامل تھی۔ اس نے فتح پر بادشاہ سے کیا کچھ کہا، خود اسے بھی یاد نہ تھا۔

سلطان محمد نے پوچھا "کم عمری کے باوجود تم میری ماں ہو، مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم اتنی آزردہ کیوں ہو؟"

شہزادی نے اصل غم کو چھپانا چاہا، بولی "نوجوان بادشاہ! کیا تجھے اپنے باپ کی وفات کا غم نہیں ہے اور میں تو اس کی بیوی تھی۔ اس کی محبت کا تم جتنا سمجھ سکتے ہے بادشاہ کے علاوہ کسی اور کو اتنا حوصلہ ہرگز نہ اٹھانا پڑا ہوگا۔"

سلطان نے اس کی خالی آغوش کو دیکھ کر سوال کیا "تمہارا بیٹا کہاں ہے؟"

شہزادی تڑپ گئی۔ بولی "بادشاہ کو تو یہ معلوم ہی ہے کہ یہاں جب ایک شہزادہ برسرِ اقتدار آتا ہے تو اس کے بقیہ بھائی اس دنیا سے رخصت کر دیئے جاتے ہیں۔ میرا اپنا بیٹا بھی نئے بادشاہ پر قربان ہو گیا۔"

اتنا کہہ کر شہزادی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سلطان محمد نے بے چینی سے پوچھا "لیکن اسے مارا کس نے؟ میں نے تو اس بات کا کسی کو حکم ہی نہ دیا تھا!"

شہزادی نے ہچکیوں میں جواب دیا "یہ چری سردار کہتا تھا کہ وہ ترکی کے عثمانی بادشاہوں کی یہ رسم اس لئے ادا کر رہا ہے کہ جب نیا بادشاہ یہ خبر سنے گا تو بہت خوش ہوگا۔"

سلطان محمد چیخا "وہ سردار کہاں ہے؟"

"اپنے بیرک میں۔"

بادشاہ نے زور زور سے تالی بجائی اور حکم دیا "یہ چری سردار کو فوراً حاضر کیا جائے۔"

خادم واپس چلا گیا اور بادشاہ روتی ہوئی اپنی سوتیلی ماں کو تسلیاں دینے لگا۔ بولا "میں اس بچے کو کس طرح قتل کر سکتا تھا وہ ابھی آٹھ دس ماہ سے زیادہ عمر کا تو نہیں تھا، پھر میں اس سے کیوں ڈرتا، وہ میری حکومت کے لئے وبالِ جان بننے کی صلاحیت تو نہیں رکھتا تھا"

شہزادی کی چیخ نکل گئی "بادشاہ! ان تسلیوں سے میرے زخم بھرے ہوئے جاتے ہیں، خدا کے لئے مجھے تسلیاں نہ دیجئے"

کچھ دیر بعد ینی چری سردار بھی آ گیا، سلطان محمد نے خشمناک لہجے میں پوچھا "تجھے یہ حکم کس نے دیا تھا کہ تو آٹھ دس ماہ کے معصوم کو بے دردی اور سفاکی سے ہلاک کر دے؟"

ینی چری سردار نے کہا "کسی نے بھی نہیں، بلکہ عثمانی حکمرانوں میں یہ قانون ایک عرصے سے چلا آ رہا ہے کہ برسرِ اقتدار شہزادے کے علاوہ سبھی شہزادوں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ میں نے اس قانون پر عمل کیا ہے اور یہ جو کچھ بھی میں نے کیا ہے وہ بادشاہ کی فلاح و بہبود میں کیا ہے"

بادشاہ نے پوچھا "اور تو اس غیر معمولی کارنامے کی انجام دہی پر انعام و اکرام کا امیدوار بھی ہو گا؟"

"بجا طور پر، اگر مزاجِ عالی میں آ جائے"

بادشاہ نے ایک بار پھر تالی بجائی اور جب خدام حاضر ہوئے تو انہیں حکم دیا "اس ینی چری سردار کو فوراً قتل کر دیا جائے"

ینی چری سردار چیخا "حضورِ والا رحم!"

بادشاہ نے غصے میں کہا "رحم اُن پر کیا جاتا ہے جو خود بھی رحم کرتے ہیں"

ینی چری سردار چیختا چلاتا اور ردتا دھاڑتا رہا مگر شاہی خدام اسے پکڑ کر باہر لے گئے جہاں جلاد نے اسی وقت اس کی گردن اڑا دی اور خدام نے اس کا سر طشت میں رکھ کر سلطان محمد کے روبرو پیش کر دیا اس نے نفرت سے سر کی طرف دیکھا اور حکم دیا اس کے سر اور جسم کو بیرونِ مارمورہ میں پھینک دیا جائے۔

شہزادی کی آنکھوں میں اس وقت خوشی کے آنسو بھی تھے اور غم کے بھی۔ بادشاہ نے اس کی محافظ کو وہیں طلب کر لیا جس نے ینی چری سردار کا مقابلہ بن کر نہ تھا کھایا تھا۔ بادشاہ نے اسے شاباشی دی اور انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ آخر میں پوچھا

"تو اور کیا چاہتا ہے؟ بتا تاکہ تیری وہ خواہش بھی پوری کر دی جائے!"

حافظ نے دزدیدہ نظروں سے شہزادی کی طرف دیکھا، سلطان محمد نے اس کی چوری پکڑ لی، لیکن شہزادی نے نظروں ہی نظروں میں اس سے کیا کہا، بادشاہ یہ نہیں سمجھ سکا۔

حافظ نے خوشامدانہ عرض کیا "حضور والا! میں سرویا کا رہنے والا ایک غریب اللہ یار شخص ہوں، مجھے شہزادی صاحبہ کے ساتھ یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ ایک عرصے سے میں نے اپنے وطن اور اپنے اعزاء کی شکلیں نہیں دیکھیں۔ اب اگر حضور اجازت مرحمت فرما دیں گے تو بڑی مہربانی اور دادفا نوازی ہوگی۔ ورنہ تحت سیر کے ٹکڑے پر قناعت کر لوں گا۔"

بہ شیار بادشاہ نے شہزادی سے پوچھا "اور تم کیا چاہتی ہو؟"

شہزادی نے جواب دیا "میں بھی کچھ دنوں کے لئے اپنے وطن کی آب و ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔"

بادشاہ نے حافظ کو حکم دے دیا "تم ایک سال کے لئے سرویا جا سکتے ہو۔ اور سرویا کی شہزادی تم اتم ابھی... یہیں کبھی نہیں جا سکتیں افسوس کہ تمہیں محلات کا چہار دیواریوں ہی میں رہنا پڑے گا۔"

اس حکم سے دونوں ہی کے چہرے فق ہو گئے۔ سلطان محمد کو کچھ ایسا محسوس ہوا گویا کہ ان دونوں میں کوئی ایسا معاہدہ ضرور ہو چکا ہے جس کی رو سے ان دونوں کو ایک ساتھ سرویا پہنچنا چاہیئے۔

بادشاہ نے پوچھا "تم دونوں کو میرا یہ فیصلہ منظور ہے یا نہیں؟"

شہزادی نے جواب دیا "مجھے منظور ہے۔" اس کی آواز میں مایوسی تھی، عجز تھا، بے بسی تھی اور حالات سے سمجھوتہ کر لینے کا ایک مایوسانہ انداز پایا جاتا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ نے حافظ کی طرف دیکھا۔ اس عرصے میں شہزادی نے نہایت آہستہ سے اپنا سر نفی میں ایک طرف اٹھا کر اشارے سے حافظ سے کہہ دیا کہ، تم کبھی بادشاہ کی تجویز مان لو۔

حافظ نے کہہ دیا "حضور والا! مجھے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ میں سرویا جانا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ نے اسی وقت اسے چلے جانے کی اجازت دے دی۔

محافظ دربار سے باہر نکلا تو بادشاہ نے اسے ایک بار پھر بلوایا اور کہا۔ "اور ہاں دیکھنا راہ اور سفر کا خرچ تم شاہی خزانے سے لو گے"
محافظ نے بادشاہ کو دعائیں دیں اور الٹے قدموں واپس ہوا۔

* * * *

رات کے سناٹے میں محل کے موٹے موٹے ستونوں کے درمیان سے گزر کر مریا کی شہزادی تک پہنچ جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جگہ جگہ قدِ آدم شمع دانوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں جس سے محل کے تمام گوشے منور تھے۔ مسلح عورتیں غلام گردشوں میں منڈلا رہی تھیں ایک ستون کے سہارے دو بہرے دار عورتیں اپنی اپنی پشتیں ٹکائے سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ اسی عالم میں ایک طرف سے ان کی افسر محافظ نمودار ہوئی اس کے ساتھ ایک اور عورت تھی، جب یہ دونوں بالوفی عورتوں کے سر پر پہنچ گئیں تب ان دونوں کو ہوش آیا اور وہ ایک دم کھڑی ہو کر مختلف سمتوں میں بھاگنے لگیں۔ افسر خاتون نے ان دونوں کو للکارا "کہاں بھاگ رہی ہو، ٹھہرو نالو، یہ تم پہرہ دے رہی تھیں یا ستون کے سہارے آرام کر رہی تھیں؟"
لیکن دونوں میں سے کسی ایک نے بھی جواب نہ دیا۔ اور کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ دونوں بھاگ کر گئیں کہاں۔ افسر خاتون نے اپنی ساتھی عورت سے کہا "اب تم نہایت خاموشی سے شہزادی کے در پر دستک دے کر اندر جا سکتی ہو"
اس عورت نے سردار خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اس کی پہلی ہی دستک پر شہزادی کے محل کا دروازہ کھل گیا یہ دروازہ شہزادی نے خود کھولا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے شہزادی کو بہت زیادہ ہنسی آ رہی تھی۔
اس نے ہنستے ہوئے کہا "اینجل! میں حیران ہوں کہ تم خواجہ سرا کا لباس پہن کر محل کے وہ محافظ نظر ہی نہیں آ رہے ہو جس نے چند دن پہلے بنی چری سردار کو سراسیمہ کر دیا تھا۔ تم تو بالکل عورت نظر آ رہے ہو"
اینجل نے محافظوں کی سردار خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ ان کی مہربانی سے ہوا ہے یہ اگر نہ چاہتیں تو میں یہاں تک کبھی بھی نہ آ سکتا تھا۔ اور خاص کر ان حالات میں کہ میں اب محافظ کا منصب بھی نہیں رکھتا اور رات کے اندھیرے میں تو محافظ کی حیثیت سے بھی میں آپ کے محل میں نہیں داخل ہو سکتا تھا"

سردار خاتون نے دریافت کیا۔ "حضور شہزادی صاحبہ! میں کتنی دیر بعد واپس آجاؤں؟"

شہزادی نے جواب دیا۔ "دو گھنٹے بعد۔"

سردار خاتون نے عاجزی سے کہا۔ "خدا کے لئے احتیاط سے کام لیجئے گا ورنہ میرا خاندان تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔"

شہزادی نے کہا۔ "تو بے فکر رہ۔"

سردار خاتون چلی گئی۔ شہزادی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور واپس آئی اور بولی۔ "ایجل! میں نے تمہیں یہاں تک لانے کے عوض اس سردار خاتون کو ایک معقول رقم دی ہے۔ یہ بہت لالچی لوگ ہیں۔ میں تو اس ماحول سے تنگ آ گئی ہوں۔"

ایجل شہزادی کو بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شہزادی نے اسے اپنی خواب گاہ سے دور ہی رکھا اور ایک ایسے کمرے میں لے چلی گئی جہاں رقص و سرود کی محفل جما کرتی تھی۔ شہزادی خود تو صندلین تخت پر بیٹھ گئی، جس پر دبیز لیکن نرم و ملائم گدا اور گدے پر خوبصورت ریشمی چادر بچھی تھی۔ شہزادی گدے میں دھنس سی گئی۔

ایجل نے شہزادی کے قریب بیٹھنے کی جسارت کی تو وہ بھڑک اٹھی، بے چینی سے کھڑی ہو گئی، بولی۔ "خبردار، ایسی جسارت بھی نہ کرنا کچھ بھی سہی، لیکن میں ترکی کے نامور فاتح مراد ثانی کی بیٹی رہ چکی ہوں اور موجودہ نوجوان بادشاہ میرا سوتیلا بیٹا ہے۔ جب تک میں اس محل اور ترکوں کی سرزمین پر رہوں ان کی عزت و آبرو کا خاص خیال رکھوں گی۔"

ایجل کھسیا گیا، سامنے کی منقش کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "کیا میں اس پر بیٹھ سکتا ہوں؟"

"ہاں اس پر بیٹھ جاؤ۔" شہزادی دوبارہ گدے میں دھنس گئی۔

ایجل کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی طبیعت میں تکدر پیدا ہو گیا ہے شہزادی نے بھی اس کی یہ کیفیت محسوس کر لی لیکن ایسی بنی رہی گویا کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

ایجل نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔ "میں سرویا واپس جا رہا ہوں، وہاں کے لئے کوئی خاص پیغام؟"

شہزادی نے جواب دیا۔ "ہاں وہاں بتا دینا کہ شہزادی کی گورجبراً اغوا کر دی گئی اور ترک قوم کی مہمان ایک نابالغ بچے کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔ عزت مند مسیحی چاہیں تو باہم متحد ہو کر اپنی سابقہ بے عزتیوں کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ ایسے موقع بار بار

نہیں ملتے۔"

اینجل نے شہزادی کے کسے ہوئے جسم پر لباس کی سلوٹوں کے نیچے نشیب و فراز کو دیکھنے کی کوشش تو کی لیکن انہیں ایک جھلک سے زیادہ نہیں دیکھ سکا۔ اس وقت وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ اتفاق اور وقت کے ہاتھوں اسے یہ شرف حاصل ہو گیا کہ شہزادی کی خلوت اور رات کی تاریکی میں اسے شہزادی کا قرب ملا اور باتیں کرنے کی آزادی ہاتھ آگئی۔ اس نے شہزادی سے سوال کیا۔ "محترم شہزادی صاحبہ! کیا آپ کو سردیا نہیں یاد آتا؟"

شہزادی نے جواب دیا۔ "یاد کیوں نہیں آتا لیکن یاد آنے سے کیا ہوتا ہے، میں وہاں پہنچ تو نہیں سکتی۔"

اینجل نے کہا۔ "ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو سردیا پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہوں۔"

شہزادی نے کہا۔ "ہاں، لیکن بدات خود میں چوری سے بھاگنا پسند نہیں کرتی۔"

اینجل کسی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بار بار شہزادی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرے کی اشیاء اور شہزادی کے معطر لباس کی بھینی بھینی خوشبو اینجل کی آتش شوق کو بھڑکاتے دے رہی تھی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

شہزادی نے کہا۔ "سردیا والوں سے کہنا کہ ان کی میٹیوں کا ایک قرض ان کے ذمے واجب الادا چلا آرہا ہے، اب وقت آگیا ہے کہ وہ یہ قرض اتار دیں۔"

اینجل نے نظریں شہزادی کی طرف اٹھا دیں، بولا۔ "لیکن شہزادی۔"

شہزادی نے بات کاٹ دی۔ بولی۔ "وہ قرض یہ ہے کہ اب تک فاتح ترکوں کو انہوں نے اپنی لڑکیاں دی ہیں لیکن اب وقت آگیا ہے کہ وہ ترکوں کی لڑکیاں اپنے گھروں میں لے جائیں۔"

اینجل نے شہزادی کے سرخ و سفید رخساروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخر سردیا والوں نے ان سرخ و سفید رخساروں کو ترکوں کے بوڑھے سلطان کے حوالے کیوں کر دیا، ایک ایسا شخص، جس کے جسم سے کافور کی بو آرہی تھی ان گلاب کے پھولوں جیسے رخساروں کا کسی طرح حقدار نہیں ٹھہر سکتا تھا۔"

شہزادی خفگی سے بولی۔ "تم پھر بہکنے لگے۔ ہوش میں آؤ اینجل اور سوچو کہ تم

کس سے مخاطب ہو؟"

اینجل نے کہا" اور یہ پنکھڑیوں جیسے لب لعلیں، سرویا والوں نے ان کا بھی کوئی خیال نہ کیا؟"

شہزادی نے ڈپٹ کر کہا" اگر تم نے اپنی بات چیت کا موضوع نہ بدلا تو یقین کرو کہ میں تمہیں یہاں سے اسی وقت نکال باہر کر دوں گی۔"

اینجل اتنا واقف ہو رہا تھا کہ عقل کی مصلحت یہی مغلوب ہو گئی تھی۔ اس نے عالم سرشاری میں کہا" میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ شہزادی صاحبہ جب آپ خود سرویا جانے پر آمادہ نہیں تو پھر میں کیوں جا رہا ہوں!"

شہزادی اینجل کی باتوں سے خوف زدہ ہو رہی تھی پوچھا" کیا تم نے میری باتیں سن لیں؟"

اینجل نے جواب دیا" سن لیں لیکن بدقسمتی سے وہ سب یاد نہیں رہا۔"

شہزادی نے ایک بار پھر اپنی سابقہ باتیں دہرا دیں لیکن اینجل شاید پھر نہیں سن سکا تھا۔

شہزادی کھڑی ہو گئی، بولی" میں تالی بجا کر سرداد خاتون کو بلاتے لیتی ہوں تا کہ وہ تمہیں بحفاظت باہر پہنچا دے۔"

"ابھی نہیں شہزادی صاحبہ ابھی نہیں۔" اینجل بچوں کی طرح گڑگڑانے لگا" میں ابھی یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

شہزادی نے جواب دیا" تب پھر تم ہوش میں رہ کر باتیں کرو میں تمہارا یہ طرز تخاطب برداشت نہیں کر سکتی۔"

اینجل نے عاجزی سے کہا" اچھا اب میں خیال رکھوں گا اور یہ احتیاط سے کام لوں گا۔"

شہزادی نے اپنا پیغام پھر سے سنا دیا۔ اینجل بغور سنتا رہا اس کے بعد بے ساختہ بول اٹھا" کیسا پیارا پیغام ہے سرویا والوں کے لئے۔ خدا کی قسم میں آپ کا یہ پیغام سرویا والوں کے گھروں پر دستکیں دے دے کر پہنچا دوں گا آپ مطمئن رہیں۔"

"اور میری حکومت سے کہنا۔ شہزادی کو اگر لے جانا چاہتے ہو تو فاتح بن کر آؤ اور با عزت طریقے سے لے جاؤ۔"

اینجل نے کہا" شہزادی صاحبہ! آپ کو ایک اعلان کر دینا چاہیئے۔"

"کیسا اعلان؟ کس لئے اور کہاں؟"

اینجل نے جواب دیا: "آپ کسی طرح بھی اگر یہ اعلان کر دیں کہ جو ترکوں کے بادشاہ کو قتل کر دے گا آپ اسے اپنے شوہر کے طور پر قبول کر لیں گی۔"

شہزادی نے ترش روئی سے کہا: "اینجل! تمہاری باتیں میرے لئے اب بالکل ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔"

اینجل نے والہانہ انداز میں کہا: "اور شاید وہ شخص میں خود ہوں گا جو ترکوں کے نوجوان بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے گا۔" پھر شہزادی کی طرف اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا دیا۔ "لائیے اپنا ہاتھ لائیے اور مجھ سے یہ وعدہ کیجئے کہ اگر میں ترکوں کے بادشاہ کا کام تمام کر دوں گا تو آپ مجھے اپنی پرستاری میں قبول فرمالیں گی۔"

شہزادی نے کہا: "میں نہ تو اس نوع کا کوئی اعلان کروں گی اور نہ کوئی عہد و پیمان، تم خواہ مخواہ بہک رہے ہو۔"

اینجل دیوانہ وار کرسی سے اٹھا اور شہزادی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بولا: "میں زندگی بھر ان قدموں میں رہ سکتا ہوں۔" اس نے شہزادی کا داہنا پیر پکڑ لیا۔ شہزادی نے اسے جھٹکا لیا اور کھڑی ہو گئی، پھر کچھ سوچ کر بولی: "اینجل! میں ابھی آتی ہوں، تم میرا انتظار کرو۔"

وہ چلی گئی اور اینجل نہ میں پر بیٹھا اس کی راہ تکنے لگا۔ وہ کافی دیر تک شہزادی کا منتظر رہا لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ شہزادی اس کی دیوانگی سے خوفزدہ ہو کر اپنے خواب گاہ میں چلی گئی تھی، اور وہیں دروازہ بند کر کے پڑ رہی تھی۔ کافی دیر بعد سردار خاتون نے اینجل کو تھپکی دی اور کہا: "سروین محافظ! وقت پورا ہو چکا، اب میرے ساتھ واپس چلو۔"

اینجل نے پوچھا: "لیکن شہزادی کہاں ہے؟"

"اپنی خواب گاہ میں۔"

"لیکن میں ان سے ملے بغیر ہرگز نہ جاؤں گا۔"

"تم پچھتاؤ گے، اس وقت وہ آرام فرما رہی ہیں، انہیں بیدار نہیں کیا جا سکتا۔"

اینجل نے اعلان کیا: "کچھ بھی ہو، میں ان سے ملے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھاؤں گا، انہوں نے واپس آنے کا وعدہ کیا ہے۔"

سردار خاتون نے کہا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے خواہ مخواہ اپنا اور میرا وقت نہ ضائع کرو۔"

اینجل نے بدرجۂ مجبوری کھڑے ہوتے ہوتے کہا۔ "اس وقت چلا تو چلوں گا لیکن تم اپنی شہزادی سے کہہ دینا کہ انہوں نے مجھ سے غلط وعدہ کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"کہہ دوں گی۔" سردار خاتون نے تسلی دی۔

اینجل اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جب وہ محل سے باہر نکل گیا تو سردار خاتون کی جان میں جان آئی۔

* * *

اینجل نے شاہی خزانے سے سفر خرچ لیا اور اپنے وطن روانہ ہو گیا۔ اسے راستے بھر یہ دکھ دھیمی دھیمی آنچ کی طرح جھلساتا رہا کہ شہزادی نے اس کی قدر نہیں کی اور آخری ملاقات میں اسے دھوکا دیا۔

دوسری طرف شہزادی کو اینجل کی سرشوری بہت پسند آئی لیکن وہ جس مقدس مقام پر رہ رہی تھی وہاں اس قسم کی سرشوری دونوں ہی کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے اینجل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ نہ رکھنے کے باوجود دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اگر اینجل نے حاتمی یہ کارنامہ انجام دے دیا تو وہ اسے ضرور قبول کر لے گی۔

اینجل کے دل میں تو آگ لگی تھی۔ اس نے سرویا پہنچ کر باقاعدہ ایک تحریک چلائی اور سرویا کی شہزادی کے بچے کے قتل کا قصہ خوب نمک مرچ لگا کر لوگوں کو سنانا شروع کر دیا۔ لوگ اس کی باتوں اور تقریروں سے بہت متاثر ہوتے، پھر وہ قسطنطنیہ چلا آیا اور یہاں کے مسیحی حکمراں کو بھی خوب خوب ورغلایا اور اسے یقین دلایا کہ ترکوں کی عظیم طاقت پر بھرپور ضرب لگانے کا اس سے بہتر موقع پھر کبھی بھی نہ ملے گا۔ اس نے یہاں بھی بچے کے قتل کا واقعہ بڑے پراثر انداز میں سنایا۔ قسطنطنیہ کے فرماں روا قسطنطین نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں یہ موقع ہرگز اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔"

اینجل نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "اس مہم میں ہمیں کس طرح مفید ثابت ہو سکتا ہوں اس کا فیصلہ آپ لوگ خود فرمائیں گے، مجھے جلد از جلد میری خدمات سے آگاہ فرما دیا جائے تاکہ میں اپنا کام شروع کر دوں۔"

قسطنطین نے کہا "تم ترکوں میں واپس جاؤ، ناتجربے کار نئے سلطان نے تم پر اعتبار کیا ہے اور غالباً اس کا یہ اعتبار ہمیں بہت زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ کیا تم اس پر تیار ہو کہ نئے سلطان کی ملازمت میں واپس جاؤ اور وہاں میری ہدایات کے منتظر رہو؟"

اینجل بھی یہی چاہتا تھا۔ اس نے قسطنطین کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اٹھ کر سینٹ اباصوفیہ چلا گیا۔ یہ مشہور زمانہ گرجا برسہا برس سے زائرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ دیر تک یہاں گھومتا پھرتا رہا۔ یہاں لوگوں نے اس سے ترکوں کے بارے میں بہت سے سوالات کر ڈالے اور آخر میں پوچھا "کیا ترک یہاں آنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں؟"

اینجل نے جواب دیا "ترک نہیں ذلیل اور کمزور سمجھتے ہیں، وہ ایک قسطنطنیہ تو کیا پوری مسیحی دنیا کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ کیا تم ان کا مقابلہ کر سکتے ہو؟"

لوگوں نے خوف سے اپنے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور خدا کی پناہ مانگنے لگے۔

اینجل سرویا پھر واپس گیا اور وہاں کے حکمران کو یہ خوشخبری سنائی کہ قسطنطین نے عثمانیوں پر تباہ کن ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

سرویا کے بوڑھے حکمران نے پوچھا "تیرے دانتے بھی کوئی خدمت کی گئی یا نہیں؟"

اینجل نے جواب دیا "مجھے حکم ملا ہے کہ میں ترکوں میں واپس جاؤں اور قسطنطین کی ہدایتوں اور اشاروں پر کام کرتا رہوں۔" پھر ذرا دیر چپ رہ کر بولا "حالانکہ یہ کام بڑے جان جوکھوں کا ہے اور میں کسی وقت بھی قتل کیا جا سکتا ہوں۔"

سرویا کے حکمران نے کہا "میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم اور یانوپل واپس جاؤ اور ہم سب کے لئے کوئی بڑا کام انجام دو۔ اور پھر یہ کہ میری عمر زیادہ ہے شاید اب بھی وہیں رہ رہی ہے اور اسے ایک ایسے شخص کی کمی ہمیشہ ہی محسوس ہوگی، جو اس کا ہم مذہب اور ہمدرد ہو، اور تم میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔"

اینجل نے تشویشناک لہجے میں کہا "اب میں محض شہزادی کے لئے اور یانوپل جاؤں گا اور وہاں بس یا تو کوئی بڑا کارنامہ انجام دے دوں گا یا پھر اپنے ہزاروں ساتھیوں کی طرح مٹروؤں میں دب کر ہمیشہ کے لئے اپنا منہ چھپا لوں گا۔"

اس روز شام کو شاہ سرویا نے اینجل کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دی۔ اس ضیافت کی سب سے زیادہ شاندار یہ بات تھی کہ اس میں اینجل کے علاوہ باہر کے کسی بھی آدمی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ کھانے کی لمبی میز کے چاروں طرف سرویا کے حکمران کا خاندان بیٹھ گیا۔ اس میں عورتیں مرد اور بچے سبھی شامل تھے۔ اس موقع پر سرویا کے حکمران نے اینجل کا اہل خاندان سے تعارف کرایا۔ ابھی تعارف جاری ہی تھا کہ ایک نوجوان لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں میں خالی جگہ تلاش کرنے لگی۔ اینجل کے برابر کی کرسی خالی تھی۔ وہ بے تکلف اسی پر بیٹھ گئی۔ شاہ سرویا نے اس لڑکی کی طرف ہنستے ہوئے اشارہ کیا "اور یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہیلن ہے نہایت شوخ حد درجہ شریر، یہ خود وقت کی پابند نہیں ہے بلکہ وقت کو اپنا پابند بنانے کی کوشش کرتی ہے یہ میری بیٹی ماریہ سے چار سال چھوٹی ہے، اور ماریہ جو اس وقت بھی ترکوں میں پھنسی افسوسناک اور پراذیت زندگی گزار رہی ہے۔"

اینجل تو اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں بجھ تک گیا تھا۔ یہ بالکل ماریہ تھی ویسی ہی پیشانی، اسی کی طرح نرگیں، ناک، کان، ہاتھ، پیر چال ڈھال، غرضیکہ کسی بات میں بھی دونوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ ماریہ کو غموں کے دباؤ نے کچھ اداس اور سنگوار بنا دیا تھا۔ اور اس کے برعکس ہیلن میں تیزی، چستی اور پھرتی پائی جاتی تھی، اس کے کانوں میں پڑے ہوئے آویزوں میں دو گول گول قیمتی موتی ٹنک رہے تھے اور ان میں اتنی چمک تھی کہ رخساروں کی آب و رنگ کو اس میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر اینجل کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

ہیلن نے شوخی سے کہا "کیوں جناب آپ وہاں سے اکیلے ہی بھاگ کھڑے ہوتے حالانکہ وہاں ابھی تک میری بہن ماریہ موجود ہیں۔ انہیں یقیناً تمہاری ضرورت ہوگی۔"

اینجل نے جواب دیا "ہیلن تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ میں تمہاری قابل عزت بہن ماریہ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں، جس سے تمہارے والد خوب اچھی طرح واقف ہیں۔"

شاہ سرویا نے سنجیدگی سے کہا "معزز مہمان! تم اس نادان اور کم سن لڑکی کی باتوں کا خیال نہ کرنا۔ ابھی اسے اپنی زبان کے صحیح مصرف کا علم نہیں ہے۔"

اینجل نے ہنستے ہوئے کہا "جناب والا! اب میں اتنا ناسمجھ بھی نہیں کہ شہزادی

ہیلن کی معصومانہ باتوں کا برا مان جاؤں!"

ہیلن روٹھ گئی اور ہونٹ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ سردیا کے حکمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ روٹھتی بھی بہت جلد ہے، یہ اتنی زیادہ حساس اور نازک طبع واقع ہوئی ہے کہ اپنے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتی۔"

ہیلن کھانا کھائے بغیر ہی اٹھ کر چلی گئی، اس کا باپ اسے پکارتا ہی رہ گیا لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ اس حادثے نے کھانے میں بدمزگی پیدا کر دی۔ سردیا کے حکمران نے افسردگی سے کہا۔ "حضرات! آپ سب کھانا شروع کریں، ہیلن بعد میں کھالے گی، اسے زیادہ کھانے کی زیادہ اشتہا نہیں ہے۔"

ان سب نے کھانے کا آغاز تو کر دیا لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی پہلی جیسی سرگرمی اور جوش و خروش نہیں پایا جاتا تھا۔

اینجل نے شرمندگی سے کہا۔ "افسوس کہ میرس دیہ سے شہزادی ہیلن ہمارے ساتھ چلی گئیں، مجھ پر تو یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ میں انہیں جاتے دیکھ کر روک لیتا اور کھانا کھائے بغیر ہرگز نہ جانے دیتا۔"

شاہ سردیا نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے حاضرین طعام سے کہا۔ "صاحبان کھانا شروع کر دیجئے کیونکہ کھانے کا وقت ہو چکا ہے اور اب صبر کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔"

سبھی نے سردیا کے حکمران کی اتباع میں کھانا شروع کر دیا۔

اسی کے بعد اینجل ہیلن کی تاک میں رہا، لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی جیسے جیسے اس کی واپسی کا دن قریب آ رہا تھا، وہ پریشان ہو رہا تھا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ واپس جائے لیکن جانا بھی بہت ضروری تھا۔ اس نے اکثر ہیلن اور ماریہ کو ایک ساتھ کھڑا کر کے یہ اندازہ لگانا چاہا کہ اسے کون زیادہ اچھی لگتی ہے تو یہی جواب ملا کہ ہیلن کی بات ہی کچھ اور ہے ماریہ کی طرف سے اس کا دل ہٹتا چلا گیا۔ اور انہی خیالوں میں جب اسے ماریہ کا وہ بات یاد آیا، جب وہ اسے تنہا چھوڑ کر اپنی خوابگاہ میں چلی گئی تھی تو ماریہ پر بڑا غصہ آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو، ماریہ کی اس بداخلاقی کی اسے سزا ضرور دی جائے گی۔

واپسی سے ایک دن پہلے سردیا کے حکمران نے اینجل کو شاہی باغیچے میں طلب کیا۔ یہاں وہ ایک بارہ دری میں بیٹھا چند سرکاری کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا اس کے

سامنے ایک وسیع و عریض حوض میں فوارے چھوٹ رہے تھے اور حوض کے تین طرف پھول دار درخت جھوم رہے تھے ان کی شاخیں، مختلف رنگ اور قسم کے پھولوں سے لدی ہوئی تھیں، اور ان میں سے بعض پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں پھدک رہی تھیں، پھولوں پر تتلیاں پھر رہی تھیں اور یہ رنگ برنگی خوشنما تتلیاں جب پھولوں پر بیٹھ جاتیں تو یہ خود بھی پھول ہی معلوم دینے لگتیں۔

انجل بادشاہ کے روبرو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھا اور کہا "میں ابھی بات کرتا ہوں بس چند سطریں پڑھ لوں"

انجل نے جواب دیا "بندہ اس وقت تک مؤدب کھڑا رہے گا جب تک حضور والا اپنے نہایت اہم اور قیمتی مشغلے سے فارغ نہیں ہو جاتے"

بادشاہ نے کہا "اگر تم پسند کرو تو حوض کے قریب یا پھول دار درختوں کی روشوں میں چل پھر کر اپنی مشام جاں کو تر و تازہ کر لو، میں اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی تمہیں بلا لوں گا"

انجل نے کہا "بہتر ہے"

اور حوض کے پاس چلا گیا۔ پھر وہاں سے گل پوش روشوں میں داخل ہو گیا۔ خوبصورت تتلیاں اس کے پیروں سے ٹکرا ٹکرا کر پھولوں کی طرف جانے لگیں۔ ادھر ادھر شاہی خدام موجود تھے۔ ایک لمبی ناک اور چھوٹے کانوں والا گدبدا خدمت گار اس کے پاس آیا اور پوچھا "کیا تم نے بادشاہ سے ملاقات کر لی؟"

انجل نے جواب دیا "ایک بار مل چکا ہوں، دوبارہ پھر ملنا ہے۔ کیوں؟"

خدمت گار نے جواب دیا "واپسی میں شہزادی ہیلن سے ضرور مل لینا۔ وہ یہاں کے صدر دروازے سے ملحقہ سبزہ زار پر تمہارا انتظار کر رہی ہیں"

انجل کی عجیب حالت تھی۔ رہی سہی اس کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت بھاگ کر ہیلن کے پاس پہنچ جائے لیکن سر دیا کے بادشاہ کا خوف غالب آیا اور اس نے پوچھا "لیکن خدمت گار تم کسے ایک بات تو بتا دو"

خدمت گار نے پوچھا "وہ کیا؟ پوچھو!"

انجل نے جواب دیا "شہزادی مجھ سے چوری چھپے مل رہی ہے یا اس کی اپنے باپ سے اجازت لے لی ہے؟"

خدمت گار نے کہا "یہ سب میں نہیں جانتا شہزادی سے یہ باتیں ہم لوگ

کس طرح پوچھ سکتے ہیں؟"
اینجل نے کہا۔ "پھر اس طرح اس سے ملنے میں مجھ پر کوئی افتاد تو نہیں نازل ہوگی؟"
خدمت گار نے چڑ کر کہا۔ "میرے ذمے یہ کام تھا کہ شہزادی کا پیغام تم تک پہنچا دوں، سو پہنچا دیا۔ اس کے سوا تمہاری کسی بات کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"
اینجل نے جلدی جلدی کہا۔ "لیکن ٹھہرو تو جناب ایک بات اور سنو۔"
خدمت گار نے اس کی بات کاٹ دی، ایک طرف جاتا ہوا بولا۔ "اب میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ بادشاہ سلامت اسی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ تم شہزادی سے مل ضرور لینا۔"
اینجل نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو واقعی شاہ سردیا اس کے قریب آچکا تھا۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ کے جوتوں کی آواز قریب سے قریب تر آتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بادشاہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ "ہاں تو اے میرے عزیز!" بادشاہ نے اسے مخاطب کیا۔ "کل تم واپس چلے جاؤ گے؟"
اینجل نے جواب دیا۔ "جی حضور والا! ورنہ جیسا حکم ہو۔ تاہم اس کی بجا آوری میں فخر و انبساط محسوس کروں گا۔"
بادشاہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے دباتا ہوا بولا۔ "اینجل! تم جانتے ہو کہ دشمنوں سے جنگیں کئی طرح لڑی جاتی ہیں۔ ایک طریقہ جنگ آدمی یہ ہے کہ دشمن کا کھلے میدان میں مردانہ وار مقابلہ کیا جائے۔ دوسرا طریقہ ہے کہ اسے غافل رکھ کر شب خون مارا جائے اور تیسرا طریقہ۔" یہ کہتے کہتے بادشاہ نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ "ہمارے آس پاس کوئی موجود تو نہیں ہے؟" پھر خود ہی جواب دیا۔ "خاصہ نہیں۔ ہاں تو میں تیسرے طریقے کی بات کر رہا تھا۔ جب دشمن ناقابل شکست ہو اور دونوں طریقے ناقابل اختیار ہوں تب پھر ہم میں سے کسی ایک جواں مرد کو اپنی جان خطرے میں ڈالنی کر تیسرے طریقے پر عمل کرنا چاہیئے۔ وہ دشمن کی سب سے بڑی شخصیت کو اعتماد میں لے کر دھوکے سے ہلاک کر دے اور خود فرار ہو کر اپنوں میں پہنچ جائے۔"
اتنا کہہ کر بادشاہ اینجل کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ اس کی اندرونی کیفیت کا پتہ چلانا چاہتا تھا۔
اینجل نے پوچھا۔ "کیا حضور والا یہ چاہتے ہیں کہ میں نوجوان سلطان محمد کو دھوکے

سے ہلاک کر کے سر و یا واپس آجاؤں ؟"

"ہاں" بادشاہ نے کہا۔ "اس کے علاوہ میری باتوں کا دوسرا کوئی مطلب نہیں۔ تم شاید نہیں جانتے کہ دشمن کے سب سے بڑے آدمی کے تنہا مار دیئے جانے سے آدھی فتح حاصل ہو جاتی ہے۔"

اینجل خاموش ہو گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے مصروفِ عمل تھا۔

بادشاہ نے اسے بہت زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ بولا۔ "میں نے تجھے اپنا عزیز کہا ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تیرا نسب نامہ بہت اچھا ہے اور تجھ سے رشتہ قائم کرنے میں عار نہیں محسوس ہوگی۔"

اینجل کو ان لفظوں کے معنی میں چھپا ہوا سنہرا مستقبل اس طرح نظر آنے لگا جس طرح بادلوں کی اوٹ سے درخشاں چاند دکھائی دے رہا ہو۔ اس نے رک رک کر پوچھا۔ "کیا حضورِ والا جو کچھ فرما رہے ہیں، میری کامیابی کے بعد اس پر فی الفور عمل کیا جائے گا؟"

بادشاہ نے کہا۔ "بادشاہ سے سوءِ ظنی جرم ہے ناقابلِ معافی جرم۔"

اینجل نے کہا۔ "تب پھر میں آج ہی روانہ ہو جاؤں گا اور اسی ناچیز بے کار سلطان کا کام تمام کر کے بہت جلد واپس آجاؤں گا۔"

"نہیں!" بادشاہ نے کہا۔ "تم کل ہی روانہ ہو گے، اپنا کام پورا کر کے جب تم واپس آؤ گے تو سلطان کا خنجر، پیٹی اور اس کا عمامہ تم اپنے ساتھ لاؤ گے، سلطان کی ان چیزوں کے عوض تمہیں منہ مانگا انعام عطا کر دیا جائے گا۔"

اینجل نے بات صاف کر لینی چاہی، بولا۔ "خادم کی خواہش ہے کہ جب بیبی سلطان کی مذکورہ بالا چیزیں لے کر حاضر ہو جاؤں تو حضورِ والا مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرما لیں۔"

بادشاہ نے گرجدار آواز میں پوچھا۔ "تمہارے ذہن میں کس کا نام ہے؟ تم نے کس کو پسند کیا ہے ماریہ کو یا ہیلن کو؟"

اینجل نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "ہیلن، ہیلن کو!"

بادشاہ نے کہا۔ "تم ہیلن کے بدلے دولت کیوں نہیں مانگ لیتے، جاگیر کیوں نہیں طلب کرتے؟"

"حضورِ والا صرف ہیلن!" وہ بادشاہ کے قدموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھ

گیا۔ اور بادشاہ کی پنڈلیوں کو بوسہ دیا۔

بادشاہ نے کہا "اگر ہیلن نے تجھے ناپسند کر دیا تو؟"

اینجل نے کہا "اس معاملے میں ہیلن کی پسند اور مرضی کو اتنا ہی دخل ہونا چاہیئے حضور والا، جتنا دخل شہزادی ماریہ کو بوڑھے سلطان مراد کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں تھا۔"

بادشاہ مسکرایا، بولا "تو اب تم خود کو مراد ثانی جتنا بڑا آدمی سمجھنے لگے ہو؟ خوب خوب! اچھا ابھی میں خود ہیلن سے بھی بات کروں گا تم کل روانگی سے پہلے مجھ سے اس کا جواب لے لینا۔"

اینجل نے بادشاہ کی پنڈلی کو ایک مقدار بوسہ دیا اور بادشاہ نے اسے پکڑ کر اٹھا لیا، اور کہا "اب تم جا سکتے ہو۔"

جب اینجل جانے لگا تو بادشاہ نے کہا "ہیلن صدر دروازے سے ملحقہ سبزہ زار پر خود بھی موجود ہے تم اس سے بات کر کے جانا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرنا کہ کس حد تک وہ تمہاری ہم خیال ہے۔"

اینجل کی خوشی کی انتہا نہ رہی، خدا اور قسمت، اس پر شاید دونوں ہی مہربان تھے۔ وہ فوراً خوشی میں اس سبزہ زار کی طرف بڑھا جہاں ہیلن اس کا انتظار کر رہی تھی۔

* * *

کنیز خدمت گار خواتین کی نگرانی میں اینجل ہیلن کے پاس پہنچ گیا مگر ہیلن اسے دیکھ کر مسکرا دی، شوخی سے سوال کیا "کیا تم نے واقعی بنی چیری سردار کے جیب میں اپنی تلوار کی نوک چبھو دی تھی؟"

اینجل نے جواب دیا "حضور شہزادی صاحبہ جب اپنی بڑی بہن سے ملاقات فرمائیں گی تو وہ میرے اس بیان کی تصدیق فرما دیں گی۔"

ہیلن نے لاپروائی سے کہا "مجھے یقین نہیں آتا۔"

"یقین نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ؟"

ہیلن نے خدمت گار کنیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "عورتوں کا محاصرہ تو تم توڑ نہیں سکے، پھر بہادر مردوں سے تم کیا خاک مقابلہ کرو گے۔"

اینجل ہیلن کے اس لطیف مذاق سے بہت خوش ہوا، بولا "میں شہزادی ہیلن

کا شکر گزار ہوں کہ مجھ سے مذاق فرما کر لطف اندوز ہو رہی ہیں۔"

ہیلن نے کہا۔ "تم نے ترکوں کے نوجوان سلطان محمد خان کو دیکھا ہے؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "صرف دیکھا ہی نہیں، اس سے بات چیت بھی کی ہے۔ میں نے اسے اتنا ہی قریب سے دیکھا ہے جتنا قریب شہزادی ہیلن کو دیکھ رہا ہوں۔"

ہیلن نے پوچھا۔ "اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "اس کی شکل و صورت پوچھ کر کیا کیجئے گا، بہرحال اگر آپ میں اس کی شکل و صورت جاننا ہی چاہتی ہیں تو فرض کیجئے، سلطان کے چہرے پر دونوں شرخ و سپید رخسار اتنے ابھرے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والے کی نظر ان پر رہی جم کر رہ جاتی ہے۔ ناک اونچی مگر آگے سے جھکی ہوئی ہے اس کی مونچھیں دونوں رخساروں پر اس طرح اٹھی رہتی ہیں گویا عقاب کی کلغی کی دو پتیاں رکھ دی گئی ہوں۔ سلطان کی داڑھی کے بال ذرا سخت ہیں اور طلائی تار کی طرح نظر آتے ہیں۔"

ہیلن نے پوچھا۔ "سلطان کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟"

"پڑھا لکھا؟" اینجل نے جواب دیا۔ "اجی جناب اس نوعمری کے باوجود وہ پانچ زبانیں جانتا ہے۔ عربی، فارسی، عبرانی، لاطینی اور یونانی ان پانچوں زبانوں میں وہ کسی مترجم کی مدد کے بغیر بات کرتا ہے۔"

ہیلن نے کہا۔ "خوب، اب تم یہ بتاؤ کہ کیا سلطان ہم عیسائیوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ کر لے گا؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "شاید نہیں۔" اس نے شہزادی کی کیف آلود آنکھوں میں اپنا چہرہ دیکھا، بولا۔ "شہزادی! میں اور کچھ تو جانتا نہیں، بس یہ جانتا ہوں کہ اب جب میں ترکوں کے پاس سے واپس آؤں گا تو میرے سامان میں ترکوں کے نوجوان بادشاہ کا خنجر، اس کی پیٹی اور اس کا لباس بھی شامل ہوگا۔ کیونکہ آپ کے والد نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کے بعد میں ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر رہ سکوں گا۔"

ہیلن نے جھنجھلا کر پوچھا۔ "کیا تم ترکوں کے سلطان کی یہ چیزیں چوری کر کے لے آؤ گے؟"

اینجل کا چہرہ غصے اور شرم سے شرخ ہو گیا۔ بولا۔ "بخدا شہزادی صاحبہ! اگر یہی کلمات کسی مرد کی زبان سے نکلتے تو اس وقت میں اس کے دو ٹکڑے کر چکا ہوتا۔ میں ترکوں کے سلطان کا مقابلہ کر کے اسے زیر کر لوں گا، اور اس کے بعد ایک فاتح کی حیثیت سے اس

کی ان چیزوں پر قبضہ کر لوں گا!"

"خوب! خوب!" ہیلن زور زور سے ہنسنے لگی "اے کاش اس جگہ میں خود بھی موجود ہوتی!"

اینجل خوب سمجھ رہا تھا کہ شہزادی اس کا مذاق اڑا رہی ہے اسے غصہ بھی آ رہا تھا لیکن وہ سوائے ضبط اور برداشت کے کر بھی کیا سکتا تھا۔ بولا "آپ اس وقت تک میری باتوں کا یقین نہیں کریں گی جب تک کہ میں یہ غیر معمولی کارنامہ انجام دے کر دوبارہ آپ کی خدمت میں نہ آ جاؤں۔"

شہزادی نے اینجل کی مونچھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "انہیں تم ترکوں کے سلطان کی طرح اوپر اتنا زیادہ اٹھا لو کہ ان کی دونوں نوکیں نچلی پلکوں سے ٹکرانے لگیں!"

اینجل نے حیرت سے پوچھا "ان کا فائدہ؟"

ہیلن نے جواب دیا "ان کا فائدہ یہ ہے کہ یہ سلطان کی مونچھوں سے بڑھ جائیں گی۔"

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ اینجل کو ہیلن سے زیادہ ان عورتوں سے نفرت آ رہی تھی جو محبت کے فرشتوں کی طرح اس کے سر پر سوار تھیں۔ اس نے ہیلن کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے لئے زندگی کو وادیٔ پر خار بنایا جا سکتا ہے اس کی پتلی پتلی مخروطی انگلیاں بتا رہی تھیں کہ شہزادی میں شاعرانہ صلاحیتیں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس کا چہرہ ایسا تھا کہ کوئی مصور اگر دیکھ لیتا تو زندگی بھر اس کی شبیہہ بناتا رہتا۔ آنکھیں اتنی پرکشش اور خواب آگیں تھیں کہ ان سے زیادہ پرکشش اور محمود ہونے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مدور اور متدرج گولائی میں مختصر ہوتی ہوئی پنڈلیوں پر بال اگے ہوئے تھے۔ سفید پنڈلیوں پر کالے کالے بال کسی مرد کے ہیرو دکھائی دیتے تھے اور بظاہر یہ ایک عیب تھا۔ لیکن اینجل کو ان میں بھی حسن ہی کی جھلک دکھائی دی۔

ہیلن نے پوچھا "تم دیکھ کیا رہے ہو؟ اور کیا سوچ رہے ہو؟"

اینجل نے جواب دیا "اس صانع کی کاریگری پر غور کر رہا ہوں جو مادے اور اس کے امتزاج سے آپ جیسی حسین ترین ہستی کو تخلیق کر دیتا ہے میری عقل حیران ہے کہ میں کس کس عضو کی تعریف کروں، جسم کے کس کس حصے کے حسن کی ثنا خوانی کروں!"

سر پر سلطنت کنیزوں نے اسے جھڑک دیا "فضول باتوں میں اپنا وقت ضا

ضائع کرے۔ اگر گفتگو کے لئے کوئی موضوع نہیں باقی رہا تو اب یہاں سے چلا جا۔"

ہیلن نے کہا۔ "یہ سپاہی سے زیادہ تو شاعر نظر آتا ہے۔ کیا اس کی چند لطف باتوں میں تمہیں کوئی مزہ نہیں مل رہا؟"

ایک کنیز نے جواب دیا۔ "یہ اپنی حد سے بڑھ رہا ہے۔"

اینجل نے غصے میں کہا۔ "ابھی تو تو جتنی باتیں کرنا چاہے کرلے لیکن جب میں تیرے پاس سے واپس آؤں گا تو اس وقت میں اتنا اختیار ضرور حاصل کرچکوں گا کہ تجھے شہزادی کی ملازمت سے نکال باہر کردوں۔"

کنیزیں مسکرانے لگیں۔ ہیلن نے کہا۔ "افسوس کہ میں شہزادی ہوں، اگر شہزادی نہ ہوتی تو تمہارے ساتھ چل کر تمہاری بہادری ضرور دیکھتی۔"

اینجل کو بھی بہت غصہ آرہا تھا۔ اسے بہت افسوس تھا کہ آخر یہ لوگ اس کی بہادری پر یقین کیوں نہیں کرتے۔

دوسرے دن جب وہ سرویا سے رخصت ہو رہا تھا تو ہیلن بھی اس سے ملنے آئی۔ اس نے ہیلن سے دفعتہً جذبات سے پوچھا۔ "کیوں شہزادی صاحبہ! ابھی آپ اس خاکسار کو یاد بھی فرمائیں گی؟"

ہیلن نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں۔ جب بھی کوئی بڑبولا شیخیاں بگھارے گا مجھے تم فوراً یاد آجاؤ گے۔"

کنیزیں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

اس وقت ایک اور کنیز بھاگتی ہوئی آئی اور ہیلن کو مطلع کیا۔ "حضور شہزادی صاحبہ! شہزادہ مائیکل تشریف لا رہے ہیں!"

ہیلن نے جواب دیا۔ "انہیں فوراً حاضر کرو!" پھر اینجل سے کہا۔ "اینجل! تم مائیکل سے مل کر یقیناً بہت خوشی محسوس کروگے، کیونکہ یہ صاحب بھی بزعم خود بہت بہادر ہیں اور میری خاطر دنیا کا مشکل ترین کام انجام دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں!"

اینجل کا حسد سے برا حال ہونے لگا۔ اس کا حلق خشک ہوگیا۔ بمشکل پوچھا۔ "مائیکل شہزادہ ہے؟"

ہیلن نے جواب دیا۔ "ہاں، کیونکہ یہ بھی شاہی خاندان ہی کا ایک فرد ہے۔ گو کہ دوری رشتے ہی کا سہی۔"

اسی دوران چند کنیزوں کی معیت میں شہزادہ مائیکل بھی وہیں پہنچ گیا۔ اینجل

نے اسے کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ مونچھیں اس کی بھی بڑی بڑی تھیں اور اس کے سر پر ایک اونچا سا ہیٹ دکھا ہوا تھا، ہاتھ میں بید تھا۔ اس بیار کے خول میں گپتی پڑی ہوئی تھی۔

مائیکل انجل کو دیکھ کر بھڑک گیا۔ ہیلن سے پوچھا "یہ جانور شاہی سبزہ زار میں گھاس چرنے کہاں سے آگیا؟"

انجل خود کو معزز مہمان تصور کئے ہوئے تھا، ترکی یہ ترکی جواب دیا "شہزادے کی نگاہ بہت کمزور محسوس ہوتی ہے اور مذاق اتر العقل بھی دکھائی دیتے ہیں، اگر ان میں یہ دو نقص نہ ہوتے تو یقیناً ایک اچھا خاصا معزز مہمان انہیں جانور نہ نظر آتا"

مائیکل بھڑک اٹھا "چرچنا" گستاخ، بے ادب۔ تو ہے کون؟ اور یہاں کیوں آیا؟"

انجل نے جواب دیا "یہ سوال تم شہزادی سے کرو۔ ورنہ یوں میری حیثیت بہت جلد تم پر بھی آشکارا ہو جائے گی"

مائیکل نے قدرے قریب ہو کر انجل کی ناک پکڑ لی اور شوخی سے بولا "ادب سے بات کرو نو وارد انسان۔ تم مجھے پہچانو۔ اور جب پہچان لو تو مجھے میری حیثیت کے مطابق مخاطب کرو"

انجل نے مائیکل کی ناک پکڑ لی، بولا "میں اگر چاہوں تو تمہاری یہ ناک میں تمہاری انگلیوں پر رکھ دوں!"

ہیلن اور اس کی کنیزیں اس جھگڑے میں دلچسپی لے رہی تھیں اور مزے لیتی رہیں۔

مائیکل نے انجل کو دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ انجل نے مائیکل کے ایک نوکر دار تلوار سیدھی کر لی۔ شعلہ سا لپکا۔ مائیکل گھبرا گیا۔ انجل نے فراٹا لیا "اور یہ اتنا ہی کافی ہے؟"

مائیکل نے تیاہے سے گپتی نکال لی لیکن انجل نے اسے حملہ آور ہونے کا موقع نہیں دیا۔ گپتی والے ہاتھ کی کلائی پر ایک ایسی ضرب رسید کی کہ گپتی چھوٹ کر قدموں میں گری، بے انجل نے اٹھا لیا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

مائیکل نے کہا "تم مجھ پر خوب اچھی طرح ہنس لو لیکن یہ مت بھولو کہ اگر یہ بات بڑھ گئی اور فیصلہ دوئل تک پہنچ گیا تو تم چٹکی بجاتے درخصت کر دیئے جاؤ گے کیونکہ آج تک میں نے کسی سے شکست نہیں اٹھائی"

انجل نے جواب دیا "تمہیں شکست دینے کے لئے خدا نے مجھے بھیجا ہے دس پانچ دن خوب اچھی طرح کھا پی لو۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں کہ تم کتنی زندگی لکھا کر لائے ہو۔"

مائیکل نے کہا "یہ موقع سیادت کا نہیں ہے لیکن میں پھر بھی تمہیں ایک موقع سیادت کا عطا کروں گا بشرطیکہ تم نے خود کو سیادت ثابت کر دیا۔"

انجل نے مائیکل کی بات کا کوئی جواب ہی نہ دیا۔

ہیلن نے چھیڑا "کیوں جناب آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

انجل نے جواب دیا "اب میرے پاس بولنے کے لئے کچھ رہا ہی نہیں تو بولوں گا کیا۔ لیکن مائیکل میں جتنی خوبیاں یا اعزاز موجود ہیں، میں ان کا بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔"

مائیکل نے بدستور ترش لہجے میں کہا "تم حد سے بڑھ رہے ہو کوشش کرو کہ تمہاری جو حیثیت ہے اس میں کوئی منفی تغیر نہ پیدا ہو جائے۔"

انجل نے باتوں میں مائیکل کو الجھا دینے کی کوشش کی۔ بولا "میری حیثیت میں جو غیر معمولی تغیر رونما ہونے والا ہے اسی کی چکا چوند تمہاری بقیہ نظر کو بھی کھا جائے گی۔"

مائیکل نے ہیلن سے شکایت کی "ہیلن! میں یہ ساری باتیں تم سے کرنا چاہتا تھا۔ یہ جنگلی معلوم نہیں کہاں سے شہروں کی طرف بھاگ کر آ گیا ہے۔ میں اس کے گلے میں لال قینچ ڈالوں گا جس سے لوگوں کو اس کی اصل حیثیت معلوم ہو جائے گی۔"

انجل نے جواب دیا "سرِ دست یہی ارادہ اپنا بھی ہے۔"

ہیلن نے کہا "اچھا جناب! اب آپ دونوں خاموش ہو جائیں!" پھر انجل سے کہا۔ "تم مائیکل کو وہ شرط بتا دو جس کی تکمیل کے بعد تم میرے حقدار ہو جاؤ گے!"

انجل حیل و حجت پیش کرتا رہا لیکن ہیلن کے اصرار پر شرط کی ساری تفصیل بتانا ہی پڑ گئی۔ آخر میں ہیلن سے شکایتاً کہا "افسوس کہ اس بات کو راز ہی میں رہنا تھا لیکن آپ نے اس کا یوں برملا ذکر کر دیا؟"

مائیکل نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا "میں کسی شرط و رط کا پابند نہیں ہوں۔ تو اس شرط کو پوری کر کے واپس آ جا اس وقت میں دیکھ لوں گا کہ تو ہیلن کو کس طرح حاصل کرتا ہے!"

ہیلن انجل کو ایک طرف لے چلی گئی اور سرگوشی میں کہا "تم اس کی باتوں سے فکر مند مت ہونا، بھلا کون ایسی لڑکی ہے جو زندگی بھر کے لئے اس مجسمۂ حماقت کو خود پر مسلط کر لے گی!"

اینجل کی تشویش دور ہو گئی، ساری فکر مندی سیانی رہی، ہیلن کا ذرا سا اشارا اس کے لئے بہت کافی تھا۔

* * *

اینجل انڈریا نوپل پہنچا تو معلوم ہوا سلطان محمد ایشیائے کوچک کی شورشیں دبانے میں مشغول ہے، یہ بغاوتیں بھی عیسائیوں کی سازشوں کا ایک حصہ تھیں۔ مسیحی قومیں نوجوان بادشاہ کو اس کے اپنے ہی ملک کی بغاوتوں میں الجھا کر کمزور کر دینا چاہتی تھیں۔ اور جب انہیں یہ یقین ہو جائے گا کہ نوجوان بادشاہ بغاوتیں دبانے میں ناکام رہا ہے تو وہ خود بھی ترکی علاقوں میں داخل ہو جائیں گی۔ اور چاروں طرف سے یلغار کر کے اس فتنے کو ہمیشہ کے لئے پاک کر دیں گی۔

شہزادی ماریہ نے اینجل کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ اس دن اس نے بطور خاص سیاہ لباس زیب تن کیا اور دونوں انگلیوں میں نہایت بیش قیمت انگوٹھیاں پہن لیں۔ اینجل نے بھی شہزادی کے روبرو جانے سے پہلے بہت اچھے کپڑے پہنے اور انہیں خوشبو سے معطر کر دیا۔ وہ شہزادی کے روبرو پہنچتے ہی ادب سے دوزانو ہو گیا۔ یہاں بھی تنہائی اس کے سر پر مسلط تھیں۔

شہزادی ماریہ نے پوچھا "سردیا والے کیسے ہیں؟"

اینجل نے جواب دیا "کوئی فرق نہیں آیا۔ جیسے پہلے تھے ویسے ہی آج بھی ہیں۔"

شہزادی نے اسی بے تکے جواب پر شکایتی انداز میں کہا "اینجل! تمہارا یہ جواب مطمئن کر دینے والا نہیں ہے۔"

اینجل شہزادی کو اس قیامت خیز لباس میں دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا۔ اس وقت شہزادی کا ہر عضو اینجل کو دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ شہزادی نے بھی قصداً بے نیازی اختیار کر رکھی تھی۔

اینجل کے ذہن میں ہیلن کروٹیں لے رہی تھی گو کہ اس نے اس کا دل بھی دکھایا تھا۔

شہزادی نے کہا "اینجل! تم کھوئے کھوئے کیوں رہنے لگے ہو؟"

اینجل نے جواب دیا "مجھے یہاں بھول آنا پڑا ہے ورنہ میں تو سردیا ہی میں رہ جاتا۔"

شہزادی نے کنیزوں کو ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو شہزادی نے سوال کیا "آخر تم یہ کیوں نہیں بتاتے کہ میرے والد کیسے ہیں میری بہن ہیلن کیسی ہے اور وہ دوسرے بہت سے لوگوں کا کیا حال ہے؟"

اینجل نے جواب دیا "آپ کے والد بڑے اچھے انسان ہیں، اور ہیلن کا تو کوئی جواب ہی نہیں، کتنے ہی امیر زادے اور شہزادے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے در پر ناصیہ فرسائی کرتے ہیں۔"

شہزادی نے شرما کر پوچھا "کبھی مجھے بھی یاد کیا تم نے؟"

اینجل نے جواب دیا "آپ کو یاد کیا خاک کرتا۔ وہاں ہر وہ آپ کی شکل و شباہت کی ایک دوسری لڑکی بھی موجود ہے۔"

شہزادی نے پوچھا "وہ دوسری لڑکی میری بہن ہیلن ہوگی کیونکہ وہ مجھ سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے شہزادی صاحبہ! آپ کو بہت یاد کرتی تھی وہ یہاں آپ کے پاس آنے کے لئے بے چین ہے۔"

شہزادی نے پوچھا "اینجل! کیا نیا لوگوں کی دنیا وہاں کے لوگ اب بھی سوجاتے ہیں؟ یا سست ہو گئے ہیں؟"

اینجل نے کہا "شہزادی صاحبہ! سچ بات تو یہ ہے کہ سرد ہوا کے لوگ غضب کے بے فکرے ہیں ان پر شادی وغم کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ میں نے انہیں کئی دکھ بھری داستانیں سنائیں لیکن ایسے موقعوں پر وہ رو لے نہیں ہنستے ہیں۔"

شہزادی ہاتھ ملنے لگی۔ وہ جو کچھ جاننا چاہتی تھی اینجل اسے بار بار نظر انداز کر رہا تھا۔

شہزادی نے پوچھا "میرا شوہر مر چکا ہے اور میں ابھی جوان ہوں کیا میرے گھر والوں کو اس کا احساس نہیں ہے کہ میری دوسری شادی بھی ہو سکتی ہے؟"

اینجل نے جواب دیا "میں نے ان ذرائع نوعیت کے سوالوں سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔"

شہزادی نے غصے میں کہا "تم دور ہو جاؤ میری نظروں سے کیونکہ اب تم پہلے جیسے اینجل نہیں رہے سر دیا جا کہ خدا جانے تمہیں ہو کیا گیا ہے۔"

اینجل اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن کچھ دیر بعد جا کر پھر واپس آ گیا۔ بولا "محترم شہزادی صاحبہ!

مجھے معاف فرما دیجئے میں سر دیا سے واپس آ کر اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

شہزادی سے پھر بھڑکا "اب تم یہاں ایک لمحے بھی نہیں ٹھہرو گے۔ اسی وقت چلے جاؤ یہاں سے۔ اب میں تم سے ایک بات بھی نہیں کروں گی۔"

اینجل نے نفسیاتی چمکا لگایا "میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ آپ کے والد نے میرے سپرد ایک ایسا کام کر دیا ہے جسے بخوبی انجام دے کر میں آپ کی چھوٹی بہن ہیلن کا مستحق ہو جاؤں گا۔"

"تم جھوٹے ہو، میرا باپ تم سے اس قسم کا وعدہ ہرگز نہیں کر سکتا۔"

"آپ دیکھ لیجئے گا۔" اینجل کہنے لگا "میں یہاں آیا ہی ایک خاص مقصد سے ہوں۔"

شہزادی نے کہا "اگر ایسا ہے تو میں بھی دیکھوں گی کہ تو اپنے اس خاص مقصد میں کس طرح کامیابی حاصل کرتا ہے۔"

اینجل نے ڈر کر پوچھا "کیا آپ میرے اس مقصد سے آگاہ ہو گئی ہیں؟"

شہزادی نے کہا "ہاں، میں جانتی ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو، میں سلطان کی واپسی کی منتظر ہوں، پھر دیکھتی ہوں تم اپنے مقصد میں کس طرح کامیابی حاصل کرتے ہو؟"

اینجل کا مارے ڈر کے بہت برا حال ہو گیا۔ اس نے سوچا اگر شہزادی اس کے ارادے سے واقعی واقف ہو گئی ہے اور اس نے اس کا انکشاف بادشاہ کے روبرو کر دیا تو اس کا حشر کیا ہو گا۔ اس نے شہزادی کی خوشامد کی اور کہا "شہزادی صاحبہ! مجھے ایک بار معاف کر دیجئے اس کے بعد کوئی غلطی نہ کروں گا۔ آپ اطمینان رکھئے۔"

شہزادی برابر بڑبڑاتی رہی "جب تک میں اس محل میں ہوں، اور بادشاہ کی عطا کردہ آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہی ہوں میں تمہاری کامیابی تک اپنے دل میں نہیں لا سکتی تم جس سازش کو پرورش کر کے اپنے ساتھ لائے ہو، میں بادشاہ کے سامنے اس کا پردہ چاک کر کے رہوں گی۔"

اینجل شہزادی کے قدموں میں گر گیا "مجھے معاف کر دیجئے شہزادی صاحبہ! میں اپنے نازیبا طور و طریق پر نادم اور شرمسار ہوں۔"

شہزادی نے اس کی پیشانی پر ایک ٹھوکر رسید کر دی۔ بولی "جاؤ، ہیلن کے پاس

جاؤ، وہ تمہیں تنگنی کا ناچ نچائے گی ابھی تم نے اسے سمجھا نہیں ہے اچھی طرح؟"
ایجل کی پیشانی سے خون جاری ہو گیا۔ لیکن شہزادی نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

❖ ❖ ❖

کچھ عرصے بعد نوجوان بادشاہ محمد خان ایشیائے کوچک کی مشورشیں دبا کر واپس آ گیا۔ اس نے آتے ہی ایجل کو غیر مسلح کر کے نظر بند کر دیا۔ ایجل کو شبہ گذرا کہ سلطان کی یہ کارروائی یقیناً شہزادی کی ایما پر عمل میں لائی گئی ہے۔ اس وقت اسے شہزادی کے ساتھ ساتھ اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر شہزادی کے روبرو اس نے بیلن کا نام لیا ہی کیوں، اور جس مقصد کو لے کر وہ یہاں آیا تھا، اس کا اشارتاً ہی سہی، شہزادی کے سامنے ذکر ہی کیوں کیا؟
لیکن اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ گزرے لمحات اور گزری باتوں کے ماتم سے فائدہ؟
اسی دوران سلطان محمد کی خدمت میں قسطنطنیہ کا ایک وفد حاضر ہوا۔ قسطنطنیہ کے فرماں روا قسطنطین سیزدہم نے سلطان کو نوعمر اور ناتجربہ کار سمجھ کر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔
سلطان محمد نے وفد سے دریافت کیا۔ "آخر تمہارا بادشاہ کیا چاہتا ہے؟"
وفد کے قائد نے جواب دیا۔ "ہمارے بادشاہ نے سلطان عالی کو مطلع اور متنبہ کیا ہے کہ آپ کے والد مرحوم کے زمانے سے قسطنطنیہ میں اورہان نامی ترک شہزادہ نظر بند ہے اس کے اخراجات آپ کی حکومت برداشت کرتی چلی آ رہی ہے۔ لیکن اب حالات اور وقت کے پیش نظر وہ رقم ناکافی ٹھہرتی ہے اس لئے ہمارے بادشاہ کا حکم ہے کہ اس میں اضافہ کر دیا جائے۔"
لفظ حکم نے سلطان کے جسم میں آگ لگا دی لیکن اس نے مصلحت اندیشی اختیار کی۔ وفد کے قائد سے پوچھا۔ "اگر اس رقم میں اضافہ نہ کیا جائے تو؟"
وفد کے قائد نے جواب دیا۔ "تب پھر ہماری حکومت اس امر پر مجبور ہو جائے گی کہ شہزادے کو رہا کر دے تاکہ وہ شہزادہ اپنی گزر بسر کے لئے رقم کا انتظام خود کرے اور ان وسائل کو فراہم کرے جو اس کی شان و شوکت اور پُرتعیش زندگی کے لئے ضروری ہوں۔"

سلطان نے کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا بادشاہ ہمارے روبرو ایک امیدوار سلطنت کو لاکھڑا کرے گا اور اس طرح وہ ہمیں پریشان اور عاجز کرنے کی کوشش کرے گا۔"

قاصد نے جواب دیا "نظر بند شہزادہ اور نہ کا طالب ہے اور ہماری حکومت کے خیال میں اس محروم شہزادے کو گزر بسر کے لئے اگر اور نہ بخش دیا جائے تو کوئی معیوب بات نہ ہوگی۔"

سلطان نے کہا "تم لوگ واپس جاؤ اور اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ تمہارا مطالبہ ابھی زیر غور ہے ہم اپنا حتمی جواب بہت جلد بھیج دیں گے۔"

قاصد نے اصرار کیا "ہماری حکومت کو جلد از جلد جواب ملنا چاہیئے۔ کیونکہ جتنا زیادہ وقت گزرے گا ہماری حکومت نظر بند شہزادے پر فضول اخراجات سے زیر بار ہوتی جائے گی۔"

وفد واپس چلا گیا۔

سلطان نے اس کے جاتے ہی ادرنہ یا نوپل میں ایک شاندار قصر کی تعمیر کی شروع کو دی۔ اس سے پہلے سلطان محمد اول نے قسطنطنیہ کے مقابل ایشیائی ساحل پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا جس کا نام حصن اناطولیہ رکھا تھا، محمد ثانی نے قسطنطنیہ کے مقابل یورپی حصے میں ایک نئے قلعہ کی تعمیر شروع کرادی۔ یہ قلعہ رومیلیا ناسی جگہ پر بن رہا تھا۔ ہزاروں مزدور اور معمار کام پر لگا دیئے گئے۔

قسطنطین کو قلعہ کی تعمیر پر اعتراض ہوا، اسی نے سلطان کی خدمت میں ایک وفد اور روانہ کیا۔ اس وفد نے پہلے تو اس کا جواب دیا کہ سلطان نے ابھی تک قسطنطین کے مطالبے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سلطان نے اپنے وزیر خلیل پاشا کو حکم دیا کہ اس وفد کو اس کے سابقہ مطالبے کا مفصل جواب دے دیا جائے۔

خلیل پاشا کا وہ جواب جو سلطان محمد ثانی کی ایما اور مشورہ سے تیار کرکے رکھا گیا تھا، رومی وفد کے حوالے کر دیا گیا، اس میں خلیل پاشا نے بہت سخت لب و لہجہ اختیار کیا تھا۔

"احمق اور بدبخت رومیو! ہمیں تمہاری چالوں کا پورا علم ہے، اس کے برعکس تمہیں اس خطرے کا کوئی احساس نہیں جو تمہارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ محتاط سلطان (مراد ثانی) چل

بسا۔ اب اس کا تخت ایک ایسے نوجوان فاتح کے قبضے میں ہے جو کسی بھی پابندی کا سزاوار نہیں اور جس کے راستے میں کوئی بھی عنصر رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اگر تم اس کے ہاتھ سے بچ نکلے تو اسے خدا کی رحمت سمجھنا اور یقین کر لینا کہ ابھی خدا تمہارے گناہوں کی سزا میں ڈھیل دے رہا ہے تم بے سود اور بالواسطہ دھمکیوں سے ہمیں ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔ تم شہزادے اور خان کو رہا کر دو اسے اور نہ کا بادشاہ بنا دو تم دریا پار سے ہنگری والوں کو اپنی مدد کے لئے بلا لو ہم کو اس کی بھی اجازت ہے کہ ہمارے خلاف مغربی قوموں کو بھی میدان جنگ میں لے آؤ، عزم جو چاہو کر دو، مگر یہ یقین رکھو کہ نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ ہمیں اشتعال دلاؤ گے اور اپنی تباہی اور بربادی کو اور قریب لے آؤ گے۔"

روس وفد نے سلطان سے شکایتاً کہا "حضور والا کے علم میں ہو گا کہ آپ کے جدِ امجد نے یہاں قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت طلب کی تھی، جسے مسترد کر دیا گیا تھا۔ اب آپ کسی اجازت اور معاہدے کے بغیر سمندر پہ قلعہ تعمیر کرا رہے ہیں تو یہ معاہدے کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔"

سلطان نے جواب دیا "ابھی تک تمہارے شہر قسطنطنیہ کے خلاف ہمارا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور تمہارے شہر کی حدود اس کی فصیلوں تک ہیں، اس کے بعد جو کچھ ہے تمہاری حکومت کی حدود سے باہر ہے، تم اپنے بادشاہ سے کہہ دینا کہ ماضی میں تم اہل ہنگری سے اتحاد کر کے ہمارے ملک پر حملہ کر چکے تھے اور فرانسیسی پیڑے نے درۂ دانیال کو روک لیا تھا۔ لیکن میرے والد مراد نے وقت سے کام لے کر آبنائے باسفورس سے گزر گئے۔ اس وقت میں خود اڈریانوپل میں محصور تھا۔ اپنے بادشاہ سے پوچھنا کیا وہ اس ماضی کو بھلا چکا ہے، جب سامان کانپ رہے تھے اور تم لوگ ان کی صرف چھیننے کے درپے تھے؟"

روس کے نمائندے نے سوال کیا "لیکن حضورِ والا! ان تمام باتوں کا قلعہ کی تعمیر سے کیا تعلق ہے؟"

"بالکل ہے" سلطان نے طیش میں کہا "اس جنگ میں والد کے میدان میں جب میرے والد نے فتح حاصل کی تھی تو اسی وقت یہ قسم کھائی تھی کہ باسفورس کے مغربی ساحل پر قلعہ ضرور تعمیر کراؤں گا اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے والد کی قسم پوری کروں۔"

قائد نے دلیری سے عرض کیا۔ "لیکن حضور والا کو یہ بھی علم ہوگا کہ اس کے ناخوشگوار نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔"

سلطان نے مشتعل ہو کر جواب دیا۔ "بے شک ناخوشگوار نتائج نکل سکتے ہیں لیکن کس کے خلاف؟ کس کے حق میں؟ یہ فیصلہ وقت کرے گا میں تمہاری حکومت کو یہ حق نہیں دے سکتا کہ جس خطے کا میں مالک ہوں وہ وہاں میرے اعمال پر پابندیاں عائد کرے۔ یہ خطہ میرا ہے۔ باسفورس کے ایشیائی ساحل پر ترک آباد ہیں اور اس یورپی ساحل کو رومیوں نے خود ہی خالی کر دیا ہے، یہاں قلعہ تعمیر ہو کر ہی رہے گا۔"

وفد کے قائد نے پوچھا۔ "کیا یہ سلطان والا کا قطعی اور آخری جواب ہے؟"

"ہاں قطعی بھی اور آخری بھی۔ تم لوگ واپس جاؤ اور اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ موجودہ عثمانی سلطان اپنے پیش روؤں سے بالکل مختلف ہے۔ کہنا میرے عزائم میرے اپنے پیش روؤں کی خواہشات سے بھی آگے ہیں، میں وہ سب کچھ پورا کر دینا چاہتا ہوں جو میرے آباؤ اجداد کے ارادوں میں بھی نہ تھا۔"

وفد نے واپسی کے لئے حرکت کی۔ پوچھا۔ "کیا ہم لوگ جا سکتے ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا۔ "ہاں اب تم لوگ جا سکتے ہو، تمہیں بہ حفاظت جانے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن واپس جاتے یہ بھی سنتے جاؤ کہ اگر میرے پاس اس سلسلے میں پھر کوئی سفیر آیا تو وہ کھال کھینچے جانے کا مستحق قرار دیا جائے گا۔"

وفد چلا گیا۔ قلعہ کی تعمیر کا کام ہوتا رہا۔ عیسائی اس تعمیر کو یا دل نخواستہ گوارا کئے رہے۔ یہ قلعہ تین ماہ میں تیار ہو گیا۔ دوسری طرف اڈریانوپل کا قصر بھی تیار ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے اس قصر کا نام جہاں نما اور قلعہ کا نام حصن روملیا رکھا۔ قلعہ کی شکل مثلث تھی اور اس کے ہر گوشے پر نہایت مضبوط اور مستحکم برج بنوائے گئے تھے اس کی دیواریں بائیس فٹ چوڑی تھیں لیکن برجوں کی چوڑائی تیس فٹ رکھی گئی تھی۔

سلطان نے قلعہ کی تعمیر کے بعد یہاں فوج بٹھا دی اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنے گھوڑوں اور خچروں کو آس پاس کی چراگاہوں میں چرائیں اور اگر کوئی سفارتی شخص مزاحم ہونے کی کوشش کرے تو اسے منادی جاتے اس کے ساتھ ہی سلطان نے یہ حکم بھی دیا کہ ساحل سے گزرنے والے جہازوں سے محصول وصول کیا جائے۔ وینس کے ایک جہاز نے سلطان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تو اسے توپ زنی کر کے سمندر کی تہہ میں

بٹھا دیا گیا۔

★ ★ ★

سلطان نے ایجل کو اس وقت طلب کیا جب وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید سلطان نے اسے فراموش کر دیا ہے۔ لیکن جب سلطان کے آدمی نے اسے یہ بتایا کہ "تمہیں سلطان یاد فرما رہے ہیں" تو اس کی آدھی جان نکل گئی۔ اس نے خوفزدہ انداز میں پوچھا "میرے بھائی! جب تم سلطان کے پاس سے چلے تھے اس وقت اس کے چہرے پر کیسی کیفیت پائی جاتی تھی؟"

سلطانی خدمت گار نے جواب دیا "کس میں اتنی ہمت ہے کہ سلطان کے چہرے کو غور سے دیکھ سکے!"

ایجل چکرایا ہوا تھا۔ بولا "تم ٹھیک ہی کہتے ہو میرے بھائی کس میں اتنی ہمت ہے کہ سلطان کو نظر بھر کے دیکھ سکے۔ لیکن تم یہ ضرور بتا سکو گے کہ اس وقت سلطان کا لب و لہجہ کیسا تھا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ سلطان کے لہجے میں عام سی کیفیت پائی جاتی تھی یا اس میں ناراضی اور غصہ بھی شامل تھا؟"

خدمت گار نے جھنجھلا کر کہا "اب زیادہ باتیں مت بنا۔ میں نہیں جانتا کہ سلطان کے لب و لہجے میں غصہ تھا یا نہیں تھا۔"

ایجل بوجھل قدموں سے چل پڑا۔ "خدا خیر کرے۔ معلوم نہیں کیوں میں واپس آ گیا، سر دیا ہیں بڑی پرسکون زندگی گزار سکتا تھا۔"

خدمت گار نے طنزاً کہا "اب آدمی کو اس کی شامت دھکا دیتی ہے تو اسے یہی دن دیکھنا پڑتا ہے۔"

ایجل نے تشویشناک اور دم زدہ لہجے میں کہا "تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی خطرے کی بات ہے ضرور۔ یا میرے خدا میری جان بچا۔ میں بالکل بے قصور اور سلطان کا جاں نثار اور وفادار ہوں۔"

جب وہ سلطان کے سامنے پہنچا تو دیکھا، سلطان کچھ افسردہ بیٹھا ہے۔ ایجل کی حالت اس وقت اور زیادہ غیر ہو گئی جب اچانک دو خدمت گاروں نے اس کی دونوں طرف کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے قابو میں کر لیا۔ ان حالات میں اسے یقین ہو گیا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اسی وقت سلطان کے اشارے پر ایک

اور شخص موجود ہوا اور وہ سلطان کے سامنے بائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے اس شخص سے کہا "تم اس نابکار سے پوچھو کہ اس نے سردیا میں اپنے شب و روز کس طرح گزارے ہیں؟"

اس شخص نے سلطان کا سوال دہرایا۔ اینجل تھر تھر کانپنے لگا۔ دہشت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ سلطان نے درشت لہجے میں کہا "اس سے جواب لیا جائے۔"

سلطانی نمائندے نے سختی سے کہا "جواب کیوں نہیں دیتا ظل الٰہی جانتے ہیں کہ تو کسی صفائی کے بغیر ہی سزا پا جائے گا۔"

اینجل نے گڑگڑاتے ہوئے کہا "حضور والا! سردیا والوں نے میری اتنی ضیافتیں اتنی دعوتیں کیں کہ میں دعوتیں اڑانے کے علاوہ کچھ کر ہی نہ سکا۔"

سلطان نے کہا "اس سے پوچھو یہ قسطنطنیہ کیوں گیا تھا کیا وہاں بھی دعوتیں اڑاتا رہا؟"

نمائندے نے سلطان کا سوال دہرایا۔ اینجل کے رہے سہے حواس بھی رخصت ہو گئے وہ دونوں خدمت گاروں کے بازوؤں میں کسی شرابی کی طرح جھول گیا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا "سلطان معظم رحم! حضور والا رحم!"

سلطان نے پوچھا "رحم کیوں؟ کس بات پر رحم؟ کس جرم پر رحم؟"

اینجل کی پھر ہمت بندھی، بولا "حضور والا کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میرے عزیز اور احباب قسطنطنیہ میں بھی ہیں اور وہاں مجھے سینٹ ابا صوفیہ کی زیارت کو جانا تھا۔"

سلطان نے اپنے نمائندے کے ذریعہ سوال کیا "تیری ساری باتیں مشتبہ ہیں! بہرحال، تیرا ہر جواب شک آلودہ ہے اور کیا تو نے یہ مثل نہیں سنی کہ ایک جھوٹ کی پردہ داری کے لئے لاتعداد جھوٹ بولنا پڑتے ہیں؟"

اینجل کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا سلطان کو سب کچھ ہو چکا ہے؟ اور اگر معلوم ہوا ہے تو اس معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟"

سلطان نے کسی کو حکم دیا "اسے حاضر کیا جائے!"

اور ذرا دیر بعد دو خدمت گار ایک اور شخص کو اپنے بازوؤں میں جکڑے ہوئے سلطان کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اینجل نے اس شخص کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ مائیکل تھا۔

سلطان نے مائیکل کو حکم دیا۔ "یہ بدبخت جس منصوبے کے ماتحت یہاں آیا ہے اسے بیان کیا جائے۔"

مائیکل نے قرقردہ سب کچھ بتانا شروع کر دیا جسے پولداکر کے اینجل ہیلن کو حاصل کر لیتا۔ اس نے اپنی ماں کے اس بھائی پتھر کو دور کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ سلطان سے مل کر اینجل کا حالا منصوبہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

مائیکل نے کیا کچھ کہا، اینجل پوری طرح نہیں سن سکا کیونکہ خوف اور دہشت سے دل اتنی زور زور سے دھڑکا کہ بعد میں ڈوبتا چلا گیا آنکھوں کے آگے بے وقت کی سیاہی دوڑتی چلی گئی اور اینجل بالکل بے جان سا ہو کر دونوں خدمت گاروں کے بازوؤں میں جھولنے لگا۔ گردن ایک طرف جھک گئی اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو دینے کی وجہ سے سلطانی رعب و دبدبے اور عتاب سے نجات پا گیا۔

* * *

قسطنطین نے بھی تمام مسیحی دنیا کو اپنی مدد کے لئے آواز دی اس کی مسیحی دنیا کو حصتیں میں تقسیم تھی۔ ایک حصہ چرچ آف روم کے زیر اثر تھا اور یہ پوری مغربی دنیا پر پھیلا ہوا تھا، دوسرا حصہ چرچ آف گریک کے دائرہ اثر میں تھا، یہ قسطنطین کے ماتحت تھا اور اس کے مشرقی حصوں میں اثر و نفوذ رکھتا تھا، قسطنطین نے نہایت دانشمندی اور ایثار کا ثبوت دیتے ہوئے روما کے پوپ کو لکھا "جناب والا اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے مذہبی اختلافات بھلا دیں اور سب متحد اور متفق ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کریں، میں بخوشی آپ کے عقائد کو تسلیم کرتا ہوں اور آئندہ قسطنطنیہ کا گرجا بھی آپ ہی کے ماتحت ہو گا۔"

اس پیش کش اور جذبہ خیر سگالی نے وہ کام کیا جو بڑی بڑی تدبیریں بھی نہ کر سکتی تھیں۔ پوپ نے خوش ہو کر پورے براعظم یورپ میں جہاد کا اعلان کر دیا۔ وینس اور جینوا کی بحری اور برسن توجیں قسطنطنیہ کی طرف چل پڑیں اسپین کی شمالی ریاست اراگون اور سسلی کے مویشی دستے بھی قسطنطین کی مدد کے لئے حرکت میں آ گئے۔

ادھر ہنگری سے اریان نامی ایک شخص سلطان محمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ان اہل وطن اور ہم توسون کی ناقدری کا شکار تھا۔ اس نے سلطان کے پاس آ کر اسلام قبول کر لیا اور بتایا کہ وہ سلطان کے لئے بہترین ڈوریاں توپیں تیار کر سکتا ہے۔ پہلے تو سلطان خوب اچھی طرح اس کا منصوبہ سمجھتا رہا اس کے بعد اس نے حکم دے دیا کہ توپیں تیار کی

جاتیں۔ انسان توپوں کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔

انجل کو حیرت اس بات پر تھی کہ سلطان نے اسے فوراً ہی قتل کیوں نہ کرا دیا۔ دوران اس کے پہرے داروں نے بتایا کہ سلطان بطور خاص توپیں تیار کرا رہا ہے اور ان میں سے کسی ایک توپ میں انجل کو ڈال کر قسطنطنیہ کے اندر پھینک دیا جائے گا۔ انجل خوفناک سزا کا حال سن کر نیم مردہ ہو گیا اور روتے روتے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ اب اسے ماریہ یاد آ رہی تھی اور نہ ہیلن ماسے دونوں سے نفرت ہو گئی تھی۔

سلطان محمد اپنی فوجوں کے ساتھ قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے پہنچ گیا اور اس کا خشکی کی طرف سے محاصرہ کر لیا۔ قسطنطنیہ والوں نے بھی فصیل کے برجوں پر توپیں چڑھا دیں اور ان پر بے شمار آدمی متعین کر دیئے۔ بحیرۂ مارمورہ میں سلطان کے جہازوں سے قسطنطنیہ کی مدد کے لئے آنے والے بحری جہازوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ اسی دوران جنیوا کے پانچ بحری جہازوں نے سلطان کی بحری ناکہ بندی کو توڑ دیا اور سامان رسد لے کر خلیج باسفورس سے شاخ زریں میں داخل ہو گئے۔ سلطان یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ساحل سمندر پر اپنے دستے کے ساتھ بے چینی سے ادھر ادھر گھوڑے دوڑاتا پھر رہا تھا۔ اسے اپنی بحریہ کی ناکہ بندی کے ٹوٹ جانے کا بڑا ملال ہوا ان جہازوں کے بعد پانچ اور جہاز آ رہے تھے اور سلطان نے اپنے امیر البحر کو حکم بھیجا کہ ان جہازوں کو ہرگز نہ نکلنے دیا جائے۔ ترکی بحریہ حرکت میں آ گئی اور اس نے دشمن کے جہازوں کو محاصرے میں لے لیا۔ ترک بحری سپاہ دشمن کے جہازوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی اور دشمن انہیں روکنے لگا۔ قسطنطنیہ کی فصیل پر چڑھے ہوئے عیسائی بھی اس کشمکش کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ترکوں کے جہاز بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور غنیم کے جہاز بہت بڑے بڑے تھے۔ ترکوں کے جہازوں نے پنجے میں گھڑے ہوئے دشمن کے جہازوں کو لگ رہے تھے گویا انہوں نے دیو ہیکل دشمن کو محاصرے میں لے رکھا ہے۔ پھر اچانک یہ تماشا دیکھنے میں آیا دشمن کے ترکی بحریہ کی ناکہ بندی توڑ کر تیزی سے شاخ زریں میں داخل ہو گئے۔ شاخ زریں کے کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک موٹی فولادی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ قسطنطنیہ والوں نے اس زنجیر کو ڈھیل دی اور ان کے امدادی جہاز شاخ زریں میں محفوظ ہو گئے ان کے پیچھے پیچھے ترکی جہاز بھی آ گئے۔ لیکن ان کے آتے ہی زنجیر کھینچ کر دیوار کے ساتھ کس دی گئی جس سے ترکی شاخ زریں میں نہیں داخل ہو سکے۔ اس ناکامی نے سلطان بے قابو کر دیا اس نے اسی وقت اپنے امیر البحر کو طلب کیا۔ اور اس کی مونچھیں اور ڈاڑھی

ے پٹانی کمزوری اس مرتبہ نے یہ اثر ضرور دکھایا کہ اس کے بعد کوئی بہانہ ترکوں کی بحری
بندری کو نہیں توڑ سکا۔

سلطان محاصرہ کئے پڑا تھا۔ اینجل نظر بند تھا۔ سلطان کی دوری نے اینجل کو
ے سکون بخشا۔ شہزادی ماریہ کو اینجل کے زیر عتاب آنے کا علم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہم قوم
سی بھی طرح بچا لینا چاہتی تھی، اس نے شاہی پہرے داروں کو رشوتیں دے کر اینجل سے
اور مل کر کوئی منصوبہ بنانے کی سازش کی۔ رات کی تاریکی میں جبکہ لوگ خواب خرگوش
مزے لیتے ہیں، شہزادی مرد کے لباس میں اینجل کے پاس جا پہنچی۔ اینجل پہلی نظر میں
پہچان نہیں سکا۔ وہ سمجھا کوئی ترکی شہزادہ اس کی جان لینے آ پہنچا ہے۔ وہ شہزادی کو
تے ہی گرفتار کرا لیتا "معزز شہزادے! میں بالکل بے گناہ ہوں، آپ یقین کریں میری خطا
اتنی سی ہے کہ میں سرویا کے بادشاہ کی بیٹی ہیلن سے محبت کرنے لگا ہوں اور
یری خوش قسمتی کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے اور یہ کمبخت مائیکل، جس نے ایک
زش تیار کر کے مجھے گرفتار کرا دیا ہے، دراصل میرا رقیب ہے اور چاہتا ہے کہ
ہیلن اور اس کے درمیان سے دور ہو جاؤں، اب آپ ہی غور فرمائیں کہ میں کس حد
گناہگار یا مجرم ہوں۔"

شہزادی ماریہ کو اس انکشاف سے ذہنی اذیت پہنچی۔ وہ کچھ دیر کھڑی بس
ھی رہی، اینجل کے ہوش و حواس پر محبت کی دہشت دھند کی طرح چھائی ہوئی تھی
آنکھیں دیکھتا تھا لیکن ان کی بصارت ناقابل اطمینان تھی۔

ایک پہرے دار نے اینجل کو جھڑکا "تو یہ کیا ہے سر دیا تقریر کر رہا ہے اور کس کے
ے کر رہا ہے، ہوش و حواس میں رہ کر کام کی باتیں کر لے کیونکہ وقت بہت کم ہے۔"

اینجل نے بے بسی سے جواب دیا "افسوس کہ میری عقل کام نہیں کر رہی، شہزادے
مجھ سے تعارف کرا دیا جائے اور غائبانہ ملاقات بتا دی جائے۔"

شہزادی نے اس کی پریشانی دور کرتے ہوئے بولی "اینجل میں ہوں ماریہ۔ مجھے
پانے کی کوشش کرو۔"

اینجل کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شہزادی کو
ھنے لگا، اسے فوراً ہی اپنی اس غلطی کا احساس بھی ہوا کہ اس نے ہیلن کا ذکر خواہ
اہ کر دیا۔

شہزادی نے پوچھا "اینجل! تم سچ سچ بتا دو کہ تم پر جو الزام لگایا گیا ہے

وہ کس حد تک صحیح یا غلط ہے؟"

اینجل کو جو کچھ کہنا تھا وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا، اس نے مختصراً کہا: "مجھے بہت افسوس ہے کہ مجھ پر یہ بہتان باندھا گیا ہے، تہمت لگانے والی عورت جھوٹی ہے، میں بے گناہ ہوں۔"

شہزادی نے افسوس سے کہا: "لیکن تم اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتے۔"

اینجل نے جواب دیا: "ہاں یہ بات بھی ہے۔"

شہزادی نے کہا: "اگر تم واقعی بے گناہ ہو تو ایک بار پھر تم سلطان کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرو، کیونکہ موت میں بڑا اثر ہوتا ہے اور یہ دل نکلتا ہے۔"

اینجل نے خوشامد کی: "شہزادی صاحبہ، کیا اس معاملے میں آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتیں؟"

شہزادی نے جواب دیا: "سلطان تو عمر ضرور ہے لیکن اس کے ارادوں میں فولاد کی سی سختی ہے، اگر اس نے تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو تم یقین کرو کہ اسے بدلا نہیں جا سکے گا۔"

اینجل نے روتے ہوئے کہا: "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں قتل کر دیا جاؤں گا۔"

اسی وقت ایک خوفناک دھماکے نے سب کو دہلا دیا۔

شہزادی نے گھبرا کر پوچھا: "یہ دھماکہ کیسا ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا: "اسپان نامی ہنگری کے ایک کاریگر نے سلطان کے لئے توپ بنائی ہے۔ یہ شاید اسی کا تجربہ کیا گیا ہے۔"

شہزادی نے پوچھا: "یہ تجربہ یہاں سے کتنی دور کیا گیا ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا: "یہاں تک میرے علم کا تعلق ہے یہاں سے تقریباً میل دور یہ تجربہ کیا گیا ہے اور اس توپ سے تقریباً چھ سو پونڈ کا سنگی گولہ پھینکا گیا۔ جو اسپان کے اندازے کے مطابق ایک میل کے فاصلے پر گرا ہوگا۔"

شہزادی نے کہا: "اگر یہ ساری باتیں درست ہیں تو ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی کہ اب قسطنطنیہ زیادہ دنوں کا مہمان نہیں ہے۔"

اینجل اندر سے غمزدہ ہو رہا تھا۔ بولا: "اور اگر یہ درست ہے کہ توپ تیار ہو چکی ہے تو اب بس بھی بس چند دنوں کا مہمان ہوں، کیونکہ میں نے سن رکھا ہے کہ مجھے توپ

دہانے میں رکھ کر اڑا دیا جائے گا اور قسطنطنیہ والوں پر میرے خون کا چھڑکاؤ ہو جائے گا اور میرے اعضائے جسمانی کے ریزے ہوا میں بکھر جائیں گے۔"

شہزادی نے ہنس کر پوچھا: "یہ تجھے کس نے بتا دیا کہ تو توپ میں رکھ کر اڑا دیا جائے گا؟"

اینجل نے جواب دیا: "انہی پہرے داروں میں سے کسی نے بتایا تھا۔"

شہزادی نے افسوس کا اظہار کیا: "اینجل! مجھے افسوس ہے کہ میں تجھے اتنا بزدل نہیں سمجھتی تھی۔"

اینجل نے کہا: "میں بزدل نہیں ہوں شہزادی صاحبہ! بلکہ اپنے بے گناہی کی موت مرنے کا قبل از وقت افسوس کر رہا ہے۔"

"اگر تم خود کو واقعی بے گناہ سمجھتے ہو تو تمہیں مطمئن ہو جانا چاہیئے، بالکل مسیح کی طرح، جو چپ چاپ صلیب پر چڑھ گئے تھے۔"

اینجل نے کسی حد تک اطمینان کا اظہار کیا بولا: "میں صبر و شکر سے جان دینے کی کوشش کروں گا۔"

شہزادی نے واپس جاتے ہوئے کہا: "میں کوشش کروں گی کہ تم بچ جاؤ لیکن قبل از وقت اس کا وعدہ نہیں کر سکتی۔"

شہزادی نے جاتے جاتے پہرے دار سے کہا: "تم اس کا اس وقت تک خیال رکھو گے جب تک سلطان کوئی قطعی فیصلہ نہ صادر فرما دیں۔"

پہرے دار کیا بولتا، اسے تو اس ملاقات ہی کے بدلے کافی انعام مل چکا تھا۔

٭ ٭ ٭

سلطان گھنٹوں قسطنطنیہ کی فصیلوں کا نقشہ سامنے بچھائے اس کے کمزور حصوں کی جستجو میں لگا رہا۔ اس کی نیند حرام ہو گئی تھی اور کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔

سلطان جنگ کے ہر پہلو پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ ان ممکنہ سازشوں سے بھی چوکنا تھا جو اس سوقع پر عمل میں لائی جا سکتی تھیں۔ سلطان کو اس واقعے کی بھی اطلاع مل گئی کہ شہزادی سر دیا اپنے ہم قوم اینجل کو رہائی دینے میں کوشاں ہے۔ شہزادی نے اینجل سے کیا باتیں کیں اور اینجل نے کیا کچھ کہا تھا۔ اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا لیکن اس میں اسے کوئی ایسی بات نہیں ملی جس کو بنیاد بنا کر وہ ان دونوں کے خلاف کوئی کارروائی کرتا۔

انہی حالات میں اس کے مخبروں نے یہ خبر بھی گوش گزار کی کہ اس کے وزیر خلیل پاشا سے دشمنوں کے گہرے تعلقات رہ چکے ہیں اس لئے اس نازک وقت پر اس سے ہوشیار اور محتاط رہا جائے۔ سلطان نے خلیل پاشا کے روز مرہ کی کڑی نگرانی کی اور اس ان میں کوئی بات بھی مشتبہ نظر نہیں آئی ادھر خلیل پاشا بھی غافل نہیں تھا، ہر وقت سلطان کی طرف سے چوکنا رہتا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی، اول نصف شب کے پہرے دار آرام کرنے جا رہے تھے اور ان کی جگہ بقیہ نصف شب کے پہرے دار لے رہے تھے سلطان ابھی اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں اس وقت بھی روشنی ہو رہی تھی۔ سلطان نے خلاف توقع تالی بجائی۔ تالی کی آواز پر ایک پہرے دار حاضر ہو گیا۔ سلطان کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اس نے تھکی تھکی نظروں سے پہرے دار کی طرف دیکھا تو وہ کانپ گیا۔ سلطان نے کرخت لہجے میں حکم دیا "خلیل پاشا کو حاضر کیا جائے"۔

پہرے دار پریشان ہو کر خواب گاہ سے نکلا اور خلیل پاشا کے گھر پہنچ گیا۔ وہ بھی اس وقت سونے کی تیاری کر رہا تھا، سلطان کے فرمان طلبی نے خلیل پاشا کے ہوش و حواس اڑا دیئے۔ اس نے پہرے دار سے پوچھا "پہرے دار دوست! خدا تمہاری عمر دراز کرے ذرا یہ تو بتاؤ اس وقت سلطان کی مزاجی حالت کیسی ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا "حضور والا! ان کے لہجے میں کچھ درشتی پائی جاتی تھی"

خلیل پاشا کا دل دھڑکنے لگا۔ پوچھا "سلطان کے پاس اندر کون کون ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا "سلطان اپنی خواب گاہ میں تنہا ہیں"۔

خلیل پاشا جو بات جاننا چاہتا تھا وہ ابھی تک نہیں جان سکا تھا۔ پوچھا "سلطان کے پاس آخر شام سے کون کون آیا اور سلطان کے پاس کتنی کتنی دیر تک ٹھہرا رہا؟"

"جناب والا!" پہرے دار نے تنگ آ کر جواب دیا "میرا پہرہ نصف شب کے شروع ہوتا ہے اور میں ابھی ابھی پہرے پر آیا ہوں آپ کے سوال کا جواب کیسے دے سکتا ہے"

خلیل پاشا اس وہم میں تھا کہ پہرے دار جانتا سب کچھ ہے لیکن شاید بتانا نہیں چاہتا۔ اس نے کہا "تم یہیں ٹھہرو، میں اپنے بیوی بچوں سے مل کر ابھی آتا ہوں"

خلیل پاشا اندر گیا تو اس کی بیوی نے کہا "آج مجھے سلطان کی مرحوم والدہ نے بلایا تھا۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کے ایک اہم قوم اور ہم وطن کو مزید پھنسا دیا جائے۔

عتاب سے بچا لیا جائے۔"

خلیل پاشا نے افسوس سے جواب دیا "خانم! سلطان نے مجھے بے موقع طلب کیا اور میں نہیں جانتا کہ میں وہاں سے زندہ واپس آسکوں گا یا نہیں، یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ میں کسی مسیحی کی سلطان کے روبرو سفارش کروں۔"

بیوی ڈر گئی۔ بولی "اگر ایسا ہے تو میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔"

خلیل پاشا نے جواب دیا "تو گویا تم یہ چاہتی ہو کہ میں حکم عدولی کر کے سلطان کے عائد کردہ جرم کو تسلیم کر لوں۔ اس وقت میرا غلط ایک قدم بھی اگر اٹھا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں تباہ و برباد کر دیا جاؤں گا۔" پھر خلیل پاشا نے اپنی بیوی سے کہا "کیا سارے بچے سو گئے ہیں؟"

"ہاں سبھی سو گئے۔"

خلیل پاشا اٹھ کر بچوں کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ اور باری باری ہر ایک کے سرہانے پہنچا اور سامنے کھڑے رہ کر کچھ دیر تک نہایت محبت اور شفقت سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد نہایت آہستہ سے کہا "میرے بچو! خدا حافظ۔ تم سو رہے ہو شاید کل صبح جب تمہاری آنکھ کھلے گی تو تم خود کو یتیم دیکھو گے، کیونکہ سلطان کی بے وقت طلبی کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ مطلب یہ ہے کہ سلطان کو تمہارے باپ کے دشمنوں نے ضرور ورغلایا ہے اور سلطان اس وقت مجھ سے کچھ ایسے سوالات کرے گا جن کے جواب پر ہی میں قتل کر دیا جاؤں گا اور تم سب ایک ہی دن میں یتیم ہو جاؤ گے۔"

خلیل پاشا کی ان باتوں کا جواب کون دیتا کیونکہ بچے تو سو رہے تھے۔

خلیل پاشا نے باری باری جھک کر ان کی پیشانیوں کو بوسہ دیا اور خواب گاہ سے نکلنے لگا تو دیکھا اس کے پیچھے ہی اس کی بیوی بھی موجود ہے۔ خلیل پاشا نے پوچھا "تم یہاں کیا لینے آگئی تھیں؟"

بیوی نے تشویشناک آواز میں پوچھا "تم ان سوتے ہوئے بچوں سے ابھی کیا کہہ رہے تھے؟"

خلیل پاشا نے جواب دیا "میں نے جو کچھ کہا تم نے سن لیا ہے پھر فضول سوالوں کا مطلب؟"

بیوی نے کہا "وہی تو میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم سلطان کے پاس جا رہے ہو یا کسی جلاد کے پاس؟"

خلیل پاشا نے بیوی کو جھڑک دیا "دیواریں بھی کان رکھتی ہیں تم ایسی باتیں مت کرو۔"

بیوی رو رہا نسی ہو رہی تھی، بولی "میں اپنی یا بچوں کی موت سے نہیں ڈرتی سمجھ کہ جب تم ہی نہ رہو گے تو میرا یا ان بچوں کا زندہ رہنا بھی فضول ہے، اگر تمہیں یقین ہے کہ تم زندہ نہیں لوٹو گے تو یہ رہا خنجر، اس سے تم ہم سب کا کام تمام کر دو، اور پھر نہایت اطمینان سے سلطان کے روبرو حاضر ہو جاؤ۔"

خلیل پاشا نے بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پوچھا "گھر میں کتنی اشرفیاں موجود ہوں گی؟"

بیوی نے حیرت سے سوال کیا "اشرفیاں کا کیا کرو گے؟"

خلیل پاشا نے کہا "انہیں ایک تھیلی میں لے آؤ، انہیں نذرانے کے طور پر سلطان کی خدمت میں پیش کرنا ہے اس طرح ممکن ہے سلطان ہمیں معاف کر دے۔"

* * *

بیوی نے سسکیاں بھرنا شروع کر دیں اور اپنا سر خلیل پاشا کے کاندھے پر رکھ دیا۔ کچھ دیر میں آنسوؤں نے خلیل پاشا کے شانے کو تر کر دیا۔

خلیل پاشا نے اشرفیوں والی تھیلی ایک خادم کے سر پر رکھی اور شاہی پہرے کے ساتھ سلطانی خواب گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلطان خواب گاہ کے دروازے تک خلیل پاشا کی پیشوائی کو پہنچا۔ خلیل پاشا نے نہایت ادب کے ساتھ مراسم شاہانہ ادا کئے اور خادم کے سر سے اشرفیوں کی تھیلی لے کر سلطان کی خدمت میں پیش کر دی۔

سلطان نے اشرفیوں کو خشمگیں نظروں سے دیکھا اور سوال کیا "اشرفیاں لانے کا مطلب؟ کیا میں نے تم سے اشرفیاں طلب کی تھیں؟" پھر اپنے پہرے دار کی طرف دیکھ کر "تم نے خلیل پاشا کو کیا پیغام دیا تھا؟"

پہرے دار نے عرض کیا۔ "ناچیز نے عرض کیا تھا کہ حضور والا نے وزیر اعظم کو اسی وقت طلب فرمایا ہے۔"

سلطان نے خلیل پاشا سے کہا۔ "کیا اس پہرے دار نے یہی کہا تھا؟"

خلیل پاشا سلطان کے اضطراب اور بے چینی کو دیکھ کر اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے عرض کیا۔ "ناچیز نے اگر اشرفیاں لانے میں کسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے تو یہ اپنی نادانستہ غلطی پر معافی کا خواستگار ہے۔"

سلطان نے درشت لہجے میں کہا۔ "خلیل پاشا! میں نے تمہیں جو کچھ دے دیا اسے واپس لینے کی میں کوئی خواہش نہیں رکھتا میں تاجر نہیں، ایک سلطان ہوں۔" پھر کچھ دیر رک کر کہا۔ "میں ایک نہایت قیمتی تحفہ لینا چاہتا ہوں۔"

خلیل پاشا نے عرض کیا۔ "حضور ارشاد تو فرمائیں، یہ ناچیز اپنی جان تک نذر کرنے کو تیار ہے۔"

سلطان نے قسطنطنیہ کے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں قسطنطنیہ چاہتا ہوں، یہ قسطنطنیہ۔"

خلیل پاشا نے ادب سے عرض کیا۔ "پوری رومی سلطنت حضور والا کے زیر نگیں آ چکی ہے بس یہی ایک شہر باقی رہ گیا ہے، سو یہ بھی آج ہی کل میں سلطان کے قبضے میں آجائے گا۔"

سلطان نے کہا۔ "خلیل پاشا! ادھر آؤ میرے ساتھ۔"

خلیل پاشا سلطان کے ساتھ اس کے بستر تک چلا گیا سلطان نے اپنے تکیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "خلیل! تم میرے اس تکیے کو غور سے دیکھو، اس پر تمہیں کہیں بھی کوئی شکن یا داغ نہیں ملے گا، یہ اس لئے کہ میں نے ابھی تک اس پر اپنا سر رکھا ہی نہیں۔ ہاں میں کبھی تکیے کو اٹھا کر ادھر رکھ دیتا ہوں اور کبھی ادھر رکھ دیتا ہوں، کبھی ادھر بیٹھ گیا کبھی ادھر ٹہلنے لگا۔ میری نیند اڑ چکی ہے۔" پھر معلوم نہیں کیوں، اس نے خلیل پاشا کو نصیحت کی۔ "خلیل پاشا! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ رومیوں کی سیم و زر کی ترغیب سے بچو، جنگی قوت میں ہم ان پر فائق ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رسول مقبولؐ کی برکات سے ہم بہت جلد قسطنطنیہ کے مالک بن جائیں گے۔"

خلیل پاشا نے صدائے آمین بلند کی۔

سلطان نے مزید کہا۔ "میں اکثر بھیس بدل کر بازاروں اور اپنے نوجیوں میں نکل

جاتا ہوں اور ان کی ہمت اور حوصلے کا اندازہ لگایا کرتا ہوں، میں ان کی باتیں سن کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے آدمیوں کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ بالکل میری ہی طرح۔ اتنے یکساں حوصلوں کو شکست نہیں دی جا سکتی، اور خلیل پاشا! ہم یہ جنگ دفاعی نہیں جارحانہ لڑ رہے ہیں سارجانہ جنگیں کمزور ہارتی ہیں۔"

"حضور والا بجا فرماتے ہیں!"

سلطان نے کہا "تم یہ بھی جانتے ہو کہ آج جو مسیحی فوجیں ہم سے برسرِ پیکار ہیں، کل تک ان میں کئی ہماری دوست رہ چکی ہیں۔"

"حضور والا کا ایک ایک لفظ سچائی سے لبریز ہے۔"

لیکن اب یہ ہمارے دوست نہیں رہے، میدانِ جنگ میں ہم دوستی کی غرض سے مصافحہ کرنے نہیں آتے ہیں، بلکہ اب ہماری ہتھیلیوں کے بجائے تلواریں ٹکرائیں گی۔"

خلیل پاشا نے سر نیاز جھکا دیا۔ بولا "حضور والا کا یہ نکتہ بھی ناچیز کے دل و دماغ میں خوب اچھی طرح جاگزیں ہے۔"

سلطان نے کہا "تب پھر تم جاؤ اور اپنے فکر و تدبر کی جملہ قوتیں اس امر میں لگا دو کہ قسطنطنیہ کی تسخیر میں کن کن تدابیر کو روبہ عمل لایا جا سکتا ہے اور ہم اپنے دشمنوں کو کم سے کم وقت اور زیادہ سے زیادہ جوش و خروش سے کس طرح شکست دے سکتے ہیں؟"

خلیل پاشا اُلٹے قدموں سلطان کی خواب گاہ سے باہر نکلا اور اپنے ذہنی بیڑوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح جب ترکی فوج قسطنطنیہ کی فصیلوں کی طرف بڑھی تو اس کے پاس مکرلون کے ہزاروں برج خود تھے ان برجوں کے نیچے پہیے لگے تھے اور یہ کئی کئی منزلہ تھے ان کی بلندی فصیل کے مطابق تھی اور ہر برج میں سیڑھیاں بھی موجود تھیں۔ ان برجوں کی ہر منزل میں تیر انداز اور شمشیر زن بیٹھے ہوتے تھے۔ ان برجوں کو دھکیلتے ہوئے فصیل کے قریب پہنچا دیا گیا اور برجوں میں بیٹھے ہوئے ترک فوجیوں نے دشمنوں کی بے پناہ تیر اندازی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی سیڑھیوں کو قسطنطنیہ کی فصیل پر رکھ دیا، عیسائیوں نے ان سیڑھیوں میں آگ لگا دی اور برجوں پر روغن نفت اور رال کے مشعلہ زن تیر برسانے لگے، برجوں میں آگ لگ گئی اور ترک سپاہ کو اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا۔ سلطان نے اپنی میدانی فوج کو حکم دیا کہ فصیل پر جو سر بھی دکھائی دے اسے تیر سے چھید دیا جائے لیکن برجوں میں لگی ہوئی آگ کے شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں نے ترکوں اور عیسائیوں کے درمیان حائل ہو کر

سلطان کے فرمان کو بے اثر بنا دیا۔ فصیلوں اور ترکوں کے درمیان چھ ڈری اور گہری خندقیں حائل تھیں اور انہیں عبور کر کے فصیل کے نیچے پہنچ جانا تقریباً ناممکن تھا خندقوں کو پاٹ کر دوسری طرف پہنچنے کی کوشش میں ہزاروں ترکوں کی جانیں ضائع گئیں۔

حصن بدمیلیا کے برجوں سے سلطان کی توپیں گولہ باری کرنے میں مصروف تھیں اور ان سے فصیلوں میں جگہ جگہ شگاف بھی پڑ رہے تھے لیکن دن بھر کی گولہ باری کے نتیجوں کو رات کی تاریکی میں عیسائی پھر سے بھر دیتے تھے۔ عیسائی ترکوں کی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر ہنستے مسکراتے تھے۔ انہیں اپنے دوستوں اور حلیفوں سے اتنی امداد مل چکی تھی کہ اگر سلطان سال بھر اپنا محاصرہ جاری رکھتا تو انہیں کوئی پریشانی نہ ہوتی۔

سلطان نے ایک بار پھر نقشہ جنگ کر اپنے سامنے بچھایا اور فیصلہ کن تدابیر پر غور کرنے لگا۔

* * *

خشکی کی طرف سے حملوں کی ساری کوشش ناکام ہو گئیں سلطان نے اپنے بحری بیڑے کو شاخ زریں میں داخل کرنے کی کوشش کی لیکن عیسائیوں نے اسے بھی ناکام بنا دیا سلطان اس مہم پر بہت زیادہ وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا تھا، اس نے انتہائی غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی طرح اس کا بحری بیڑا خلیج زریں میں داخل ہو کر شمال کی طرف سے قسطنطنیہ پر دباؤ ڈالے تو یہ مہم بہت جلدی سر کی جا سکتی ہے کیونکہ اس طرح مدافعین کی قوت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی اور یہ صورت حال ان کے لئے ناقابل برداشت ہو سکتی تھی۔

سلطان خاموشی سے ایک بحری جہاز میں بیٹھ کر باسفورس کے اس حصے میں پہنچ گیا جو آگے جا کر بحر اسود میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ یہاں اس کے سامنے اونچی نیچی پہاڑیوں جیسا خشکی کا ایک ایسا حصہ موجود تھا جس کے ذریعے وہ دوسری طرف پہنچ کر شاخ زریں میں داخل ہو سکتا تھا اور یہ خشکی کا ایسا حصہ تھا جس پر مدافعین نے اس لئے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی کہ اگر یہاں ترک پہنچ بھی جاتے تو خشکی کے قوی بعد شاخ زریں وہی کمزوریاں تھیں جو فصیل کے نیچے خندقیں انجام دے رہی تھیں اور خندقوں کا پاٹ دینا تو پھر بھی آسان تھا لیکن شاخ زریں کو پاٹنا ناممکن تھا۔

سلطان اپنے معتبر آدمیوں کے ساتھ خشکی پر اتر گیا اور دیر تک ادھر ادھر گھوم

پھر کر راستے کی ناہمواری اور نشیب و فراز کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ پہاڑیوں سے اس پار شاخ زریں میں داخل ہونے کے لئے اس کے بحری جہازوں کو دس میل کا فاصلہ طے کرنا تھا لیکن سوال تو یہ تھا کہ اس سے بحری جہاز خشکی کا یہ دس میل کا سفر کس طرح کر سکتے تھے۔ اس نے خشکی پر کھڑے جنگلات کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا اور بستی میں موجود ہزاروں مویشیوں پر بھی نظریں ڈالیں۔ بستی کے لوگوں نے سلطان کو پہچان لیا تھا، وہ نیازمندانہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور درخواست کی کہ اس جنگ میں انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

سلطان نے جواب دیا۔ "یہ اسی وقت ممکن ہے کہ تم لوگ بھی ہمارے کاموں میں دخل اندازی نہ کرو اور ہمیں اخلاقی اور مادی مدد دو۔"

بستی والوں نے پوچھا۔ "ہم سلطان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔؟"

سلطان نے جواب دیا۔ "اخلاقی مدد تو یہ ہے کہ تم لوگ اس جنگ میں بے تعلق رہو اور مادی مدد یہ ہے کہ ہمیں تم سے لکڑیاں کاٹنے کے آلات اور مویشیوں کی ایک بہت بڑی تعداد درکار ہوگی۔ ہم تمہیں ان کی قیمت ادا کریں گے اور ہمارا فرض یہ ہوگا کہ ہمارا حکم ملتے ہی اپنے مویشی ہمارے حوالے کر دو۔"

بستی والوں نے سلطان سے وعدہ کر لیا کہ وہ سلطان کی ہر خواہش کا احترام کریں گے اور مذکورہ حکم پر بروقت عمل کیا جائے گا۔ اس کے بعد سلطان جنگلات کے درختوں کو شمار کرتا رہا اور ادھر سے مطمئن ہو کر وہ اپنے بحری جہاز میں چلا گیا، اس نے بحیرۂ نادمودہ میں مقیم اپنی جہازوں کے ملاحوں کو حکم دیا کہ "حکم ملتے ہی انہیں ایک پہاڑ سمت میں روانہ ہو جانا ہے۔"

ان جہازوں پر فوجیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو چڑھا دیا گیا۔

یہاں سے وہ اپنے قصر گیا اور وہاں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے اس طرح ملا، گویا اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں مرد یا کی شہزادی سے بھی ملاقات کی اور اسے اس بات پر سرزنش کی کہ اسے ایک ایسے شخص سے چوری چھپے نہیں ملنا چاہیئے جو شاہی معتوب ہے اور جس کے خلاف ایک خطرناک جرم ثابت ہو چکا ہے۔

شہزادی نے ذرا ہلیری سے اینجل کی وکالت کی، بولی۔ "میں سلطان سے درخواست کروں گی کہ وہ اینجل کو قبل از وقت مجرم نہ قرار دیں، کیونکہ اینجل مرد رد کو اپنی بے گناہی کا یقین دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ رقابت اور حسد میں کیا گیا ہے۔"

سلطان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، بولا "آنسوؤں کا سیلاب کسی کو بے گناہ تو نہیں ثابت کر سکتا۔ حضرت یعقوبؑ کے جن مکار بیٹوں نے اپنے بھائی یوسفؑ کو کنوئیں میں گرایا تھا۔ ان سب نے رو رو کر ہی اپنے باپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا اور پھر تاریخ عالم میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن میں مکر کے آنسوؤں کے سہارے بھیانک ترین کھیل کھیلے گئے ہیں"

شہزادی لاجواب ہو گئی، آبدیدہ ہو کر بولی "پھر بھی سزائے موت سے پہلے اگر سختی سے تحقیقات کر لی جاتے تو میرے خیال میں یہ ایک دانشمندانہ ہی نہیں عادلانہ اور فراخ دلانہ اقدام ہوگا"

سلطان نے کہا "میں نے ابھی تک اس کے قتل کا فرمان نہیں صادر کیا، اس کی وجہ یہی ہے کہ میں جب تک قسطنطنیہ کی مہم سے فارغ نہیں ہو جاتا، ایجل کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی، قسطنطنیہ اب چند دنوں کا مہمان ہے۔ اس چند روزہ مہمان کے ساتھ ہی ایجل بھی ہمارا چند روزہ مہمان ہے۔ قسطنطنیہ تو ایک مسئلہ ہے ایک مہم ہے لیکن ایجل نہ تو کوئی مسئلہ ہے اور نہ کوئی مہم، اس لئے اس پر قبل از وقت غور کرنے میں اپنا قیمتی وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا"

شہزادی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "فصیلوں کی طرف سے قسطنطنیہ کی تسخیر ناممکن ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے کیا سلطان عالی مقام یہ بہتر نہ پسند فرمائیں گے کہ اس ناقابل تسخیر شہر کی تسخیر سے لئے اب کسی نئی تدبیر پر عمل کیا جائے گا؟"

سلطان نے ترشی سے جواب دیا "یہ سب کچھ سوچنا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے اور آئندہ تم مجھ سے اس نوع کا کوئی سوال کرنے کی جرأت بھی نہ کرنا"

یہاں سے نکل کر سلطان خلیل پاشا کے پاس پہنچ گیا، اس وقت سلطان کے چہرے پر پہلی جیسی تشویش اور فکرمندی نہیں تھی، چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت چھائی ہوئی تھی۔

خلیل پاشا نے ادب سے عرض کیا "اسی ناچیز کے لئے حضور والا کا کوئی نیا حکم ہے؟"

سلطان نے جواب دیا "خلیل پاشا! میں بہت جلد ایک نامعلوم مہم پر روانہ ہو جاؤں گا تم اور میرے دوسرے فوجی ان فصیلوں پر بدستور دباؤ ڈالتے رہیں گے خبردار جو اس میں تساہل یا کوتاہی سے کام لیا گیا"

خلیل پاشا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "حضور والا کس مہم پر روانہ ہونے والے ہیں کیا کچھ ارشاد فرمانا گوارا کریں گے؟"

سلطان کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا، اُس نے پُرجوش لہجے میں کہا "خلیل پاشا! اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرے کسی آئندہ منصوبے سے میری داڑھی کا کوئی بال واقف ہو گیا ہے تو بخدا میں اسے نوچ کر پھینک دوں گا"

خلیل پاشا ڈر کر خاموش ہو گیا۔

سلطان اسی دن اسّی جہازوں میں فوج بٹھا کر باسفورس سے بحرِ اسود کی طرف روانہ ہو گیا۔

* * *

سلطان باسفورس سے خشکی کے اس حصّے میں اُتر گیا جس کا وہ کچھ دن پہلے جائزہ لے گیا تھا، اس نے جنوب کی پہاڑیوں سے اُتر کر شاخ زریں کے مقابل توپیں نصب کرا کے فوجی دستہ بٹھا دیا اور اسے حکم دیا کہ شاخ زریں کے دہانے سے جیسے ہی کوئی مسیحی بحری جہاز حرکت کرے اور مغرب کی طرف بڑھے اسے نہایت سفاکی اور بے دردی سے تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس طرح اس نے جگہ جگہ پہاڑیوں کی بلندیوں پر بستی والوں کے لئے توپیں نصب کرا دیں اور اس پر متعینہ فوجوں کو حکم دیا گیا کہ بستی والے جیسے ہی کسی شرارت پر آمادہ ہوں انہیں فوراً تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس کے بعد سلطان کے بے شمار آدمی جنگلوں میں گھس گئے اور درختوں کا صفایا کرنے لگے، آدمیوں کی ایک بہت بڑی تعداد راستوں کو ہموار کرنے میں لگی ہوئی تھی اور ساحل سے اوپر تک کی ناہمواریوں کو پاٹ پاٹ کر سطح کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ جب ان کی سطح برابر ہو گئی اور ساحل سے اوپر تک ایک وسیع و عریض پھسلوان تیار ہو گئی تو سلطان کے حکم سے اس پھسلوان شاہراہ پر ادھر تک لکڑیوں کے رولے بچھا دیئے گئے۔ یہی کام پہاڑی کے اس پار بھی کیا گیا اور شاخ زریں تک دو میل کا فاصلہ ایک کشادہ ہموار شاہراہ سے ملا دیا گیا اور اس شاہراہ پر بھی لکڑی کے رولے بچھا دیئے گئے۔ بستی کے لوگ اور دُور شاخ زریں کے دوسرے کنارے سے مسیحی یہ عجیب و غریب عمل دیکھ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ سکا تھا کہ یہ سب کچھ سلطان کیوں کر رہا ہے؟

جب دس میل کی شاہراہ ہموار کر دی گئی اور ان پر لکڑی کے رولے بچھائے جا چکے تو سلطان نے ہزاروں جانوروں کی چربیاں پگھلا کر ان رولوں کو تر کر دیا پھر حکم دیا کہ اسّی جہازوں کو آگے پیچھے ان رولوں پر چڑھا دیا جائے۔ اس دن انسانی طاقت نے اتنا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا کہ آج تک عقلِ بحر تماشائے لبِ بام نظر آتی ہے۔ ان

جہازوں کو انسانی دیوزادوں کی مدد سے پہاڑی پر چڑھا کر دوسری طرف اتار دیا گیا۔ اس دن ہوا بھی موافق تھی۔ جہازوں کے بادبان کھول دیئے گئے، انسانی طاقت اور ہوا کے دباؤ نے جہاز کو چشموں کی چکنائی زدہ لہروں پر دوڑانا شروع کر دیا اور دس میل کا فاصلہ طے کر کے یہ جہاز شاخ زریں کے ساحل پر پہنچ گئے۔ اس دن جب یہ کارنامہ انجام دیا جا رہا تھا جہازوں کو دھکیل کر آگے بڑھانے والے جنوں کا دل نے جوش و خروش میں طرح طرح کے نعرے بھی لگاتے اور حوصلہ بڑھانے والے گیت بھی گاتے۔ شاخ زریں کے مشرقی دہانے پر موجود مسیحی بیڑہ یہ مناظر دیکھتا رہا اور مسلمانوں کا شور و غل سنتا رہا لیکن فوراً ہی یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کوشش کا مقصد کیا ہے، لیکن جب سلطان کے جہاز شاخ زریں کے ساحل پر پہنچ کر پانی میں اتارے جانے لگے تب ان کی سمجھ میں سلطان کا اصل منصوبہ آیا، انہوں نے ساحل سے حرکت کی اور سلطانی جہازوں سے برسرِ پیکار ہونے کا ارادہ کیا لیکن ساحل پر موجود سلطانی توپ خانہ ان کے عزائم خاک میں ملا دیتے۔

شاخ زریں کے سامنے والی فصیل پر موجود عیسائیوں نے جب یہ دیکھا کہ اب سلطانی بیڑہ شمالی سمت سے بھی حملہ آور ہونے والا ہے تو ان کی ہمتیں جواب دے گئیں۔ ۲۷ مئی ۱۴۵۳ء کی بات ہے، سلطان نے اپنے عساکر میں اعلان کرا دیا کہ ۲۹ مئی کی صبح سے فیصلہ کن حملہ کر دیا جائے گا۔

۲۸ مئی کی صبح، قسطنطنیہ کے ایک دروازے سے چند آدمی نمودار ہوئے ان کے گھوڑوں کا رخ ترک لشکر کی طرف تھا اور جو شخص سب سے آگے تھا اس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ سلطان سمجھ گیا کہ یہ صلح کا وفد ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا "آنے والوں کو گزند نہ پہنچایا جائے"۔

دھوپ کی کمزور شعاعوں میں ان کے سفید لباس بہت اچھے لگ رہے تھے اور ان کی داڑھیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ ان لوگوں نے ترکوں کے لشکر کے قریب پہنچ کر پکار کر کہا۔ "ہم ترکوں کے سلطان کے پاس امن و صلح کا پیغام لے کر حاضر ہوتے ہیں"۔ سلطان نے اپنے گھوڑے کو ذرا آگے بڑھایا، اس کے ساتھ ہی محافظ دستے نے بھی حرکت کی، سلطان نے ان کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکنا چاہا تو اس کا سرکش گھوڑا اچھل گیا، سلطان نے اسی حالت میں بلند آواز میں پوچھا "کیسی صلح؟ کیسا امن؟ اب اس کا وقت گزر چکا"۔

عیسائیوں کے وفد کا تاثر گویا ہوا "قسطنطین اس امن و صلح کے عوض سلطان

کا منہ مانگا خراج ادا کرنے کو تیار ہے۔ اس کی درخواست ہے کہ سلطان ایک بار قسطنطنیہ معاف کر دے وہ اس معافی کے بدلے سلطان کی ماتحتی اور باجگذاری قبول کرنے پر ہے"

سلطان نے پھر وہی الفاظ دُہراتے "میں قسطنطنیہ کو فتح کئے بغیر ہرگز واپس جاؤں گا، ہاں تمہارا قسطنطین اگر پسند کرے تو اسے جان کی امان دی جا سکتی ہے اور وہ یونان پر بدستور حکمران رکھا جا سکتا ہے"

دوفر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

توپوں نے گولا باری شروع کر دی، اب قسطنطنیہ کی فصیلوں پر شمال اور دونوں ہی طرف سے گولا باری ہو رہی تھی۔

دوفر کے جواب نے قسطنطین کو بالکل مایوس کر دیا۔ اس نے امراء، عمائدین اور اپنے اعزا سے بیت الصوفیہ میں جمع ہو جانے کی خواہش کی۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا عالم یاس میں اس مقدس مقام کے لئے روانہ ہو گیا۔ جو ان کے خیال میں ان کی آخری پناہ تھی۔ قسطنطنیہ کا آخری مسیحی فرماں روا اپنے گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا بیت الصوفیہ کے دروازے پر پہنچا اور احتراماً گھوڑے سے اتر پڑا، اس کے ہمرکاب خدمت گاروں نے کچھ پیچھے اُتر کر بادشاہ کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ قسطنطین بادشاہانہ انداز میں بیت الصوفیہ کے دالان میں پہنچ گیا، اس نے تاج رخِ شاہی اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔

اندرون کی روشنی میں بھی شمعیں روشن کر دی گئی تھیں اور ان کی لو کانپ رہی تھی۔ وہ منقش اور منبت پردوں کے پاس سے گزرتا ہوا مقدس میز تک پہنچ گیا، جا نے کسی قدر سستی سے قسطنطین کا احترام کیا۔ اسقف اعظم نے اسے اپنے برابر بیٹھنے جگہ دے دی۔ مقدس میز پر زرتار کپڑا بچھا تھا اور اس پر کڑھی ہوئی سنہری تصویریں رہی تھیں۔ قربان گاہ کے اوپر حضرت مریمؑ کی تصویر تھی ان کے جسم پر گہرے نیلے رنگ تھا۔ حضرت مریمؑ کے اوپر ایک دھندلے چہرے کے مدھم سے نقوش ابھر رہے یہ حضرت مسیح کی شبیہہ تھی۔ ان کے اوپر فرشتوں کی تصویریں تھیں جو اپنے بازوؤں کو ہوتے تھے۔

پورے مجمع کی مجموعی کیفیت سے ایسا لگتا تھا گویا یہ سارے آدمی کسی کی مرگ میں بجا ہو گئے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے حسرت و غم اور مایوسی جھلک رہی تھی چہروں پر ایک ایسی اداسی طاری تھی، جسے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو

ھ رہے تھے گریا وہ اُن کے دکھ کو ہلکا کرنے کے لئے تسلی آمیز کلمات ادا کرے گا لیکن دکھ اور ایک ہی غم کا ہر کوئی شکار تھا۔

اباصوفیہ میں دیر تک آہ و بکا کے درمیان دشمنوں کی پسپائی اور ناکامی کی دعائیں ی رہیں۔ اسی دن تمام کو یونانی امرا اور اتحادیوں کے بہترین بہادروں کو شاہی محل ر کیا گیا۔ یہ ان کی آخری مجلس مشاورت تھی۔ قسطنطین نے اپنی پرجوش تقریر سے افسردہ دلوں میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن اسی کے سامعین خود اس کے چہرے ی ہی جیسی مایوسی اور ہراس دیکھ رہے تھے۔ تقریر کے بعد وہ سب آپس میں گے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو اور ہونٹوں سے آہیں نکل رہی تھیں۔ اس کے بعد نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "میں ان سب سے معافی اور معذرت چاہتا ہوں جنہیں لسنہ یا نادانستگی میں کسی قسم کی اذیت پہنچائی ہو۔" محل سے نکل کر وہ گھوڑے ا اور فصیلوں کی نگرانی کے لئے چلا گیا۔

۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کی صبح سلطان کے حکم کے مطابق دونوں طرف سے حملے کا یا گیا۔ توپیں گرجنے لگیں اور فصیلوں میں شگاف پڑنے لگے۔ سلطان عصائے نیزیوں کی ہمتیں بڑھا رہا تھا۔ مسلمان دیوار دار فصیلوں سے بھی برچھی خنجروں نے کی کوشش میں دفن ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن وہ ہمت ہارنے کا نام نہ لیتے دوران سلطان کی توپوں نے فصیلوں کو جگہ جگہ سے منہدم کرنا شروع کر دیا۔ فصیل الاطلیہ خندقوں میں گرا جس سے خندق خود بخود بھرتی چلی گئی۔ مسلمان ان حصوں کے نیچے پہنچ گئے عیسائی ان منہدم شدہ حصوں میں دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے یر معمولی مدافعتی قوت سے مسلمانوں کے سیلاب کو روک دیا۔ اس کشمکش میں حسن ری اپنے تیس ساتھیوں کے ہمراہ فصیل پر چڑھنے لگا۔ عیسائیوں نے پتھراؤ کر کے اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا لیکن خود حسن اپنے بارہ ساتھیوں کو لے کر فصیل پر چڑھ ا وہ فصیل پر اچھی طرح کھڑا بھی نہ ہوا تھا کہ عیسائیوں نے اسے فصیل سے نیچے وہ نیچے گر کے ایک بار پھر اٹھا، اور گھٹنوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسی لے اوپر سے پتھروں اور بانیٹروں کی بارش کر دی گئی اور حسن یونی چری اس میں ہمیشہ) ہو گیا۔

سلطان، حسن یونی چری کی ہمت و شجاعت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ے شاہی کو بلند کرتے ہوئے اعلان کیا "آج کے محاربے کا ہیرو حسن یونی چری کی

ہے اور یہ اگر زندہ رہتا تو ہمارے انعام کا مستحق ٹھہرتا۔" سلطان نے اپنے ایک خدم
کو حکم دیا "تم اسی وقت ہمارے پیر و مرشد کے پاس جاؤ اور ان سے کہو، خدا کی بارگاہ
سجدہ ریز ہو کر فتح کی دعا کریں۔"

میدان کارزار سے دور، ترک کے سپاہیوں کے عقب میں، جہاں ان کے خیموں کی
قطاریں دور تک پھیلی چلی گئی تھیں، یہیں شاہی خیمے کے قریب سلطان کے پیر و
کا خیمہ تھا، سلطانی خدمت گار مہیب خیمے کے دروازے پر پہنچا تو پیر مرشد کے ایک
عامل نے سختی سے کہا۔ "تم اندر نہیں جا سکتے، کیونکہ پیر مرشد کا حکم ہے کہ اس وقت کسی
بھی اندر نہ جانے دیا جائے۔"

شاہی خدمت گار نے اکڑ کر جواب دیا۔ "میں سلطان کے حکم سے پیر مرشد کے
آیا ہوں تم مجھے اندر جانے سے نہیں روک سکتے۔" اس نے خیمے کے پہرے دار کو دھکا دے
خیمے کے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں پیر مرشد سجدے میں پڑے گریہ و زاری میں مشغول
شاہی خدمت گار نے ادب سے عرض کیا۔ "پیر مرشد! سلطان کا پیغام۔"

پیر مرشد نے سجدے سے سر اٹھایا تو اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر نظر آئی۔
"سلطان کا پیغام؟ عرض کرو۔"

خدمت گار نے عرض کیا۔ "شہر کی تسخیر کی دعا۔"

پیر مرشد نے جواب دیا۔ "قسطنطنیہ کا بادشاہ ہلاک ہوا، شہر فتح ہو گیا تم
کے پاس واپس جاؤ۔"

خدمت گار یہ بشارت لے کر فوراً خیمے سے باہر نکلا اور سلطان کی طرف چل

* * *

مسلمان تو فتح کی خوشی میں فصیلوں کی راہ سے شہر میں داخل ہو گئے۔ فصیل کے عیسا
نے نیچے اتر کر انہیں روکنے کی کوشش کی تو مسلمان فصیلوں پر چڑھ کر شہر میں اتر گئے
عیسائیوں کی دفاعی قوت جواب دیتی جا رہی تھی۔ عام عیسائیوں میں قسطنطین بھی گھ
اور بے جگری سے حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو روک دینے کی کوشش کی اسی طرف سے
سنتا ہوا تیر ٹھیک بادشاہ کے سینے کی طرف آیا اور بائیں طرف، پسلی کی دیوار کو چیر
دل میں اتر گیا، بادشاہ تیورا کر گر گیا، شدت کرب سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور
شکنیں پڑ گئیں، اس کے آس پاس جنگ جو عیسائیوں کو یہ پتہ بھی نہ چل سکا کہ بہت

لاشوں کے درمیان ان کا بادشاہ بھی پڑا سسک رہا ہے۔ کچھ دیر بعد قسطنطین نے آنکھیں کھول دیں اور بمشکل اپنے شاہی لباس کو جسم سے اتار دیا اور کسی معمولی سپاہی کا لباس پہن لیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ترک اس کی لاش کو پہچان کر بے حرمتی کریں۔ اس کی بے قراری سرمایہ عالم تھا کہ اسے اب بھی خود کے پہچانے جانے کا دھڑکا لگا تھا، اس نے کپکپاتی آواز میں کہا! "کیا یہاں کوئی عیسائی نہیں ہے جو میرے سر کو تن سے جدا کر دے، کیونکہ میں جیتے جی مسلمانوں کی قید میں جانا پسند نہیں کرتا"۔

لیکن وہاں کوئی بھی عیسائی موجود نہیں تھا، جو بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتا کچھ دیر بعد عام مسلمان سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے، ان میں سے کسی ایک نے بادشاہ کو معمولی سپاہی سمجھ کر زندگی کے آثار کے پیش نظر ایک ہی وار میں اسے ختم کر دیا۔

ترکوں کا سیلاب جب جنوبی حصوں سے داخل ہو کر شہر میں داخل ہوا تو شہر کے شمالی دروازوں پر شہر کے شمالی حصوں سے داخل ہو جانے والوں کا سیلاب ان کے استقبال کو موجود تھا، شاخ زریں کے اس جہازوں کے فوجی ان سے پہلے ہی شہر میں داخل ہو چکے تھے اور شمالی فصیل پر فتح کا پرچم لہرا رہا تھا۔

عیسائیوں نے دار قرار اختیار کی اور وہ محلوں اور گھروں کے بجائے عبادت گاہوں میں پناہ لینے لگے۔

سلطان کا خدمت گار مذہب پیر مرشد کے پاس سے سلطان کے قریب پہنچا تو اس نے بھی اپنی آنکھوں سے سلطانی پرچم کو لہراتے ہوئے دیکھ لیا، اس نے فرط جوش میں کہا۔ "قسطنطنیہ کی تسخیر فوج سے نہیں، دعا سے ہوئی ہے"۔

سپاہیوں طرف سے سلطان کو فتح مبین کی بشارتیں ملنے لگیں۔ سلطان کے چہرے پر اب بھی بے اطمینانی پائی جاتی تھی، خلیل پاشا نے ادب سے پوچھا۔ "حضور والا کو اب تو خوش ہو جانا چاہیئے، کیونکہ خدا نے قسطنطین کے اقبال کو خاک میں ملا دیا ہے"۔

سلطان نے جواب دیا "مجھے اس وقت تک اپنی فتح کا یقین نہیں آئے گا جب تک میں قسطنطین کی لاش خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں گا"۔

اس کے بعد سلطان نے لاشوں کے ڈھیر میں قسطنطین کی لاش کی تلاش کا کام شروع کرا دیا۔

کافی دیر بعد ڈھونڈھ کر ایک معمولی سپاہی کی لاش کو اٹھا کر سلطان کے پاس لائے اور عرض کیا "حضور والا! یہی فرماں روا کی لاش حاضر ہے۔ ملاحظہ فرمائیں"۔ سلطان

نے اس لاش کو غور سے دیکھا، جس کا سر ایک بنی چڑی کی کلائی سے نیچے لٹک رہا
ہاتھ پر اس کی ٹانگیں لٹکی ہوئی تھیں اور ایک تیر اس کی بائیں پسلی کے ا
پھنسا ہوا تھا۔

سلطان نے پوچھا "تم دونوں نے اسے کس طرح پہچان لیا کہ یہ معمولی
لباس میں بادشاہ کی لاش ہے؟"

ایک بنی چڑی نے مرنے والے بادشاہ کے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے
دیا "ان جوتوں سے، جن پر وہ طلائی عقاب بنے ہوتے تھے، ایسے جوتے بادشا
کوئی اور نہیں پہن سکتا۔"

سلطان نے معزز عیسائیوں کو طلب کیا اور قسطنطین کی لاش کو پہنچا
عیسائیوں نے روتے ہوئے تصدیق کر دی، کہ ہاں یہ ان کے بادشاہ کی ہی لاش
اسی وقت سجدے میں گر گیا اور دیر تک خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔ یہ ۲۹ مئی ۵۳
جمعہ کا دن تھا، اباصوفیہ کے دروازے اندر سے بند کر لیے گئے تھے، سلطان کے
دروازوں پر کلہاڑیوں کی بارش کر دی گئی، اور ذرا سی دیر بعد یہ لوگ اباصوفیہ
ہو گئے۔ وہاں پناہ گزیں شہریوں کو ستونوں سے جکڑ دیا گیا، سلطان گھوڑے کو دوڑا
دوڑتے میدان میں پہنچ گیا، اس کے دائیں بائیں اور پیچھے اس کے وزراء اور محافظ
گھوڑا دوڑتے میدان میں گھوڑوں کی رفتار سست کر دی گئی اور سلطان میدان
طرف بنی ہوئی عظیم الشان عمارتوں کو دیکھنے لگا، یہاں تین ستون سانپوں کی طر
کبر و نخوت کے انداز میں کھڑے تھے یہ ستون اژدہوں کی شکل میں بنائے گئے تھے
نیچے کی طرف تھے۔ سلطان نے گھوڑے سے اتر کر اپنی جنگی کلہاڑی کی ایک ہی ض
ایک اژدھے کے جبڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہاں سے وہ اباصوفیہ کی طرف
گیا۔ وہ اباصوفیہ کے مرکزی دروازے پر گھوڑے سے اتر پڑا۔ یہاں اس نے ا
چاہی کو اباصوفیہ کے ایک چبوترے سے سنگ مرمر کی سل اکھاڑتے دیکھا، سلطان
آگے بڑھا اور اپنے عصائے شاہی کی ایک ہی ضرب سے اسے ڈھیر کر دیا۔

سلطان دیر تک اباصوفیہ میں گھومتا رہا۔ وہ اپنے سپاہیوں اور سپا
مختلف احکام بھی دیتا رہا۔ عقاب ان احکام کے تعمیر اثر گرجے کا سامان، پرستش
صلیبیں گرا دیں گئیں اور در و دیوار پر بنی ہوئی آسمانی شبیہیں ہٹا دی گئیں، ان امور
ہونے کے بعد سلطان نے شاہی مؤذن کو حکم دیا کہ اباصوفیہ کے سب سے اونچ

دھ کر اذان دی جائے۔ مؤذن نے اسی وقت تثلیث کے بلند بالا برج سے خدائے لازیک
وحدانیت اور رسول مقبول صلی نبوت کا اعلان کرتے ہوئے مسلمانوں کو نماز کے لئے
ع ہو جانے کی دعوت دی۔ سلطان نے عام مقتدیوں کی صف میں کھڑے ہو کر نماز شکرانہ
نماز ظہر ادا کی اس کو یہ فتح ۵۳ دن کے محاصرے کے بعد ۱۴۵۳ء میں حاصل ہوئی
ں اس محاصرے کا آغاز ۶ اپریل سے ہوا اور ۲۹ مئی کو اختتام کو پہنچا، اس طرح
جین نے سقوط قسطنطنیہ سے اپنی مشہور تاریخی اصطلاح (MIDDLE AGE) زمانہ وسطیٰ
لئے ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو آخری حد قرار دیا جس کا آغاز ۴۷۶ء میں برابرلس
ہاتھوں رومۃ الکبریٰ کے زوال سے ہوا تھا۔

ایا صوفیہ سے فارغ ہو کر سلطان اس عظیم الشان شاہی محل کی طرف گیا جو اس
ت تک یکے بعد دیگرے قسطنطین اعظم کے شاہی جانشینوں کی رہائش گاہ رہ چکا تھا، اس
ت وہ ویران ہو چکا تھا اور اس کی شاہانہ شان و شوکت خود سلطان کے ہاتھوں چند
ے قبل چھینی جا چکی تھی۔ اس کی ویرانی کا سلطان کے دل پر بڑا اثر ہوا، اس کی زبان
نارسی کا ایک شعر نکل گیا۔

پردہ داری می کند بر قصر قیصر عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

(تارِ عنکبوت قیصر کے محل کی پردہ پوشی کر رہے ہیں اور افراسیاب
کے مقبرے کے گنبد کے نیچے بیٹھا ہوا الو نوبت بجا رہا ہے)

بائیس سالہ سلطان نے قسطنطنیہ کا نام بدل کر اسلامبول رکھ دیا جو بعد میں
تبول ہو گیا۔

فتح قسطنطنیہ کی طرف سے فراغت پا کر سلطان نے یونانی گرجے کا انتظام سابق
نف ہی کے سپرد کر دیا اور خود ادرنہ (ایڈریانوپل) واپس گیا۔ یہاں اینجل کو فتح قسطنطنیہ کا حال
م ہی ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی زندگی کے دن گن رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس مہم کی
یابی تک تو ضرور زندہ رہے گا۔ اس کے بعد سلطان ادرنہ (ایڈریانوپل) واپس آ کر اس کی موت
فرمان صادر کر دے گا۔ اس دوران وہ شہزادی ماریہ سے بھی نہیں مل سکا، امید کی ساری
یں زائل ہو چکی تھیں۔ مایوسی اور غم نے اس کی صحت کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ سلطان
قصر جہاں نما کے اس حصے میں، جس کے سامنے ایک وسیع و عریض اکھاڑہ سا بنا ہوا تھا
ل کو طلب کر لیا۔ زرد رو اور تباہ حال اینجل جب سلطان کے روبرو پہنچا۔ اس وقت

سلطان کے آس پاس امرا اور معززین کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ یہیں سلطان کے سامنے ایک اور شخص بھی کھڑا ہوا تھا۔ یہ شخص اینجل سے زیادہ لاغر اور غمزدہ دکھائی دیتا تھا۔ اینجل کو بھی اس شخص کے برابر لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ رعب سلطان سے وہ دبا ہوا اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔

سلطان نے اینجل سے پوچھا "اینجل! تو اس شخص کو پہچانتا ہے؟"

اور سلطان نے اینجل کے قریب ہی کھڑے ہوئے دوسرے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اینجل نے اس پر سرسری نظر ڈال کر جواب دیا "جی نہیں حضور والا!"

سلطان نے کہا "یہ مائیکل ہے تیرا رقیب، تو اسے نہیں پہچانتا؟"

اینجل نے مائیکل کو بغور دیکھا اور اس وقت تو اس کی حیرت اپنے عروج کو پہنچ گئی جب اس نے مائیکل کی جگہ ایک منحنی غبار سا مائیکل کا ہیولا دیکھا۔ وہ اینجل سے زیادہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

سلطان نے ان دونوں کو مخاطب کیا "تم دونوں کو اپنی سزاؤں کے بارے میں کیا خیال ہے یعنی میں تمہیں کیا سزا دے سکتا ہوں؟"

مائیکل نے جواب دیا "میں نے تو حضور والا کو ایک ایسے خطرے سے قبل از وقت ہی مطلع کر دیا تھا کہ اگر میں چشم پوشی، لاپروائی یا تعلق سے کام لیتا تو شاید سلطنت ترکی میں کوئی غیر معمولی سانحہ رونما ہو چکا ہوتا۔"

سلطان نے اینجل کی طرف دیکھا، اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا "حضور والا! اپنی مدت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

سلطان نے مائیکل کو دوبارہ مخاطب کیا "میں تیرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔"

مائیکل نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کسی مردے کا چہرہ حاضرین کی نظروں میں پھر گیا اس نے کہا "حضور والا! میں اپنی خدمت کے صلے میں انعام و اکرام کی امید رکھتا ہوں۔"

سلطان نے ترشی سے کہا "تو نے ایک لڑکی کی محبت اور اینجل کی رقابت میں یہاں تک آنے کی زحمت گوارا کی ہے تو اینجل کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے یہ خطرناک کھیل کھیل بیٹھا ہے۔ اس لئے میں تجھے بھی بے گناہ نہیں سمجھتا، تو نے اپنے ایک اہم وطن سے غداری کی ہے اور یہ جرم ناقابل معافی ہے۔"

مائیکل سلطان کے قدموں میں گر گیا "شاہوں کے شاہ رحم۔"

سلطان نے پوچھا "تم فن سپاہ گری جانتے ہو؟"

"خوب اچھی طرح۔"

سلطان اینجل کو اچانک مخاطب کیا "اینجل! تو مائیکل سے مقابلہ کرے گا، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ چھل فریب اور عیاری مکاری کے علاوہ تم دونوں میں سے کس میں اتنی قوت ہے کہ وہ محض اپنی قوت بازو سے ہیلن کو حاصل کر لے۔"

اینجل فوراً آمادہ ہو گیا لیکن مائیکل نے پہلو تہی اختیار کی، بولا "میں نے ایک عرصے سے تلوار چھوئی بھی نہیں۔ اس لئے فی الحال اس مقابلے کو ملتوی فرما دیا جائے۔"

سلطان نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

چند امرا نے بھی فتنہ کی مخالفت کی اصرار کیا آخر بدرجہ مجبوری دونوں کو ایک ایک تلوار تھما کر اکھاڑے میں اتار دیا گیا، دونوں نحیف و نزار اور زندگیوں سے بیزار تھے۔ انہوں نے شاید یہ سوچ لیا تھا کہ اپنی اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی اور قیمتی بازی میں انہیں غیر معمولی جرات و شجاعت کے جوہر دکھانا ہیں۔ مائیکل ایک شہزادہ تھا اور اینجل ایک عام سا معمولی لیکن فن سپاہ گری کا ماہر تھا۔

سلطان کے اشارے پر مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں ہی بہت جلد تھک بھی گئے ان دونوں میں سے کسی ایک کے بھی زیر ہونے کا منظر دیکھ دیکھ کر امرا اور دوسرے درباری بھی تالیاں بجا بجا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ تقریباً نصف گھنٹے کے مقابلے میں اینجل نے مائیکل کو زیر کر لیا اور اس کے سینے میں تلوار کی نوک پیوست ہو گئی۔ مائیکل چیخ مار کر گر گیا۔

اینجل نے فرط جوش میں اپنی خون آلود تلوار فضا میں بلند کی اور نعرہ لگایا "لوگو! ادھر میری طرف دیکھو، میں اینجل ہوں، میں نے اپنے بد باطن اور بدطینت حریف کو زیر کر لیا ہے اور اس کے صلے میں، میں سلطان معظم سے رحم کی درخواست کرتے ہیں حق بجانب قرار دیا جاؤں گا، شاید۔"

سلطان نے نفرت سے جواب دیا "نہیں، تو اپنی جیت کے صلے میں رحم کی درخواست بالکل نہیں کر سکتا۔ آخر تو نے یہ کس طرح باور کر لیا کہ میں تجھے معاف بھی کر سکتا ہوں۔ اپنے ایک ایسے دشمن کو جو ایک لڑکی کی خاطر اپنے آقا، اپنے ولی نعمت کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔"

سلطان کے اشارے پر شاہی خدام دم توڑتے ہوئے مائیکل کو اٹھا کے گئے۔ سلطان نے دربار برخاست کر دیا اور اینجل کے لئے حکم دیا "اسے کل دربار بالغرض فیصلہ پیش کیا جائے۔" شاہی خدمت گاروں نے اینجل کو دونوں طرف سے جکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے زندان میں ڈال آئے۔ اس وقت اینجل کے حواس خمسہ رخصت ہو چکے تھے، ہتھیلیوں سے دم

کھینچ رہا تھا۔ زندان کی وہ رات بڑی بھاری نکلی۔ بڑی کوشش کی کہ دوسرے د
آنے والا ہے اس کا ہمت اور حوصلے سے استقبال کرے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں
ناکام رہا، رات کے پچھلے پہر نیند نے ذرا غلبہ کیا تو اس میں اسے اپنے سر پر جلاد کی
نظر آتی رہی۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے فوراً بعد ہی سلطان نے انجل کو طلب کر لیا۔
سلطان بالکل تنہا تھا، سلطان اسی وقت نماز سے فارغ ہوا تھا۔ شاہی خدمت گاروں کو
چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ جب اسی تخلیے میں سلطان اور انجل کے علاوہ تیسرا کوئی نہ رہ
سلطان نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے ایک گھنٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ا
اٹھا لو اور اسی وقت اڈریانوپل کی حدود سے نکل جاؤ"

انجل یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر اس گھنٹی میں ہے کیا، لیکن سلطان نے اس
ہی نہ دیا، اس نے مزید کہا "تو نے ہمارا نمک کھایا ہے۔ میری خدمات بھی ہیں۔ اگر میں
قتل کا حکم صادر کر دیتا تو ہم دونوں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ لیکن میں سلطان ہوں
صاحب اختیار ہوں۔ میں قسطنطنیہ کا فاتح سلطان محمد، اپنے ایک ادنیٰ خدمت گار کی
کم عقلی کے جواب میں خود بھی تو نادانی اور کم عقلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔" اس کے
بار پھر گھنٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ گھنٹی سنبھال اور اسی وقت اڈریانوپل کی حد
نکل جا، سر دیالے بادشاہ سے مل کر میری طرف سے کہہ دے کہ سلطان نے کہا ہے تیری
پوری ہو گئی ہے اب وہ اپنی کو تجھ سے وابستہ کر دے۔"

سلطان کی باتوں کا مطلب انجل کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے گھنٹی سنبھالی، کچھ
سلطان کی خلاف توقع عفو و درگزر نے انجل کے دل کو گداز کر دیا تھا، اس نے ڈبڈ
آنکھوں سے سلطان کی طرف دیکھا، سلطان نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا تھا انجل
ادب سے جھک کر سلطان کو الوداعی سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی سلطان نے تالی بجا کر خدمت گاروں کو طلب کیا اور کہا
دیا "انجل کو بحفاظت اڈریانوپل کے باہر چھوڑ دیا جائے"

اس حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کی گئی اور انجل کو اڈریانوپل کی حدود سے
نکال دیا گیا۔ گھنٹی کا سمجھنا اسے پریشان کئے ہوئے تھا، اس نے موقع پاتے ہی ایک د
کے سائے میں دم لیا اور گھنٹی کو کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ اس میں سلطان کا خنجر، پیٹی
لباس رکھا ہوا تھا، اس سامان کے ساتھ ہی ایک پرچہ بھی رکھا تھا۔

"یہ ہے وہ سامان، جو تجھے ہیلن کے لئے درکار تھا۔ جا اسے شاہ سردیا کی خدمت میں پیش کر دے اور اس سے اپنی ہیلن حاصل کر لے۔ اگر بادشاہ اچھر مچھر کرے تو اس سے کہہ دینا کہ میں عنقریب سردیا بھی پہنچ رہا ہوں اور خلاف عہدوں اور عہد و پیمان سے پھر جانے والوں کو معاف نہیں کرتا۔"

اینجل کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی اور وہ سلطان کی فراخ دلی کا دل ہی دل میں قصیدہ پڑھنے لگا۔

* * *

شاہ سردیا نے اینجل سے سلطان کی نشانیاں لے لیں اور مائیکل کی بابت دریافت کیا، اور جب اسے مائیکل کی دردناک موت کا علم ہوا تو اس کے غم و غصہ کی حد نہ رہی، اس نے کہا "مائیکل میری بہن کا بیٹا تھا، میں اپنی بہن کے بیٹے کے قاتل سے اپنی ہیلن کو کس طرح واپس لے سکتا ہوں اور پھر اس صورت میں کہ تجھے سلطان کی جو نشانیاں مرحمت فرما دی تھیں انہیں تو نے حد درجہ گرمی سے حاصل کیا ہے پھر تو ہیلن کا حقدار کس طرح ٹھہرا۔"

اینجل شاہ سردیا سے بحث تو نہیں کر سکتا تھا اس نے چپکے سے سلطان کا پرچہ اپنے بادشاہ کی طرف بڑھا دیا۔ بادشاہ نے پرچہ پڑھ کر اینجل کو ڈانٹا "تو نے سردیا کمرہ دیا" "وہ سردیا کا رخ کرے گا، اگر اس نے ایسی غلطی کی تو اسے مزہ چکھا دیا جائے گا اور جہاں تک میری بیٹی ہیلن کا تعلق ہے۔ اسے ہنگری کے ایک شہزادے سے منسوب کیا جا چکا ہے اب تو اس کی صورت تک نہیں دیکھ سکتا۔"

اینجل کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ سردیا کے بادشاہ نے اسے اسی وقت نکلوا دیا۔ اس مایوسی کے عالم میں وہ اسی دیر کے لئے شہزادی ماریہ کا خیال بھی آیا لیکن اس خیال کے ساتھ ہی اس کے سارے جسم میں خوف اور کپکپی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اگر ہیلن کی واپسی اور شہزادی ماریہ تک رسائی۔ اس کی دانست میں یہ ایک شاہراہ تھی، جو اسے موت کے دروازے تک پہنچا دیتی۔ اس دروازے کے اس پار نہ تو ماریہ تھی اور نہ ہیلن، وہاں کیا تھا یا کیا ہے؟ اس کا جواب نہ تو ماضی میں کسی نے دیا ہے اور نہ مستقبل میں دیا جا سکتا ہے۔

اینجل ناکام و نامراد ہی رہا لیکن سلطان کی یہ پیشین گوئی کہ "خلاف عہدوں اور عہد و پیمان سے پھر جانے والوں کو معاف نہیں کرتا" پوری ہو گئی کیونکہ دس سال کے اندر ہی سردیا کو سلطان کی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ ★

رشتوں کی صلیب

ہارون اور منیزہ خوش و خرم زندگی گزارنے لگے۔ عامر بھی بہت خوش تھا شروع
وع میں منیزہ نے اپنی کارکردگی کی مثال قائم کر دی۔ عامر کو اپنے ہاتھوں سے غسل دینا،
ف ستھرا رکھنا اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا، یہ سب اس کے روزمرہ میں داخل تھا
ں کو سونے سے پہلے وہ عامر کو دلچسپ حکایتیں سناتی رہتی، عامر کسی بات پر روٹھتا تو
ہ سو جتن کر کے منا لیتی۔ ہارون کا باپ یہ سب بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہا تھا۔
ہ کی ہر بات اچھی لگتی تھی مگر ایک بات وجہ نزاع تھی۔ وہ مال و زر اور درہم و دینار کو
ہی قبضے میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات منیزہ کو ناپسند تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے یہ
دھا آدمی اس کے گھر کا مالک و مختار بنا بیٹھا رہے۔ وہ ہارون کے باپ کو ہر طرف سے
خل کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے عامر کو اس بُری طرح اپنے قبضے میں کیا تھا کہ اب وہ
کے پاس جاتے ہوئے گھبرانے لگا تھا۔ دادا کو یہ بات ناگوار گزر رہی تھی لیکن اس کے
جود اسے منیزہ سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ اس نے ابھی تک مال و زر اور درہم و دینار
وئی سروکار نہیں رکھا تھا۔

ہارون خراسان واپس جانا چاہتا تھا لیکن جانے سے پہلے چند خطرات اُسے
زدہ کر رہے تھے۔ وہ اپنے بھتیجی کی طرف سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیشہ یہ خدشہ محسوس
رہتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔ حملے کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ نہیں جانتا تھا
نے اپنے باپ کو بھی بار بار یہی سمجھایا کہ وہ اپنے داماد سے ہوشیار رہے اور منیزہ کو بھی
ر کیا کہ اس کے بھتیجی سے چوکنا رہے لیکن منیزہ جواب میں کہتی کہ اب ڈرنے کی کوئی بات
عامر شادی تو ہو چکی۔ ہاں اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو خوف کی بات تھی۔

ہارون نے سمجھایا "منیزہ! وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح اپنی ناکامی کا
لینے کی کوشش کرے گا۔"

منیزہ نے بات ہنسی میں اڑا دی۔ "وہ کیا بدلے گا۔ اب تو وہ منہ دکھانے قابل بھی نہیں رہا۔"

کچھ دنوں بعد منیزہ کا باپ بھی آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہارون کا سب کچھ اس بیٹی منیزہ کے قبضے میں ہوگا لیکن یہاں اپنی بیٹی کو اپنے شوہر کے باپ کا دست نگر دیکھ افسوس ہوا اور اپنی بیٹی کی حماقت پر غصہ بھی آیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گھر کی ہر چیز قبضے میں کر لی ہوگی لیکن یہاں یہ دیکھ کر پریشان اور فکر مند ہو گیا کہ منیزہ کی حیثیت نوکرانی گئی تھی اور اس گھر میں جو کچھ بھی تھا ہارون کے باپ کا تھا۔

ہارون کے باپ نے منیزہ کے باپ کو خشمگیں نظروں سے دیکھا کیونکہ اس نے منیزہ باپ کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں خطرات محسوس کر لیے تھے جو منیزہ کے باپ دل و دماغ میں پرورش پا رہے تھے۔ اس نے اپنے مہمان کا استقبال خوش دلی سے نہیں منیزہ کے باپ نے بھی اس کی ضرورت کو محسوس کر لیا۔ اس نے زمانہ حازی سے کام لیا۔ بولا "شاید یہ شادی کبھی نہ ہوتی اگر مجھے یہ نہ معلوم ہو گیا ہوتا کہ تو نے اپنے بیٹے کو منیزہ سے کرنے کی اجازت دے دی ہے، کیونکہ مجھ کو ہارون سے کبھی کوئی شکایت ہی نہیں رہی

ہارون کے باپ نے جواب دیا "ہاں، میں نے یہ سوچ کر یہ رشتہ قبول کر لیا کہ ہمیں نوجوانوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنا ہی چاہیئے۔"

منیزہ اپنے باپ کے ساتھ برق سانے والی سرد مہری کو بری طرح محسوس کر رہی تھی۔ رات کو ایک ہی دسترخوان پر سب ایک ساتھ بیٹھے۔ ہارون نے کھانے کے دوران منیزہ کے باپ سے کہا! "کچھ دنوں بعد میں خراسان واپس چلا جاؤں گا، میری سائے میں آپ یہیں منیزہ کے پاس آجائیے، دل بہلا رہے گا۔"

لیکن منیزہ کے باپ نے ابھی جواب دیا بھی نہ تھا کہ ہارون کا باپ بول اٹھا! "اگر تو بس اپنا ہی سوچتا ہے، اگر مجھ سے کوئی کہے کہ اپنے گھر کو چھوڑ کر میرے ساتھ رہ تو میں صاف انکار کر دوں گا۔"

منیزہ کے باپ نے اپنے گال پر طمانچہ سا محسوس کیا، ہاتھ کا نوالہ منہ تک نہ لے سکا، بولا! "اپنا گھر کسے نہیں اچھا لگتا لیکن تو نے جس طرح اور جس موقع پر اپنے گھر کی تعریف کی ہے میرے لئے یہ تعریف گال بن گئی ہے اب تو ہم دونوں ایک ساتھ کہیں بھی نہیں رہ سکتے۔"

ہارون کے باپ نے غیر جذباتی لہجے میں کہا! "خدا کے فضل سے تو مجھ دار النسا

بیٹی کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا کبھی نہیں چاہیئے۔"

ہارون باپ کی باتوں پر سٹپٹا جا رہا تھا۔ وہ کھانا بھول گیا، بولا "باوا جان! یہ آپ باتیں کر رہے ہیں؟ منیزہ کا باپ ہمارا مہمان ہے اور مہمانوں کی دل آزاری گناہ ہے۔"

باپ نے جواب دیا "ہارون! میں نے کسی کی بھی دل آزاری نہیں کی۔ میں نے ایک ت کہہ دی ہے اور یہ بھی مشہور ہے الحق مُرّ (سچائی کڑوی ہوتی ہے)۔"

منیزہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی۔ بولی "باوا جان! آپ کل ہی یہاں سے چلے جائیے۔ یہ انوں کے لیے تنگ ہے۔"

ہارون کے باپ نے غصے میں کہا "مہمانوں کے لیے نہیں، منصوبہ بازوں کے لئے کہہ ہوں تیرے باپ کے ارادوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں منصوبے کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا "میرا کوئی مقصد نہیں، میں اپنی بیٹی کو خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں، اگر میں لالچی ہوتا تو اس وقت تک اپنی بیٹی کی ہارون سے شادی ہی نہ ب تک میں اس کو الگ رہنے پر آمادہ نہ کر لیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔" پھر نے ایک کپڑے سے پونچھتے ہوئے بولا "افسوس کہ میں یہاں آ کر بہت شرمندہ ہوا۔ ن انسانی طمع اور خود غرضی کی خباثتوں پر ذرا سا بھی غور کر لیتا تو شاید اس شرمندگی اور ذلت سے محفوظ رہتا۔"

ہارون کے باپ نے غصے میں کپکپاتے ہوئے کہا "خوب۔ یعنی میں خود غرض طامع ہوں۔ میرے ہی گھر میں میری برائی کرنا یہ تو کوئی تجھی سے ۔۔۔۔"

ہارون دونوں کی تلخ کلامی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ باپ کی بات کاٹتا ہوا، باوا جان! ویسے یہ ہے بڑی زیادتی کی بات آپ نے واقعی اپنے مہمان کی دل آزاری کی پ کو اپنے مہمان سے معذرت کرنا چاہیئے۔"

باپ بیٹے پر برس پڑا "تو چپ رہ۔ معذرت کا مطلب ہے معافی مانگ لوں؟ ایسا ہو سکتا، قیامت تک ایسا نہیں ہو سکتا اور اب میرا فیصلہ بھی سن لے۔ تو نے منیزہ ادی کی ہے، اس لیے یہ منیزہ کا گھر ہے۔ منیزہ کا باپ یہاں نہ رہ سکتا ہے اور نہ وہ ن کر سکتا ہے۔ اسی گھر میں میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ ہو گا۔"

منیزہ کا باپ تلملا کر چیخا "جی گھر کے اہاتیں کر لے جتنا چاہے بولتا رہ لیکن یہ بھول، کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ کوئی ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب میں تجھے

تیری اپاہنوں کا جواب دے سکوں۔"

مینزہ نے اپنے باپ کو سمجھایا۔ "بابا جان! میں شرمندہ ہوں، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد بھی کہ میں نہ شاد رہوں گی اور آپ کو میری وجہ سے یوں ذلیل و خوار ہونا پڑے گا تو میں شادی ہی نہ کرتی۔"

ہارون کو اپنے باپ پر غصہ آ رہا تھا، بولا۔ "بابا جان! ہماری مہمان نوازی تو مشہور ہے، آپ فوراً تحمل سے کام لیجئے۔ اس گھر میں آپ ہی کا حکم چلے گا لیکن آپ اپنے حکم کو عدل و انصاف کے دائرے میں چلائیے۔"

باپ نے ایک بار پھر بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ "مجھے تیرے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہارون! تو سامنے سے ہٹ جا ورنہ میں تیرے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دوں گا۔"

مینزہ کو رونا آ گیا۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر ایک کونے میں چلی گئی اور وہاں رونے لگی۔

ہارون کے باپ نے عامر کو گود میں اٹھا لیا اور اسے لے کر باہر چلا گیا، اس کے ہاتھ میں چند کھجوریں دے دیں، عامر خوش ہو گیا۔ ہارون کے باپ نے عامر سے پوچھا۔ "بیٹے عامر! میں کیسا ہوں؟"

عامر نے فوراً جواب دیا۔ "بہت اچھے۔ سب سے اچھے۔"

باپ نے سرگوشی میں دوسرا سوال کیا۔ "اور یہ دوسرا بوڑھا جو مینزہ کا باپ ہے، تجھے کیسا لگا؟"

عامر نے فی الفور جواب دیا۔ "برا۔ آپ سے لڑتا جو ہے۔"

دادا کے پوتے کی پشت تھپتھپائی اور تیسرا سوال کیا۔ "تیری یہ نئی ماں کیسی ہے؟"

عامر نے جواب دیا۔ "اچھی۔ بہت اچھی۔"

اور وہ رونے لگا۔ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر۔ ہارون کے باپ کو شبہ گزرا کہ شاید مینزہ کا سلوک عامر کے ساتھ اچھا نہیں ہے اس لیے عامر مینزہ سے متعلق سوالات پر رونے لگا۔ اس نے بچے کی پیٹھ تھپتھپائی اور تسلی دیتا ہوا بولا۔ "میرے بچے عامر! تو مت گھبرا، اگر مینزہ نے تجھ کو ستایا ہے تو اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔"

عامر نے ہراساں ہو کر جواب دیا۔ "دادا جان! آپ سمجھ نہیں سکیں گے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ کہیں میری یہ ماں بھی مجھ سے روٹھ کر نہ چلی جائے۔"

دادا اس جواب پر چونک پڑا، اسے اپنے سارے منصوبے درہم برہم ہوتے نظر

آئے، بولا "میرے معصوم ناسمجھ بیٹے! تو ان چالاکیوں اور عیاریوں کو ابھی نہیں محسوس کر سکتا۔ منیزہ کی محبت کے پیچھے کارفرما ہے لیکن تو ذرا اور بڑا ہو لے تو میں ان سب کی اچھی طرح نشان دہی کر سکوں گا۔"

منیزہ کے باپ نے بارون کے باپ کو عامر سے باتیں کرتے دیکھا تو بیٹی کو سمجھایا۔ "منیزہ! تو ہوشیار رہ، یہ عیار انسان اپنے پوتے کو معلوم نہیں کیا سکھا پڑھا رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تو اعتبار کرے۔ عامر میں زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

منیزہ نے برا مان کر جواب دیا۔ "بابا جان! میں آپ کی یہ بات کبھی نہیں مانوں گی۔ میں عامر کو چاہتی ہوں، از حد، بہت زیادہ اور یہ ناممکن ہے کہ عامر محبت کا جواب محبت سے نہ دے۔"

باپ نے افسوس سے کہا۔ "میری یہ بات ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے، تو اس کے عاوض کچھ بھی کر لے، اس کا کوئی بھی خیال نہیں کرے گا۔ ہاں اگر تیری اپنی اولاد ہو گی تو تو اس پر اسی طرح اعتبار کرے گی۔ تو اپنی محبتیں، اپنی ممتا، اپنی خدمت اپنی اولاد کے لیے محفوظ رکھ۔"

لیکن باپ کی نصیحتیں بے اثر رہیں اور وہ اپنے دل سے عامر کی محبت نہیں نکال سکی۔

کچھ دیر بعد سب داؤ کا در غلایا ہوا عامر منیزہ کے پاس آیا تو اس کے دل میں منیزہ کی محبت کا طوفان برپا تھا۔ آج اس وقت اس کو منیزہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اسی طرح منیزہ بھی آج عامر کو زیادہ حسین، زیادہ معصوم اور زیادہ پرکشش محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بے اختیار عامر کو گود میں اٹھا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔ عامر بھی منیزہ کی گود میں پہوست ہوتا چلا گیا۔

* * *

بارون خراسان چلا گیا، وہاں وہ شہر شہر اور منگاموں میں پلا بڑھا کہ گھر کا اور کچھ ہی نہ رہا۔ کبھی کبھی اپنی خیریت سے منیزہ کو مطلع کر دیا کرتا۔ دوسری طرف منیزہ کا باپ آذر بائیجان گیا ہوا تھا۔ وہاں اس نے چند ایسے کارنامے دکھائے کہ خلافت کی طرف سے انعام و اکرام کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ یہیں بارون کا ہمنوا بھی تھا۔ اس نے منیزہ کے باپ

سے بڑی شکایتیں کیں اور کہا "تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ منیزہ ہارون کے پاس خوش رہے گی تو یہ تیری غلط فہمی یا خوش فہمی ہے۔ منیزہ سب سے زیادہ آزردہ اور ناخوش اسی گھر گھر میں رہے گی کیونکہ اس گھر میں ہارون کا ایک بچہ پہلی بیوی کا بھی رہتا ہے۔ تیری بیٹی اسی لڑکے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوتی رہے گی"

منیزہ کے باپ نے اندراہ شکایت جواب دیا "میرا خیال ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی ناانصافی کی، اگر میں ایسا نہ کرتا تو منیزہ آج تیری بیوی ہوتی اور میں یوں ذلیل و خوار نہ ہو رہا ہوتا"

ہمنوی نے کہا "ایک بات میری بھی یاد رکھ، وہ یہ کہ ایک سازش کے زیر اثر تیری بیٹی ہمیشہ اولاد سے محروم رکھی جائے گی"

منیزہ کا باپ چونک کر بولا "یعنی یہ بات، تجھ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟"

ہمنوی نے جواب دیا "مجھ کو یہ بات کون اور کیوں بتائے گا مجھے تو خود بخود یہ باتیں معلوم ہو گئیں"

منیزہ کے باپ نے اصرار کیا "اچھا ذرا اس کی وضاحت کر دے کہ منیزہ بے اولاد کیوں رہے گی اور یہ کہ اس کے خلاف اگر اس قسم کی محاذ آرائی ہو رہی ہے کہ عین منیزہ کو اولاد نہ رکھا جائے تو اس کا سبب کیا ہو گا؟"

ہمنوی نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا "اگر تو اجازت دے تو گفتنی اور ناگفتنی کھول کر کہہ ڈالوں"

منیزہ کا باپ ہارون کے ہمنوی کی باتوں سے بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا اس نے بمشکل دریافت کیا "کیا ایسا ممکن ہے کہ تو کسی رشتے کے احترام یا لحاظ کے بغیر ہر بات صاف صاف بتا دے؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" ہارون کے ہمنوی نے جواب دیا "جناب والا! ہارون اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں نے ہارون کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ منیزہ کو بے اولاد رکھا جائے۔ اس سے ہارون کو یہ فائدہ رہے گا کہ اس کے بیٹے حامر کو ہمیشہ منیزہ کی محبت حاصل رہے گی"

منیزہ کے باپ نے دل ہی دل میں شادی کی مدت کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ شادی کو ڈھائی سال گزر چکے ہیں مگر منیزہ اولاد سے محروم ہے۔ اس کو ہارون کے ہمنوی کی باتوں پر اب پورا پورا یقین آ گیا اور وہ غصے اور نفرت کی آگ میں جلنے لگا۔ آہستہ سے بولا "تو یہ

بات ہے۔ سازش، لیکن میں اس سازش کو ناکام بنا دوں گا۔ اور دیکھوں گا کہ میری منیزہ اولاد سے کس طرح محروم رکھی جاتی ہے۔"

اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو ایک خط لکھا جس میں اشاروں کنایوں میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ شادی کے ڈھائی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم کیوں ہے۔ اس نے منیزہ کو ہدایت کی کہ وہ چند ماہ بعد خص پہنچ رہا ہے، اس لیے وہ بھی خص پہنچ جائے تاکہ چند نہایت ضروری باتیں کی جا سکیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ اس کو اچانک ایسی سازش کا پتہ چلا ہے جو منیزہ کے خلاف شادی سے پہلے ہی تیار کر لی گئی تھی اور یہ اسی سازش کا اثر ہے کہ منیزہ ڈھائی سال بعد بھی بے اولاد ہے۔

منیزہ کو جب یہ خط ملا تو وہ پریشان ہو گئی۔ منیزہ اپنے دل میں اولاد کی شدید خواہش محسوس کر رہی تھی۔ لیکن وہ مجبور تھی۔ اس کو اپنی اولاد کی ضرورت یوں اور زیادہ محسوس ہوئی تھی کہ عامر کو اس کا دادا بُری طرح ورغلاتا رہتا تھا۔ دادا کی پوری کوشش یہ تھی کہ عامر کا دل منیزہ کی محبت سے خالی اور محروم رکھے۔ اس نے سو سو طرح سے یہی باور کرایا تھا کہ منیزہ عامر کی اپنی ماں نہیں ہے اور اب تک وہ جس محبت کا اظہار کرتی رہی ہے محض بناوٹی ہے۔ اس طرح اپنی محبت کا فریب دے کر اس فکر میں ہے کہ کسی طرح عامر کے اس مال و زر اور روپیہ پیسہ پر قبضہ کر لے جو اس کو اپنے باپ سے ورثے میں ملنے والا ہے۔ اس نے عامر کو یہ سبق بھی پڑھایا تھا کہ عقل مند لوگ دولت اور روپیہ پیسے کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔

جب اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی سبق دیئے گئے تو عامر کے دل میں بھی ذرا سا شک آ گیا، اب وہ منیزہ کے طرزِ عمل میں اس کے تصنع، مجازی اور فریب کو تلاش کرتا رہتا اور عامر اذہان ان میں سے کوئی نہ کوئی شے منیزہ میں پا لیا کرتا تھا۔

بارون خراحان میں رہ تو رہا تھا مگر گھر کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ یہاں اس کو تک اپنے بہنوئی کا خیال آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی زخمی سانپ کی طرح ہے جو کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے، چنانچہ اس نے منیزہ کو خط لکھ دیا اور اس میں بطورِ خاص یہ ہدایت کی اس کی عدم موجودگی میں اگر بہنوئی آئے تو منیزہ اس کے سامنے نہ جائے اور نہ اس سے کسی قسم کی بات کرے۔ کیونکہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

اس خط کے ساتھ ہی دوسرا خط اپنے باپ کو لکھا اور باپ کو صاف صاف لکھ دیا اس کے بہنوئی کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس نے یہ دھمکی دے رکھی

ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے خاندان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس خط میں ذرا سا کھٹکا عامر کے لئے بھی تھا جس میں ہارون نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

اس خط کی آخری سطروں نے منیزہ کو بڑا دکھ دیا۔ وہ خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں جس عامر پر اپنی محبتیں نچھاور کرتی رہی، اس کو ہارون یہ ہدایت دے رہا ہے کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے، کیونکہ بڑھاپے میں دادا کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔ منیزہ نے سوچا، وہ خود جس تنہائی اور اکیلے پن کے کرب سے دوچار ہے کیا اس میں کسی کی محبت اور دل جوئی کی ضرورت ہی نہیں؟

اس نے پڑھ کر ہارون کو لکھ دیا۔

"ہارون! میں چند ماہ کے لیے حمص جا رہی ہوں۔ کیونکہ وہاں میرا باپ آذر بائیجان سے پہنچ رہا ہے۔ میں حمص تنہا جا رہی ہوں کیونکہ عامر کا اپنے دادا کے پاس رہنا بہت ضروری ہے میرا بھی یہی خیال ہے کہ عامر کو اپنے دادا کا بہت خیال رکھنا چاہیئے کیونکہ اسی بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

ہارون! میں نے تیرے بیٹے کو اب تک جو پیار دیا ہے اور اس کا جتنا خیال رکھا ہے تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ میرے اس پیار اور خیال کی روشنی میں تیرا فرض تو یہ تھا کہ عامر کو لکھتا کہ وہ میرا خاص خیال رکھے اور مجھے اکیلا نہ محسوس ہونے دے لیکن تو نے کبھی مجھ کو نظر انداز کر دیا یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس کا شکوہ کس سے کروں؟ بہر حال میں حمص جا رہی ہوں، اور رو گئی یہ بات کہ تیرے ہمنوؤں کے سامنے نہ جاؤں اور اس سے باز نہ کرے تو یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر تو یہ سب نہ بھی لکھتا، میں تب بھی یہی کچھ کرتی۔

ہارون! میں بہت اداس ہوں اور یہ اداسی اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ یا تو تو خود چلا آ، یا پھر مجھے اپنے پاس ہی بلا لے اور ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ عامر کی طرح مجھے بھی ایک بیٹا دے دے کیونکہ میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اپنے بیٹے ہی کو بیٹا کہہ سکتی ہوں، اسی پر ناز کر سکتی ہوں اور اسی سے امیدیں وابستہ کر سکتی ہوں۔ میرے بیٹے کو تیرا باپ در غلا نہیں سکے گا اور میرا بیٹا ہی مال و زر اور درہم و دینار کو میرا تقسیم کرائے گا جس پر تیرا باپ سانپ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ اس وقت میری سب سے بڑی ضرورت ایک بیٹا ہے جس کو میں حاصل کر کے رہوں گی۔ آ، جلد آ، تاکہ میں تجھ سے ایک بیٹا کم از کم ایک بیٹا حاصل کر سکوں۔"

خراسان میں جب یہ خط ہارون کو ملا تو اس کو شبہ گزرا کہ منیزہ کو اولاد سے محروم رکھنے کی سازش سے کسی نے مطلع ضرور کر دیا ہے ورنہ وہ اس طرح ایک بیٹے کی خواہش نہ کرتی وہ اپنے ہمسری سے بہت زیادہ خوفزدہ تھا اور اس کو یقین تھا کہ منیزہ کچھ بھی لکھے لیکن اس راز کا افشا اس کے ہمسوتی نے ہی کیا ہوگا۔

ہارون کی خواہش تھی کہ جب تک وہ خود دمشق نہ پہنچ جائے منیزہ دمشق نہ چھوڑے وہ اسے حمص خود پہنچانا چاہتا تھا اور منیزہ کے ساتھ حمص میں وہ خود بھی رہنا چاہتا تھا کیونکہ اس کو قطعی یقین نہیں تھا کہ اس کا ہمسوتی اس کی عدم موجودگی میں حمص پہنچے اور منیزہ اور اس کا باپ دونوں ہی اسے اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیں۔ اس نے بعجلت منیزہ کو لکھ دیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ دمشق نہ چھوڑے اور اگر حمص جانا ہی چاہتی ہے تو عامر کو اپنے ساتھ لیتی جائے۔

یہ خط ابھی راستے ہی میں تھا کہ منیزہ نے سفر کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ عامر منیزہ کی لاتعلقی اور بے مروتی سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ منیزہ سے بات کرے لیکن منیزہ نے سرد مہری سے اس کو خاموش کر دیا۔ اس نے بدستور نہ بدلی کہ ہارون کا باپ بھی محسوس کر چکا تھا۔

ہارون کے باپ کو بھی پتہ نہ تھا کہ منیزہ کہاں جا رہی ہے۔ منیزہ نے بستر اور ضروری سامان باندھ کر ایک طرف رکھ دیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر کسی کا انتظار کرنے لگی عامر دور کھڑا بہ حسرت یہ سب دیکھ رہا تھا

ہارون کا باپ بھی یہ سب دیکھ رہا تھا مگر اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

شام کو مغرب کی نماز کے بعد منیزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر پڑ رہی۔ عامر بڑی دیر تک اپنے بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی نئی ماں کہاں جا رہی ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے جائے گی یا نہیں۔ ہارون کا باپ خوش تھا کہ اس کے گھر سے وبا نکل جا رہی تھی۔

رات کے اندھیرے میں عامر چپکے سے اٹھا اور منیزہ کے دروازے پر دہلیز سے ٹیک لگا کر بیٹھ رہا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور عامر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دستک دے کر کھلوا لیتا۔ اس رات منیزہ کو بھی عامر کی یاد بہت ستا رہی تھی، اس کو وہ ننھا سا عامر کئی طرح یاد آ رہا تھا جو کئی سال پہلے شادی سے قبل اس کی یاد میں بھٹک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور دل ہی دل میں وہ ہارون کے باپ کو برا بھلا کہنے لگی جس نے ان

دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی تھی۔

عامر دہلیز پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔ ہارون کا باپ خراٹے لے رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں منیزہ کو کمرے کے دروازے پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر خود بھی گر گئی۔ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کون ہے؟"

جواب میں عامر کی آواز سنائی دی۔ "ماں! میں ہوں عامر۔"

منیزہ نے حیرت سے پوچھا۔ "عامر! مگر تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

عامر نے جواب دیا۔ "ماں! میں آپ کے پاس آیا تھا مگر کمرے کا دروازہ بند دیکھ دہلیز پر ہی بیٹھ گیا تھا کہ آنکھ لگ گئی اور میں بیٹھے بیٹھے گر گیا۔"

منیزہ نے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ "یہاں دہلیز پر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ آواز دی تو دستک دے لیتا۔"

منیزہ اسے کمرے میں لے چلی گئی۔ اس نے شمع کی روشنی میں عامر کے چہرے پر آنسوؤں کے نشانات دیکھے۔ شدت سے پوچھا۔ "کیا تو رو رہا تھا؟"

عامر کی آنکھیں ایک بار پھر چمکنے لگیں۔ بولا۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اپنے باپ کے پاس حمص۔ کیوں؟ تو نے یہ سوال کیوں کیا؟"

عامر نے پوچھا۔ "کیا آپ تنہا جا رہی ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں۔ کیونکہ میں حمص سے اکیلی ہی آئی تھی۔"

عامر نے دیکھا منیزہ یہ جواب دیتے دیتے کھو گئی تھی اور اس کی نظریں خلا پر گڑ کر رہ گئی تھیں۔ عامر نے پوچھا۔ "میں کس کے پاس رہوں گا؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اپنے دادا کے پاس، کیونکہ میں بہر حال تیرے لئے غیر ہوں۔"

عامر نے خوشامد کی۔ "آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے، یہاں نہیں رہوں گا۔ میں دادا کی بات نہیں مانوں گا۔"

منیزہ نے عامر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ عامر کی ہر بات نہیں کر سکتی تھی مگر ہارون کے باپ کی باتیں سنتے سنتے اس کا دل پک گیا تھا بولی۔ "تو ضد نہ کر اور اپنے دادا کے پاس رہ۔ میں جلدی ہی واپس آجاؤں گی۔"

عامر اس سے چمٹ گیا۔ "میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ آپ کے بعد یہ گھر فنا

اچھا نہیں لگے گا۔"

اسی وقت خواجیدہ حالت میں عامر کا دادا کمرے میں داخل ہوا اور جا ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔" عامر! تو یہاں کیوں آیا تھا؟ چل، زیادہ رات تک جاگنا اچھی بات نہیں۔"

عامر نے جواب دیا۔" دادا جان! آپ جائیے اور آرام کیجئے۔ میں یہیں اسی کمرے میں رہوں گا۔"

دادا نے انگڑائی لیتے ہوئے ذرا سختی سے کہا۔" عامر تو خوب جانتا ہے کہ اس دنیا میں تیرے دو ہی غمخوار ہیں، ایک تیرا باپ ہارون اور دوسرا میں خود ان دو کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتا۔"

عامر نے کہا۔" آپ سب کا ارشاد سر آنکھوں پر۔"

دادا نے پوچھا۔" میں نے اب تک جو کچھ بھی تجھے بتایا اور سمجھایا ہے اس کی آہستہ آہستہ تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔ اس وقت بھی تو نے یہی بات محسوس کی ہوگی کہ تو تو منیزہ کے پاس رہنے اور اسی کے ساتھ جانے کی ضد کر رہا ہے لیکن منیزہ تجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں مانتی۔ بیٹے! حقیقتاں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

منیزہ دل مسوس کر رہ گئی، بولی۔" بابا جان! آپ ایسی باتیں نہ کیجئے جس سے عامر کا مستقبل ہی تباہ ہو جائے۔ آپ عامر کو جو کچھ محسوس کرانا چاہتے ہیں اس سے کئی آدمی تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ میں عامر کی دشمن ہرگز نہیں، حالانکہ آپ اس معصوم کو یہی باور کرا رہے ہیں۔"

ہارون کے باپ نے تیوریاں بدل کر جواب دیا۔" میں کچھ بھی باور نہیں کرا رہا۔ عامر تجھ کو وہی سمجھے گا جو تو اپنے طرز عمل سے ثابت کرے گی۔ تو حریص ہے اور تو نے میرے بیٹے کے درہم و دینار دیکھ کر اس سے شادی کر لی۔ اب اگر تو عامر کو نظر انداز کرے گی اور عامر کے اصرار کے باوجود حمص اکیلی ہی چلی جائے گی تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اس سے میں یا عامر کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ یہی نا کہ تجھ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ تو اپنی خواہشات کی غلام ہے....."

منیزہ رونے لگی، بات کاٹ کر بولی۔" بس بس، اب میں آپ کی مزید باتیں نہیں سن سکوں گی۔ میں عامر کو اپنے ساتھ اس لیے نہیں لے جانا چاہتی کہ آپ اس کی مخالفت کریں گے۔ میں اپنے ساتھ لے جانے کا اعلان کر کے عین روانگی کے وقت اس ندامت سے نہیں دوچار ہونا چاہتی جو عامر کو جبراً روک کر آپ میرے چہرے پر مل دیں گے۔"

ہارون کے باپ کو ایک دم اتنا غصہ چڑھ گیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا۔ اس نے عامر کو منیزہ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی گود میں لے لیا۔ بولا "عامر! آؤ تم میرے ساتھ چلو، میں تم کو اور زیادہ ذلیل نہیں ہونے دوں گا۔" پھر منیزہ کو مخاطب کر کے حکم دیا "او لڑکی! تو حمص اس طرح جا رہی ہے کہ ابھی تک مجھ سے حمص جانے کی اجازت تک نہیں لی، تو اپنی مرضی سے جا رہی ہے اس لیے تو اس وقت تک حمص میں رہ جب تک ہارون خراسان سے واپس نہ آ جائے۔"

منیزہ نے برجستہ جواب دیا "آپ کو واپسی کی بات کہہ بھی رہے ہیں لیکن ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں اب واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتی۔ میں جہنم میں دوبارہ نہیں لوٹ کر آؤں گی۔"

عامر کا دادا تلملا کر رہ گیا۔ اس نے عامر کو گود میں اٹھا لیا اور یہ جا وہ جا۔ لڑکا اور لڑکا بھلا کہنا مانتا وہ فوراً ہی وہاں سے دفعان ہو گیا۔

کئی دن بعد منیزہ اس طرح حمص روانہ ہو گئی کہ اس کا ایک پڑوسی دوران سفر اس کا سرپرست تھا اور وہ غم زدہ اور افسردہ منیزہ کو تسلیاں دینے میں مشغول رہا۔ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے مشیت ایزدی کے مطابق ہے اس لیے منیزہ کو شکایت نہیں کرنا چاہیے۔

حمص میں وہ اپنے گھر میں اتر گئی، یہاں اس کے چند رشتے دار دوں نے خوش آمدید کہی۔ اس کے باپ کی رشتے کی ایک بہن اور اس کے شوہر نے منیزہ کو محبت اور عزت سے اتارا اور اس کی خاطر مدارات میں لگ گئے منیزہ کو وہ دمشق، عامر اور ہارون کی یاد ستانی رہتی۔ دمشق جہاں اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ عامر جس پر اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا ہارون جو اس سے بہت دور خراسان میں بیٹھا تھا۔ وہ حمص کی فضا میں چھاتے ہوئے بادلوں کو حسرت سے تکتی رہتی۔ ان کالے کالے اور بھورے سے باسمتی بادلوں میں بڑا کیف تھا لیکن منیزہ کا دکھی اور غم زدہ دل اس کیف کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ وہ شام سے ذرا پہلے جب دریا یا چھت سے سورشیوں کے گلے آبادی میں داخل ہوتے دیکھتی تو معلوم نہیں کیوں یہ سوچنے لگتی کہ یہی تمام مناظر اس کا شوہر ہارون بھی خراسان میں ہر شام دیکھتا رہتا ہوگا۔

ایک دن علی الصبح اس کا باپ بھی آندھی طوفان کی طرح آ گیا۔ باپ کے ساتھ ہارون کا بہنوئی بھی آیا تھا۔ اس کی نظریں منیزہ پر جو پڑیں تو وہ مسکرانے لگا اور اشاروں اشاروں میں مالی الضمیر سمجھانے لگا۔ اس سے منیزہ کو بیحد شاکی نظروں سے دیکھا اور حاجرہ سے سوال

نیزہ! کیا بات ہے تُو پریشان کیوں ہے؟ کیا ہارون کے باپ نے تجھے کو نکال دیا؟"

منیزہ نے ضبطِ غم کی بڑی کوشش کی لیکن برداشت نہ کر سکی اور آنکھوں سے آنسو بھیگنے لگے۔ "نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، میں خود ہی چلی آئی۔ ہارون کا باپ مجھے نکالتا کیوں؟"

ہمنوئی نے طنزاً پوچھا۔ "عامر کہاں ہے؟"

منیزہ نے چور کی طرح جواب دیا۔ "دمشق میں اپنے دادا کے پاس۔"

ہمنوئی نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "وہ تو میرے ساتھ آنے کے لیے ضد کر رہا تھا لیکن میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس کو اپنے ساتھ نہیں لیا کہ اس کا دادا انتہائی سے اکتا جاتا اور وہ اپنے پوتے سے بڑی محبت کرتا ہے۔"

ہمنوئی کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ بولا۔ "منیزہ! تو سچ چاہے کہہ لے لیکن میں تیری باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ ہارون کا باپ بڑا ہی موذی ہے۔ حرص و طمع کا پیکر اگر تجھے یہ بات ابھی معلوم نہیں تھی تو آج مجھ سے میری زبان سے سن لے۔"

منیزہ دم بخود کسی معصوم تماشائی کی طرح نندوئی کی صورت دیکھتی اور باتیں سنتی رہی۔

ہارون کا ہمنوئی کہتا رہا۔ "منیزہ! سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی! بخدا جب بھی تجھ کو دیکھتا ہوں، یہی سوچتا رہ جاتا ہوں کہ مقدر بھی کوئی چیز ہے، تقدیر بھی کوئی شے ہے....."

لیکن اسی وقت منیزہ کا باپ بھی آ گیا۔ اس نے ہارون کے ہمنوئی سے پوچھا۔ "کہیں میری بیٹی کو درد غلا تو نہیں کہہ رہا؟" پھر منیزہ سے پوچھا۔ "بیٹی! کیا بات ہے؟ تو ملول کیوں ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "پدرِ بزرگوار! کوئی سبب اداسی کا ہو تو بیان بھی کروں۔ ہارون سے شادی کر کے مصیبتوں کا جو دروازہ کھول چکی ہوں، اس کو بند کرنے کی قدرت میں رکھتی؟"

باپ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

ہارون کا ہمنوئی بول اٹھا۔ "مطلب کیا ہے؟ وہی مطلب ہے جس سے ہم دونوں ہی واقف ہیں۔ اسی گھر میں اگر ہارون کا باپ نہ ہوتا تو گھر سرتاپا جنت ہوتا لیکن وہ گھر....."

منیزہ رونے لگی، بولی "میں اس بوڑھے کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے حد کر دی"
منیزہ کے باپ نے اصرار کیا "پھر بھی ہوا کیا؟ کچھ تو بتاؤ میں اس ذلیل انسان کو ٹھیک کر سکتا ہوں"
منیزہ نے جواب دیا "اب میں دمشق واپس نہیں جاؤں گی"
ہارون کے بہنوئی نے منیزہ کے باپ سے کہا "منیزہ کے اس جواب میں کہ اب وہ واپس نہیں جاؤں گی، سب کچھ آ گیا، اس سے کچھ پوچھنا بے کار ہے"
منیزہ کے باپ نے کہا "اچھا اب تو وہ فی دمشق واپس نہیں جائے گی۔ تو حصہ میں رہے گی، ہارون بھی یہیں آئے گا اور یہیں رہے گا"
منیزہ نے اشک بار نظروں سے باپ کو دیکھ کر پوچھا "اور عامر؟ عامر رہے گا؟"
منیزہ کے باپ نے نفرت سے جواب دیا "میں نہیں جانتا کہ عامر کہاں رہے گا؟ وہ ہمارے ساتھ یا تیرے پاس نہیں رہے گا" پھر ہارون کے بہنوئی سے کہا "تو کچھ دیر کے لیے باہر چلا جا، میں منیزہ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں"
وہ باہر چلا گیا، منیزہ کے باپ نے آہستہ سے کہا "یہ تو بار بار عامر کا نام کیوں لے رہی ہے، یاد رکھ وہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔ ہارون کا باپ اپنے پوتے کو سکھا پڑھا کر تیرے خلاف کر رہا ہے، افسوس کہ تو اولاد سے محروم ہے اور تیرا مستقبل تیری اولاد ہی محفوظ و روشن رکھے گی، ورنہ کچھ بھی نہیں، تم دونوں، ہارون اور تم کسی وقت بھی ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہو"
منیزہ ان باتوں کا کیا جواب دیتی لیکن باپ کی باتوں نے اس کے دل میں اپنے کی شدید خواہش کا ایسا چراغ روشن کر دیا جو اپنی پوری آب و تاب کی گرمی سے اس کے پورے وجود کو پگھلائے دے رہا تھا۔
منیزہ کے باپ نے دبے دبے لہجے اور اخباروں کنایوں میں پوچھا "منیزہ مجھے اولاد سے محرومی کے پیچھے کوئی سازش، کوئی خاص منصوبہ کارفرما نظر آتا ہے، ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو لیکن میرے اس خیال کی روشنی میں تجھ کو غور و فکر کرنا ہوگا اور ہارون کی کوشش کرنا ہوگی"
منیزہ کوئی جواب دیے بغیر باپ کے سامنے سے ہٹ گئی لیکن تنہائی میں لیٹ کر اس نے ہارون کی خلوتوں کا بڑی دیانت داری سے جائزہ لیا اور ان لمحوں کو سمیٹ لیا جہاں ہا

دں سے کام لے کر انتہائی نازک، خاص اور لطیف موقعوں پر خود کو بہ عجلت منیزہ سے
ر لیا تھا اور یہی وہ قیمتی اور نازک لمحے ہوتے تھے جن میں اسے اولاد مل سکتی تھی۔
وہ ہارون کے اس فعل کو کوئی خاص اہمیت نہیں دینی تھی لیکن اب وہ ماضی کے اس
یں تو اتر اور پابندی محسوس کر کے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس خوف نے غصے اور اشتعال
ں اختیار کر لی اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ایسا نہیں ہونے دے گی اور
حاصل کر کے رہے گی۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی اس فکر میں تھا کہ وہ کسی طرح ہارون اور منیزہ میں
فات پیدا کرا دے۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتا جب وہ منیزہ سے تخلیے
ند باتیں کرے۔

منیزہ کے باپ کا خلافت کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اس کو دمشق میں طلب کر لیا گیا تھا
ں بلاوے کو ٹالی رہنا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے خطرناک نتائج بھی
سکتے ہیں۔ اس نے کوشش کی کہ ہارون کے بہنوئی کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا جائے لیکن اس
ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ آخر مجبور ہو کر اس کو اپنی بیٹی کو سمجھانا پڑا، کہا۔
زہ! میری بیٹی! میں چند دنوں کے لئے دمشق جا رہا ہوں، ہارون کا بہنوئی یہیں رہے
ا اچھا ہوتا کہ یہ بھی میرے ساتھ ہی چلتا۔"

منیزہ خاموش رہی، اس کا باپ کچھ توقف کے بعد مزید بولا۔" لیکن میں اس کو ساتھ
پر مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا مخلص ہے۔ اس لیے اگر وہ میری عدم موجودگی میں
ں رہ جائے تو میں اسے منع بھی نہیں کر سکتا۔"

منیزہ باپ کی صورت دیکھنے لگی کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ باپ کہتا رہا۔" لیکن
ل تو یہ ہے کہ ہارون اپنے بہنوئی سے خوش نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ تجھ سے شادی
چاہتا تھا اور اگر ہارون ذرا بہ تاخیر پہنچتا تو آج ہارون کے بجائے اس کے بہنوئی
یوی ہوتی۔ بس اس واقعے نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔..."

منیزہ نے کہا۔" باوا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دیجئے
ا پھر اکیلے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

باپ نے جواب دیا۔" میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو ہارون کی بیوی ہے، ہارون
ی وقت بھی آ سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب ہارون یہاں آئے تو اپنے بہنوئی کو تیرے
گرد دیکھ کر مشتعل ہو جائے تو محتاط رہ۔ بالکل اس طرح جیسے ہارون بھی یہیں کہیں موجود

ہے اور وہ تیری حرکات و سکنات پر نظریں رکھے ہوئے ہے۔"

منیزہ نے کہا۔" میں جانتی ہوں، پھر بھی مزید خیال رکھوں گی۔"

منیزہ کا باپ دمشق چلا گیا۔ ہارون کا بہنوئی اس گفتگو سے لاعلم تھا اس لیے نے ایک اور ہی منصوبہ بنا لیا تھا۔ وہ ابھی تک منیزہ کی طرف سے مایوس نہیں ہوا تھا لیکن مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ منیزہ اس سے بچتی پھر رہی تھی۔ اس کو کوئی ایسے موقعے ملے جب منیزہ کو ورغلا سکتا تھا لیکن منیزہ نے ان موقعوں کو ضائع کر دیا۔

منیزہ علی الصبح اٹھ کر نماز پڑھتی اس کے بعد کچھ دیر تلاوت میں لگاتی پھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتی لیکن ایک دن اس کے معمولات میں فرق آ گیا۔ نرسل نے دن سے پریشان کر رکھا تھا، وہ اس کو ٹال رہی تھی لیکن ایک دن وہ بستر پر گر گئی۔ بھی ہو گیا، رات بھر نیم مدہوشی میں معلوم نہیں کیا بڑبڑاتی رہی۔ ہارون کے بہنو اس کے قریب جانے کا موقع مل گیا۔ صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی۔ بہنوئی اس کے سرہا کھڑا ہوا، پوچھا۔" منیزہ! اب کیسی طبیعت ہے؟"

منیزہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا اور اپنے سامنے اسے دیکھ کر بیٹھ گئی، پوچھا۔" آپ یہاں کب آئے؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔" منیزہ! میں تیری مجبوریوں سے واقف ہوں لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تو جتنی مجبور نہیں ہے، اس سے زیادہ مجبور ظاہر کر رہی ہے۔ خول سے باہر آ جانا چاہیے۔"

منیزہ نے جواب دیا۔" بھائی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ نہ میں خود کو مجبور محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی میں نے اپنے آس پاس کوئی خول چڑھا رکھا ہے جو اس باہر آ جاؤں۔"

بہنوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا، شوخی سے بولا۔" مجھے تو جھوٹ بول کر دھوکہ میں مزہ آنے لگا ہے۔"

منیزہ نے مختصراً کہا۔" یہ آپ کی سوچ کا کرشمہ ہے ورنہ میں بالکل بشاش مطمئن ہوں۔"

بہنوئی نے کہا۔" منیزہ! میں تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

منیزہ نے جواب دیا۔" بھائی! پھر بھی باتیں کر لینا، مجھے اچھا ہو جانے دو۔"

بہنوئی نے منہ بنا کر کہا۔" ان باتوں کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا

منیزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا، بولی "جو بات کرنی ہو
ر آجلدی کر لیں کیونکہ طبیعت باتیں کرنے یا سننے پر راغب نہیں ہو رہی۔"
بہنوئی نے پوچھا "منیزہ! تم سچ سچ بتاؤ کیا تم موجودہ حالات سے خوش اور
ن ہے؟"
منیزہ نے جواب دیا "اگر ہارون میرے پاس ہوتا تو میں خوش بھی ہوتی اور مطمئن
لیکن اس کی عدم موجودگی میں خوشی اور اطمینان کا اقرار نہیں کر سکتی۔"
بہنوئی تلملا گیا بولا "تو غلط بیانی سے کام لے رہی ہے، کیونکہ میں کیا جو بھی تجھے
ے جانتا ہے خوب سمجھتا ہے کہ تو بالکل ناخوش اور غیر مطمئن ہے اور اگر ہارون
پاس بھی ہوتا تب بھی موجودہ کیفیت برقرار رہتی۔"
منیزہ نے کہا "بس یہی بات کہنا تھی یا کچھ اور بھی؟"
بہنوئی سخت مایوس ہوا بولا "پہلے تو اس کا اقرار کر کہ تو نے میری بات کے جواب
کچھ کہا، وہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔ اس کے بعد میں چند اہم مگر کام کی باتیں کروں گا۔"
منیزہ نے بڑی سنجیدگی اور مضبوط لہجے میں جواب دیا "بھائی! میں تمہیں کس
یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں سچ سچ کہہ رہی ہوں۔ میں جھوٹ کیوں بولوں
ہاں اگر تم میری زبان سے وہی سب سننا چاہتے ہو جو یہ جبر کہلوانے پر مصر ہے تو میں
خوش کرنے کے لیے کہے دیتی ہوں کہ میں ناخوش بھی ہوں اور غیر مطمئن بھی۔ اب
کیسے کچھ؟"
بہنوئی نے کہا "اگر ہارون اور تمہارے درمیان ہارون کا باپ اور عامر موجود
رہتے تو میں یقین سے کہہ سکتا کہ تم دونوں بہت خوش و خرم ہو لیکن ایسا ہے نہیں
لیے میں۔۔۔۔"
منیزہ نے جواب دیا "بہرحال میں بہت مطمئن اور خوش ہوں، جو تھوڑی
رنجشیں آ بھی گئی ہیں ہم دونوں کے دل و دماغ میں تو وہ چند دنوں کے ساتھ ہی
جائیں گی۔"
بہنوئی نے کہا "لیکن میں اسے ناممکن سمجھتا ہوں۔ منیزہ! اگر تو نے اپنے
ں ہاں میں ہاں نہ ملائی ہوتی تو آج تو میری بیوی ہوتی اور ٹھاٹھ کی زندگی گزار
ہوتی۔"
منیزہ نے جواب دیا "اے بھائی! یہ ٹھاٹھ کی زندگی کیا شے ہوتی ہے؟ مجھے

کیسے معلوم ہو؟"

بہنوئی نے ہنس کر کہا: "تو ہارون سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے اچھا خود میری باتوں کا جواب مل جائے گا۔"

منیرہ غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ طیش میں بولی: "بھائی! یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے، اگر تم سے شادی کرنا ہوتی تو ہارون سے شادی کیوں کرتی؟ میں ہارون سے کرتی ہوں۔"

بہنوئی نے طنز کیا: "محبت کو فنی ہے ہارون سے! خوب۔ منیرہ یا تو تو مجھ کو بنا رہی ہے یا پھر تو بہت سیدھی سادی لڑکی ہے، کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں ہارون سے نالاں ہے۔ اس کے باپ اور بیٹے سے تو پریشان اور عاجز ہے اور یہ تنہا تیری آمد اور موجودگی اس کی گواہ ہے کہ تو ہارون سے دل برداشتہ ہو چکی ہے تو نے کبھی اس سے محبت کی ہو لیکن فی الحال تو ہارون سے متنفر ہے یہ بات میں یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔"

منیرہ نے پریشان ہو کر کہا: "میرے پاس تمہاری فضول باتوں کا کوئی جواب نہیں تم یہاں سے چلے جاؤ تاکہ میں کچھ دیر آرام کر لوں۔"

بہنوئی نے ہنس کر جواب دیا: "اور میں بھی اس وقت تک یہیں موجود رہوں گا جب تک تو اپنے خول سے باہر نہیں آجائے گی۔"

منیرہ چڑ کر بیٹھ گئی۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بولی: "میرا سر درد کر رہا ہے خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو بھائی! ورنہ میں دیوار سے سر ٹکرا لوں گی۔"

اتنے میں منیرہ کی بھوپی بھی آگئی۔ اس نے منیرہ کو بستر پر بیٹھے جو دیکھا ہی سے پوچھا: "کیا بات ہے منیرہ! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

بیچ میں بہنوئی بول پڑا: "منیرہ کی طبیعت خراب ہے اور میں بڑی دیر سے یہ رائے دے رہا ہوں کہ کسی طبیب سے رجوع کرے لیکن یہ آمادہ ہی نہیں ہوتی۔"

پھوپی نے کہا: "یہ ٹھیک تو کہتا ہے تجھ کو اس کا کہنا مان لینا چاہیے منیرہ! زیادہ دنوں تک دبائے رکھنا خطرناک بات ہے۔"

منیرہ نے جھنجلا کر کہا: "پھوپی جان! آپ بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں۔"

پھوپی نے جواب دیا: "معقول بات ہوگی تو ہر شخص ہاں میں ہاں ملائے گا۔"

بہنوئی نے پھوپی سے کہا۔ "میں طبیب کو لاتا ہوں، آپ منیزہ کو حکم دیں کہ یہ اس
ھانے میں چون و چرا نہ کرے۔"
پھوپی نے سختی سے کہا۔ "تو طبیب کو بلا لا، میں دیکھوں گی یہ علاج کس طرح
ں کرتے گی۔"
بہنوئی طبیب کے پاس چلا گیا اور منیزہ نے کچھ کا سانس لیا۔ وہ ہارون کے
ی کو اتنا خبیث نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ جب ہارون واپس آجائے
ں کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گئی کہ اس کا نتیجہ بہت
نکلے گا۔
کافی دیر بعد جب واپس آیا تو طبیب تو اس کے ساتھ آیا نہیں، ہاں چند روایتیں
اس کے ہاتھ میں تھیں، انہیں منیزہ کی طرف بڑھا دیا، بولا۔ "منیزہ: میں نے بیر احمال کچھ
یب سے یہ روایتیں لے لی ہیں۔ اب تو کیسی ہے؟"
منیزہ نے بیزارس سے جواب دیا۔ "بھائی! تم نے بلاوجہ زحمت کی اب میں بالکل
ب ہوں۔"
بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ پھوپی کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بولا۔
زہ! میں تجھ سے جو کچھ چاہتا ہوں، یہ تو تو بھی طرح یقین کر لے کہ ہارون کا باپ ہمیشہ
سرپرست رہے گا۔ کل عامر بھی بڑا ہو جائے گا اور ایک نہ ایک دن عامر بھی مصیبت بن جائے
یہ بات کہ تو خود صاحب اولاد ہو جائے، ناممکن ہے۔ ہارون ایسا کبھی بھی نہ ہونے دے
ر اگر یہ غرض ہو بھی گئی تو یہ بھی ممکن ہے کہ پیدائش کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے
یال تیری آغوش تیری اپنی اولاد سے محروم ہی رہے گی۔" پھر وہ اور زیادہ بے شرمی پر اتر
چھا۔ "ہارون نے اب تک یقیناً منزل کیا ہو گا؟"
منیزہ پھر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غصے میں کانپتا ہاتھ بلند کر دیا، بولی۔ "بے شرم
ان! تو اسی وقت دفعہ ہو جا نظروں سے ورنہ کوئی بدترین حادثہ رونما ہو جائے گا۔"
لیکن بہنوئی بھی آسانی سے زیر ہو جانے والا شخص نہیں تھا مسکراتا ہوا بولا۔ "منیزہ
اعرض مند ہوں اس لیے یہ فرقت بھی برداشت کر لوں گا۔ میں انتہائی خلوص سے تجھ کو یہ
سمجھانا چاہتا ہوں کہ تو ہارون اور اس کے حالات کو سمجھنے میں سخت غلطی کر رہی ہے۔
ابھی تک تو جس جگہ کھڑی ہے وہاں سے واپسی آسان ہے لیکن اگر تو نے ہوش مندی سے
نہ لیا اور آنکھیں بند کیے اسی راہ پر چلتی رہی تو بدقسمتی سے وہ دن بھی آجائے گا۔

جب تو واپس نہیں جائے گی اور ساری زندگی خجالت اور ندامت میں گزار دے گی۔"

منیزہ نے پیچ میں کھڑے بہنوئی کو دھکا دے کر راہ سے ہٹا دیا، بولی "میرا چھوڑ دے اور خبیث انسان! تو جو کچھ کہہ رہا ہے یا جو کچھ مزید کہے گا میں نہیں سنوں گی اور ہاں دن کو تیری بادہ گوئی سے آگاہ کر دوں گی پھر وہ دے گا تیری باتوں کا صحیح جواب کہ تو انتہائی غلط انسان نکلا۔"

منیزہ بھاگ کر پھوپی کے پاس چلی گئی۔ بہنوئی کچھ دیر کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر وہ بھی مایوس ہو کر باہر چلا گیا۔ اب اس کو ایک فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا اگر منیزہ نے یہ جب کچھ ہاردن کو بتا دیا تو کیا ہو گا؟ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

اور آخر کار یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ اس سے انکار کرے گا لیکن اگر انکار کرے گا تو وہ ہاردن کا مقابلہ کرے گا اور اس مقابلے میں وہ ہاردن کو شکست دینے کی کوشش کرے گا۔

دوسری طرف منیزہ کو اب تنہائی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اور وہ دل کی گہرائیوں سے دعا مانگ رہی تھی کہ خدایا تو باپ کو دمشق سے واپس بلوا دے ورنہ باپ ہی کو واپس بلا لیا جائے۔

یہ دعا اس طرح مقبول بارگاہ ہوئی کہ دوسرے ہی دن اس کا باپ آ گیا۔ باپ کو دیکھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا اور اس کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ باپ نے اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا "بیٹی منیزہ! کیا ہوا کیا؟ یہ تو رو رہی ہے۔ خیریت تو ہے؟"

منیزہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے جواب دیا "باباجان! میں آپ کی نصیحتوں کو یاد کر رہی ہوں جو آپ دمشق جانے سے پہلے کر رہے تھے۔ اس عمر میں اب میں نے یہ سمجھا بزرگوں کو شاید آنے والے واقعات کا قبل از وقت ہی علم ہو جاتا ہے۔"

باپ نے پوچھا "کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟"

منیزہ نے جواب دیا "نہیں، ابھی تک تو نہیں۔"

باپ نے سنجیدگی سے منیزہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "کوئی بات بھی نہیں ہونی بزرگوں کو آنے والے واقعات کا قبل از وقت علم بھی ہو جاتا ہے۔ اب تو فضول نہ گھبرا، میں ہوں۔" پھر کچھ سوچ کر پوچھا "منیزہ! سچ سچ بتا اس نے تجھ کو ستایا تو نہیں؟"

منیزہ روتے ہوئے بولی "باباجان! یہ شخص قابل اعتبار ہرگز نہیں۔"

باپ نے چونک کر پوچھا "تو رو کیوں رہی ہے؟" اس نے کیا کیا ہے تجھے تو جا کچھ"
منیزہ نے پرجوش آواز میں کہا "یہ کرتا کیا، اگر یہ کچھ کرتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی"
باپ نے بار بار اور مختلف طریقوں سے وہ بات معلوم کرنا چاہی جس نے منیزہ کو رلا دیا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا آخر وہ ہارون کے بہنوئی کو تلاش کرتا ہوا وہیں پہنچ گیا جہاں وہ چوروں کی طرح چھپا کھڑا تھا، منیزہ کے باپ نے طنزاً پوچھا "تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ میں تو تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں"
بہنوئی کی جان میں جان آگئی، بولا "جناب والا! آپ مجھ کو کہاں تلاش کر رہے تھے میں بڑی دیر سے کھڑا آپ کا انتظار کر رہا تھا"
منیزہ کے باپ نے منہ بنا کر ہارون کے بہنوئی پر یہ بات واضح کر دی کہ اس کا دل اس سے صاف نہیں ہے، اس لیے وہ اب اس پر اعتبار نہیں کرے گا۔ ہارون کے بہنوئی نے بھی منہ بنا کر پشت پھیری اور دل ہی دل میں کچھ کہنے میں مشغول ہو گیا۔

* * *

ہارون خراماں خراماں سے چلا تو پہلے دمشق پہنچا۔ وہاں اپنے بیٹے حامر کو سینے سے لگایا۔ حامر باپ کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور منیزہ کی شکایت کر دی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا "وہ تنہا حمص چلی گئی مجھ کو نہیں لے گئی، حالانکہ میں نے اس کی بڑی خوشامد کی تھی"
باپ کو اپنے بیٹے سے ہمدردی ہوئی۔ ابھی وہ اس سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا باپ بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور پوچھا "یہ عامر تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟"
ہارون نے جواب دیا "اپنی ماں کی شکایت کر رہا تھا"
باپ نے منہ بنا کر کہا "ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ شکایتوں میں حق بجانب ہے، میں نے بھی اس کی سفارش کی تھی کہ اپنے ساتھ لیتی جائے مگر منیزہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ کسی مرغزے حمص چلی گئی۔ تنہا، اکیلی۔ میں نے پہلی بار اس کی خود سری محسوس کی"
ہارون نے تلملا کر پوچھا "باوا جان! اس نے آپ کی بات بھی نہیں مانی؟ یعنی اس نے اتنی خود سری آگئی تھی۔ میں یہ تو معاف کر سکتا ہوں کہ اس نے عامر کا دل توڑ دیا، یہ معاف نہیں کر سکتا کہ اس نے آپ کا حکم بھی نہیں مانا"
باپ نے بچکارا پھیرا "نہیں، ہم سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے معاف کر دیا"

لیکن اس سے ہارون کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ وہ منیزہ سے سخت ناراض تھا اور دل ہ
دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ منیزہ کو سمجھائے گا، اگر وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو گئی تو کو
بات نہیں ورنہ وہ طلاق کی دھمکی دے دے گا۔

منیزہ کی سرکشی کا ایک خاص سبب بھی اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہیں یہ
تو نہیں ہے کہ اس کے بہنوئی نے کسی طرح منیزہ کو ورغلایا ہو اور منیزہ کا حمص جانا بھی کہیں
اس سلسلے کی کوئی کڑی تو نہیں۔ وہ ان الجھنوں کو اپنے دل و دماغ میں بساتے ہوئے عامر کو
کر حمص روانہ ہو گیا۔ منیزہ ان دونوں کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس وقت ہارون
بہنوئی بھی گھر ہی میں موجود تھا۔ بہنوئی نے سلام میں پہل کی اور ہارون کو سلام کہہ کے
عامر کی طرف بڑھا۔ ہارون نے سلام کا جواب نہیں دیا، تیکھے لہجے میں پوچھا: "تو تو یہاں موجو
ہے اگر میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔"

بہنوئی نے بڑی محبت سے عامر کو گود میں اٹھانا چاہا مگر ہارون نے عامر کا ہاتھ
کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بہنوئی سے کہا: "بہن مر گئی، میرا تیرا رشتہ ختم ہو گیا اس لئے اب
بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر۔"

بہنوئی نے زہر خند کیا، بولا: "ہارون! یہ سمجھ کہ ہوا کیا ہے؟ تو کیسی باتیں کر
ہے؟"

ہارون نے جواب دیا: "مجھ کو کچھ نہیں ہوا مگر کیا تجھ کو بھی کچھ نہیں ہوا؟"

بہنوئی نے کہا: "تو معلوم نہیں کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے۔"

اس کے بعد اس نے ایک بار پھر عامر کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی مگر ہارو
نے سختی سے منع کر دیا: "کیا میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟ میرا تیرا رشتہ ہی کیا؟ اب
دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔"

بہنوئی متحیر اور دل برداشتہ ہو کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ہارون نے
سے پوچھا: "منیزہ! تیرا باپ کہاں چلا گیا؟"

منیزہ نے لاپروائی سے کہا: "میرا باپ گویا تیرا تو کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ بازا
گیا ہے۔"

ہارون نے بڑی تیکھی نظروں سے منیزہ کو گھورنا شروع کر دیا۔ منیزہ نے ایک آ
بار اس کو اسی طرح گھورتے دیکھ لیا اور سہم گئی۔ منیزہ نے عامر کو اپنی گود میں بٹھا لیا اور
سے گھر کی نیرنگ معلوم کرتا رہا۔ ہارون نے تلخی سے کہا: "منیزہ! مجھے تجھ سے امید نہیں

کہ میرے جاتے ہی تو اتنی بدل جائے گی۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "میں خدا بھی نہیں بدلی۔ تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں بدل گئی ہوں؟"

ہارون نے کہا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے بہنوئی کا اس گھر میں کیا کام ہے؟ وہ یہاں کیوں رہتا ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "ہارون، تو شاید یہ بات بھول گیا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے یہ میرے باپ کا گھر ہے اور یہاں ہر وہ شخص آکر رہ سکتا ہے جس کو والد صاحب اپنے ساتھ رکھنا پسند کریں گے۔"

ہارون دانت پیستا ہوا بولا۔ "اگر یہ بات تھی تو مجھے اپنے باپ کو صاف صاف یہ بتا دینا چاہیے تھا کہ میں اپنے بہنوئی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ اس کو اس گھر میں دیکھ کر میں حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔"

منیزہ خاموش رہی اور محبت سے عامر کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

ہارون نے کہا۔ "افسوس کہ میں نے تجھ کو بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا اور جس پر امید کرتا تھا کہ تو مجھ سے اور میرے متعلقین سے ہمیشہ بہت اچھی طرح پیش آتی رہے گی لیکن تو نے تو عامر تک کا خیال نہیں رکھا، اسے چھوڑ کر اکیلی چلی آئی۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "ہاں، وہاں میں بہت پریشان تھی اور اس وقت تک میرے لیے میری پریشانی کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں چلی آئی۔"

ہارون نے منہ بنا کر کہا۔ "میں تیری ساری باتیں سمجھ چکا، اب تو میری بات بھی سن لے۔ میں دمشق سے یہ فیصلہ کر کے چلا ہوں کہ یا تو تو میری فرماں بردار بن کر رہے گی یا پھر میں تجھے طلاق دے دوں گا۔"

اس تلخ ترین اعلان نے منیزہ کو بدحواس کر دیا۔ اس نے جو کچھ سنا تھا، کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے نرمی سے جواب دیا۔ "فرمانبرداری؟ کس قسم کی فرماں برداری؟ کس کی فرماں برداری؟"

ہارون نے کہا۔ "مجھ کو باتوں میں نہ بہلا منیزہ! تو نے میری باتوں کا مطلب اس سے زیادہ سمجھ لیا ہے جتنا میں سمجھانا چاہتا تھا۔"

منیزہ کو غصہ تو بہت آیا ہوا تھا مگر بات ختم کرنے کے لیے وہ ہارون کے سامنے ہنس پڑی، بولی۔ "ہارون! میں محسوس کر رہی ہوں کہ اس وقت تو اپنے ہوش و حواس میں

نہیں ہے اس لیے میں اس وقت کوئی بات ہی نہیں کروں گی۔ پھر کسی وقت جی بھر کے باتیں کروں گی۔"

ہارون دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ منیزہ اپنی بھابی کے پاس چلی گئی، دوسرے کمرے تک جاتے ہوتے ایک جگہ ہارون کا ہمنوی نظر آ گیا۔ وہ شاید اس کا انتظار ہی کر رہا تھا منیزہ کا خفگی اور غم میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے پوچھا "منیزہ! کیا بات ہے؟ میرا خیال اس اجڈ انسان نے تیرا دل بھی دکھا دیا!"

منیزہ نے ڈانٹ کر جواب دیا "تو چپ ہو جا اور مجھ سے بات نہ کر کیونکہ ہارون کی ناراضی کا اصل سبب تُو ہے، ہارون تجھے ہرگز اعتبار نہیں کرتا اسی لیے وہ اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے۔"

ہارون کا ہمنوی خاموش ہو گیا۔

سہ پہر کو منیزہ کے باپ سے بھی ملاقات ہو گئی، اس نے اپنے داماد کو بڑی خوش دلی اور خلوص سے خوش آمدید کہا مگر ہارون اب بھی روٹھا ہوا نظر آتا تھا۔

منیزہ کے باپ نے کہا "میں تو تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، خدا کا شکر ہے کہ تو آ گیا!"

ہارون نے بددلی سے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس گھر میں میری مرحوم بیوی کے شوہر کا کیا کام ہے؟ اس کا رشتہ تو ختم ہو چکا۔"

منیزہ کے باپ نے بڑے سکون سے جواب دیا "ہارون بیٹے! تیرا ہمنوی کتنا ہی برا سہی لیکن یہ میدان جنگ کے اس درستے میں تھا جس میں تم خود شامل تھا۔" پھر ذرا رکے کر بولا "میں نے یا منیزہ نے تیرے ہمنوی کو تیرے ہی ذریعے پہچانا ہے اور اس گھر میں اس کی جتنی بھی قدر و منزلت ہے اس کی بنیادی سبب وہی ہے، جو میں نے بیان کر دیا۔"

ہارون نے کہا "اگر یہ بات درست ہے کہ تو نے میری مرحوم بیوی کے شوہر کے تعلق اور میرے رشتے سے پہچانا ہے تو اب اس رشتے اور تعلق کا واسطہ دے کر یہ کہہ رہا ہوں کہ اس گھر سے اس کو ہمیشہ کے لئے نکال باہر کیا جائے۔"

منیزہ کے باپ نے افسوس سے کہا "مگر کس طرح؟ اس سے تیری دشمنی کا تعلق سبب، وجہ؟"

ہارون نے جواب دیا "میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے جو کچھ کہہ دیا، اس پر عمل ہونا چاہیئے۔"

منیزہ کے باپ نے ذہن پر زور دے کر کچھ سمجھنے کی کوشش کی اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنا فیصلہ کن جواب دے مارا۔ "افسوس کہ تو میرے ہی گھر میں کچھ اس طرح باتیں کر رہا ہے گویا میں تیرا غلام ہوں اور تو میرا آقا۔ تجھ کو گفتگو کا سلیقہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ تو منیزہ کو اپنے ساتھ لے جا اور مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دے۔ میں کسی کے حکم پر نہیں چل سکتا۔"

شاہ سوار دن کو بھی اپنی تلخ کلامی کا احساس ہو گیا۔ قدرے نرمی سے بولا۔ "پدر بزرگوار میں جب بھی اپنے ہمنوئی شکیل کو دیکھتا ہوں مجھے ہمنوئی کی عیاریاں اور بہن یاد آنے لگتی ہیں، اس لیے میں اس شخص کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہتا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "کربلا کا جذبہ اور حساس انسان ہے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد کہ میں تجھ سے ....."

لیکن ہارون نے بات کاٹ دی، بولا۔ "آپ کچھ بھی کہیں مگر میں اس شخص پر اعتماد نہیں کر سکتا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "میں کب کہتا ہوں کہ تو اس پر اعتماد کر۔" اس کے بعد وہ ہارون کو باہر لے گیا، بولا۔ "میرے ساتھ چل ہم دونوں تخلیے میں باتیں کریں گے۔"

منیزہ کا باپ اسے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے باغ میں لے گیا۔ باغ میں انگور کی بیلوں کے سائبان پھیلے ہوئے تھے اور انجیر اور فالسے کے درختوں کی کثرت تھی۔ منیزہ کا باپ اس کو داکسان کے سامنے میں لے کر بیٹھ گیا اور گفتگو کا آغاز کیا۔ "ہارون! تو سوچ رہا ہوگا کہ میں تجھ کو یہاں کیوں لایا اور بات کے لیے میں نے گھر کو کیوں نہیں چنا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "ہاں، میں نے اس پر غور تو کیا ہے مگر حیران ہو کر نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بہت سی باتوں کے لیے گھر کی چار دیواری موزوں نہیں ہوتی۔"

منیزہ کا باپ ہنس دیا۔ "بالکل میرے دل کی بات کہہ دی۔ واقعی میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہ تاکستان کی خلوت بہترین جگہ ہے۔"

ہارون نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "آپ لوگ سنسنی خیز باتوں کے عادی ہیں یا پھر سیدھی سی بات یہ ہے کہ میرے ہمنوئی کا جادو کام کر گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں منیزہ سے قطع تعلق کر لوں اور آپ منیزہ کو میرے ہمنوئی کے حوالے کر دیں۔"

منیزہ کے باپ نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور گھبرا کر کہنے لگا۔ "خدا ایسی کوئی

بات نہیں۔ میں تو تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شادی کے کتنی سال بعد بھی تو لاولد کیوں ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "یہ سوال تو خدا سے کیجئے۔ اولاد دینا یا نہ دینا تو اسی کے اختیار میں ہے۔"

منیزہ کے باپ نے ایک دم جھنجلا کر کہا۔ "میں خدا سے جو پوچھنا ہوں گا پوچھوں گا اس سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب جو میں پوچھوں گا اس کا تعلق تجھ سے اور منیزہ سے ہوگا اور تجھ کو اس کے جوابات دینا پڑیں گے۔"

ہارون نے کہا۔ "جو کچھ بھی پوچھنا ہے جلد از جلد پوچھ، ورنہ شاید اس کا بھی موقع ہی نہ آئے اور میں واپس چلا جاؤں۔"

منیزہ کے باپ نے کہا۔ "منیزہ کب تک تیرے بیٹے عامر کی پرورش کرتی رہے گی وہ اپنے بچے کی پرورش کب کرے گی؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "جب تک عامر بڑا نہیں ہو جاتا تیری بیٹی اس کی پرورش کرتی رہے گی جس دن یہ خود ماں بن جائے گی تو اپنے بچے کی پرورش بھی کرے گی۔"

منیزہ کے باپ نے ذرا تو درد سے کہا۔ "وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ دن کب بنے گی؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "جب خدا چاہے گا۔"

منیزہ کے باپ نے کہا۔ "اس میں خدا کو تو کیوں شامل کر رہا ہے، کیا یہ جھوٹ ہے تو اپنے عامر کی خاطر میری بیٹی کو اولاد سے محروم رکھے ہوئے ہے؟"

ہارون ذرا جھجکا کیونکہ اس کا چور پکڑا گیا تھا، نرمی سے بولا۔ "یہ جھوٹ ہے، یہ کس نے بتائی آپ کو؟"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "یہ جھوٹ نہیں ہے، اگر درمیان میں عامر نہ ہوتا تو آج میری بیٹی کی گود میں بچہ ضرور ہوتا۔"

ہارون نے غصہ ظاہر کیا۔ "یہ ساری الزام تیرے بھتیجی کی طرف سے ہوں گے اس میں انہیں کسی قیمت پر بھی بد دیانت نہیں کر سکتا۔"

منیزہ کے باپ نے بھی سختی سے کہا۔ "ہارون! تو نے مجھ پر احسان کیے تھے، میں اس کا یہ صلہ دیا کہ اپنی بیٹی کو عین اس وقت تیرے حوالے کر دیا جبکہ وہ کسی اور کے دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اب تجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ تو اپنے بیٹے عامر کی خاطر میری بیٹی کو

سے محروم رکھے۔ میں زیادہ بے بس نہیں اختیار کروں گا لیکن تجھے یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں، ایک ایک بات۔"

ہارون نے پوچھا "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ذرا کھل کر کہیئے۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا "یہ کہ اب تم اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مجھ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تو منیزہ کو چاہتا ہے یا نہیں، اگر تو منیزہ کو واقعی چاہتا ہے تو تو اس کو اداس دے، دولت و شہرت واپس چلا جا اور عامر کو اپنے ساتھ لیتا جا۔"

ہارون نے کہا "یہ فیصلہ تو سی شرط ہے، میں منیزہ کو لینے آیا ہوں۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا "منیزہ تیرے ساتھ جائے گی اور ضرور جائے گی لیکن اسی وقت جبکہ اس کی گود میں اس کا اپنا بچہ بھی ہو گا۔ تو اس وقت تک محض ہوس ہی ہوس ہے گا۔ جب تک کہ عامر کے علاوہ ایک اور بچے کا بھی باپ نہیں بن جاتا۔"

ہارون نے کہا "مجھے کب تک یہاں رہنا ہو گا؟"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا "سال بھر، دو سال، تین سال۔ جب تک تو منیزہ کے بچے کا بھی باپ نہیں بن جاتا۔"

ہارون نے کہا "یہ تو بڑی بری شرط ہے، میں منیزہ کو جبراً لے جاؤں گا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا "اگر جبراً لے جا سکتے ہو تو ضرور لے جاؤ ورنہ یہ اتنی آسان بات بھی نہیں ہے۔"

ہارون نے کھڑے ہوتے ہوتے پوچھا "تو آپ اتنی سی بات کے لیئے یہاں لائے تھے مجھے؟"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا "تیرے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے تو ہو اکرے میں اس کو بہت بڑی بات سمجھتا ہوں۔"

ہارون نے کہا "منیزہ میری بیوی ہے، آپ اس کو اس کی مرضی کے خلاف نہیں روک سکتے، میں اس سلسلے میں پہلے منیزہ سے بات کروں گا اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔"

منیزہ کے باپ نے کہا "تو منیزہ سے بھی بات کر لے۔ میں نے کب منع کیا ہے۔"

وہ دونوں چپ چاپ اٹھے اور گھر کی طرف چل پڑے۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی راستے میں کوئی بات نہ کی۔

منیزہ کے باپ کو اس وقت بڑی شرمندگی ہوئی جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ منیزہ اور ہارون کا یہ ہنوز دونوں کمرے میں تنہا باتوں میں مشغول ہیں، عامر باہر کھڑا باپ کا انتظار کر رہا تھا۔ منیزہ کے باپ نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر ہارون نے اس کو پکڑ لیا اور سرگوشی میں کہا "اس طرح نہیں پہلے ان دونوں کی باتیں سن لی جائیں کیونکہ میں اپنے شبہات کو یقین میں بدل دینا چاہتا ہوں، اگر ان دونوں میں کسی قسم کے عہد و پیمان ہو رہے ہیں تو مجھ کو کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیئے"

منیزہ کا باپ بہت شرمندہ تھا، بولا "لیکن رسول اللہ نے کسی کی جستجو کرنے سے منع کیا ہے"

ہارون نے جواب دیا "لیکن میں کسی کی جستجو کر نہیں رہا ہوں میں تو اپنی ہونی کی باتیں سننا چاہتا ہوں"

منیزہ کے باپ نے کہا "ہارون! اگر تیرا شبہ یقین میں بدل گیا تو میں تیرا ساتھ دوں گا کیونکہ میں ایک غیرت مند باپ ہوں اور میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ منیزہ ہم دونوں کو دھوکا دے"

ہارون نے اپنے شسر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "خاموش رہیئے، ہماری سرگوشی کی آواز کہیں اندر تک نہ پہنچ جائے"

یہ دونوں دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے لیکن منیزہ کے باپ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

اندر آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ہارون کا ہنوز کہہ رہا تھا "منیزہ! بات بگڑنا نہیں چاہیئے۔ میں ہارون کا ہنوز مدت ہوئی چکا ہوں اس لئے میں ہارون سے بھی محبت رکھتا ہوں۔ ہاں، اس سے ضرور اختلاف ہے کہ اس نے ایک سازش کے ذریعہ تجھ کو اور مجھ کو محروم کر رکھا ہے"

منیزہ نے افسردہ لہجے میں جواب دیا "لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں میں اسی پر یقین رکھتی ہوں لیکن میں ہارون کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی اور پھر وامر تو میرا اپنا ہی بیٹا ہے"

باہر منیزہ کے باپ کا دھڑکتا ہوا دل کسی حد تک قابو میں آگیا وہ جو کچھ سن چکا تھا، اس سے وہ ایک بڑی شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ لیکن دل میں کہیں یہ چور اب بھی موجود تھا کہ کہیں وہ دونوں ایسی باتیں نہ کرنے لگیں جو اس کے

یہاں سننا نہیں چاہتے۔ منیزہ کے باپ نے ہارون کو فاتحانہ انداز میں دیکھا، بولا "میں
ہیں دونوں کی باتیں، درست ہیں تو ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں آج میرے چہرے پر سیاہی نہ پت جائے"
ہارون نے کہا "ذرا توقف سے کام لیجئے۔ ابھی دستک نہ دیجئے گا"
لیکن اندر والوں کو ان کی آہٹ مل چکی تھی۔ اندر سے دروازہ کھل گیا اور دونوں
ارون اور منیزہ کے باپ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔
منیزہ نے پوچھا "یہ آپ دونوں یہاں چوروں کی طرح کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟"
ہارون نے جواب دیا "یہی سوال میں تجھ سے کر سکتا ہوں کہ منیزہ! یہ تم دونوں
چوروں کی طرح اندر بند ہو کر کیسی باتیں کر رہے تھے؟"
دونوں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہارون کے ہمنوائی نے کہا "ہم دونوں تخلیے
ہیں موجود تو ضرور تھے لیکن باتیں تخلیے کی نہیں ہو رہی تھیں"
منیزہ البتہ منہ زور تھی باپ سے بولی "آپ دونوں اتنی جلدی واپس آ گئے؟"
ہارون نے طنزاً کہا "ہاں، حالانکہ تو سمجھ رہی ہو گی کہ ہم دونوں آدھا دن گزار
کر واپس آئیں گے"
منیزہ کھسیانی ہو گئی تھی، بولی "نہیں، میں ایسا نہیں سمجھ رہی تھی"
ہارون نے اپنے ہمنوائی اور منیزہ کے باپ سے کہا "آپ دونوں باہر چلے جائیں
میں منیزہ سے فیصلہ کن باتیں اسی وقت کر لینا چاہتا ہوں"
منیزہ کے باپ نے جواب دیا "لیکن اس کا خیال ہے کہ میری بیٹی نے تیرے ہمنوائی
سے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس کا تو طعنہ دے یا جواب طلب کرے۔ ہاں وہ تخلیے
میں باتیں کرنے کی البتہ گناہ گار ہے"
ہارون کے ہمنوائی نے اعتذار کے لہجے میں کہا "ہارون! تخلیے میں میں ہی لایا
تھا اور نہ منیزہ نہیں آئی تھی، اس لیے اس سلسلے میں منیزہ کو لعن طعن نہ کرنا"
ہارون نے جواب دیا "منیزہ میری بیوی ہے، میں اس سے جو بھی باتیں کروں گا
تم لوگوں کی رہنمائی اور مشوروں کے بغیر کروں گا"
منیزہ کا باپ ہارون کے ہمنوائی کو لے کر چلا گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا "تو نے یہ اچھی
بات نہیں کی۔ تو نے ہارون کو بلاوجہ شک و شبہے میں ڈال دیا"
اندر ہارون نے جب دروازہ بند کرنا چاہا تو منیزہ نے خوفزدہ ہو کر کہا "دروازہ
بند نہ کر، کیا کھلے کمرے میں باتیں نہیں ہو سکتیں؟"

ہارون نے منیزہ کی خواہش پر کمرے کو بند نہیں کیا، بولا "تو مجھ سے خوفزدہ
منیزہ نے جواب دیا "نہیں تو"
ہارون نے کہا "نہیں، تو مجھ سے خوفزدہ ہے۔ کیونکہ تو کمرے کو اندر سے بند
میں خوف محسوس کر رہی ہے"
منیزہ نے موضوع بدل دینا چاہا "ہارون! مجھے جو باتیں کرنا ہیں وہ کرنے کا
سے کچھ حاصل نہیں"
ہارون نے جواب دیا "منیزہ! بات دراصل یہ ہے کہ اگر ہم دونوں تنہا
اور کسی کو اپنے معاملات میں دخل دینے کا موقع نہ دیں تو ہم دونوں زیادہ خوش رہ
گے۔ کم از کم میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں"
منیزہ نے جواب دیا "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگوں نے تو ازراہ ہمد
بس یہ کہا ہے کہ میرے ساتھ جو زیادتی ہو رہی تھی اس سے مطلع کر دیا اور اس سے یہ
یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خاندان کے لوگ بہت ضروری ہیں کیونکہ یہ لوگ غلطیوں اور کو تاہیو
نشاندہی کر کے نادیدان پر قائم نہیں رہنے دیتے"
ہارون نے کہا "اپنے اپنے تجربے ہیں۔ کوئی بات ایک کو نقصان پہنچاتی ہے تو
کے لیے سود مند ثابت ہوتی ہے"
منیزہ نے کہا "اب کام کی بات کر، تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"
ہارون نے پوچھا "کس سلسلے میں؟ کس بات کا فیصلہ؟"
منیزہ نے جواب دیا "سبھی لوگ معترض ہیں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی
اولاد سے محروم کیوں ہوں"
ہارون کو بیاروں طرف سے ایک ہی بات سننا پڑ رہی تھی۔ وہ بوکھلا گیا "
تو نے اس کا کیا جواب دیا؟
منیزہ نے کہا "میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، جواب تو تجھے دینا ہے"
ہارون نے کہا "لیکن جب تو نے عاصم کو اپنا بیٹا مان لیا ہے تو پھر اس پ
اصرار کیوں؟"
منیزہ نے جواب دیا "اپنی اولاد کی بات ہی کچھ اور ہے۔ میں اپنا بچہ چ
ہوں، اپنی اولاد"
ہارون نے تھکے تھکے لہجے میں کہا "منیزہ! لوگوں کے دماغ میں نہیں آتا

ورنہ بیٹے ہے کہ ہم دونوں کے تعلقات میں خوشگواری اسی وقت تک ہے جب کہ تُو اپنے بچّے کی ماں نہیں بن جاتی۔ تو اس بات کو سمجھ نہیں رہی ہے، لوگ وہ سب نہیں دیکھ سکتے جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔"

منیزہ نے اٹل لہجے میں کہا۔" لیکن میں بچّہ چاہتی ہوں، اپنا بچّہ، جو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہو، جسے میں نے اپنے خون سے پالا ہو۔"

ہارون نے کہا۔" اگر میں انکار کر دوں تو؟"

منیزہ نے جواب دیا۔" تب پھر میں عامر کو بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔"

ہارون ایک دم چونک پڑا۔" تو عامر کو اپنے پاس نہیں رکھے گی، کیوں؟"

منیزہ نے جواب دیا۔" سچائی تلخ ہوتی ہے۔ میں اور تقریباً سبھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عامر کی وجہ سے اولاد سے محروم ہوں اور یہ بھی ایک حقیقت بھی ہے اس لیے میں اپنی بے اولادی کے سبب کو دور کر دوں گی۔"

ہارون نے حیرت سے رک رک کر کہا۔" لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو تُو عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی۔"

"ہاں، میں عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی اور ہمیشہ اس کو اپنا بیٹا سمجھا بھی ہے لیکن میں اپنے حقیقی بیٹے کی خواہش میں عامر کی جدائی گوارا کر لوں گی۔"

ہارون نے کہا۔" منیزہ! تو جو فیصلہ بھی کرے یہ سوچ کر کہ اگر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے تو تو آسانی سے بھگت لے۔"

منیزہ نے جواب دیا۔" ہارون! میں نے اس سے زیادہ سوچ رکھا ہے۔ میں اس وقت تک تجھ سے دور رہوں گی جب تک کہ میں تیرے بچّے کی ماں نہ بن جاؤں۔ میں تجھ کو اپنے ساتھ رہنے کا ایک ماہ دوں گی، اس کے بعد تو چلا جائے گا اور اس وقت تک تو میرے پاس نہ آئے گا جب تک کہ میں ایک بچّے کی ماں نہ بن جاؤں۔"

ہارون نے پوچھا۔" اگر میں تجھ کو بالوں کر کے چلا جاؤں تو؟"

منیزہ نے جواب دیا۔" تو اس صورت میں، میں تیرا دو سال انتظار کروں گی کہ شاید تو اپنا فیصلہ بدل دے اور میری خواہش کے احترام میں عامر کو ایک بھائی یا بہن عطا کر دے۔"

ہارون نے پوچھا۔" اور اگر میں دو سال بعد بھی اپنے فیصلے پر قائم رہا تو؟"

منیزہ نے ایک سرد آہ بھری، بولی۔" تب پھر میں اپنی سوچ بدل دوں گا اور تجھ سے امیدیں ختم کر کے تیری جگہ کسی اور کو دینے کی کوشش کروں گی۔"

ہارون نے افسوس سے کہا "منیزہ! افسوس کہ میں آج تک اس غلط فہمی یا
فہمی میں رہا کہ ہم دونوں میں ایک مثالی محبت پائی جاتی ہے، یعنی ہم دونوں کی روحیں
کے لطیف جذبوں سے سرشار ہیں لیکن اس وقت یہ سن کر بڑا دکھ پہنچا کہ تو میری جگہ
اور کو بھی دے سکتی ہے"

منیزہ نے خشک لہجے میں جواب دیا "افسوس کہ ابھی تک میں بھی اسی خوش
میں تھی لیکن جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ تیری نظر میں عامر مجھ سے زیادہ اہم ہے تو
ٹوٹ گیا اور میں مایوسیوں کے گہرے سمندر میں بیٹھتی چلی گئی اور مجھ کو مجبوراً یہ فیصلہ
پڑا جس کا ابھی ابھی میں نے ذکر کیا ہے"

ہارون اپنے مقدمے کو بہت مضبوط سمجھ رہا تھا مگر جب دلائل اور برابر
جنگ چھڑی تو وہ شکست کھا گیا، شکست فاش۔ اس نے بے دلی سے پوچھا "تو یہ تیرا
اور آخری فیصلہ ہے کہ اولاد سے محروم رہ کر تو مجھ سے علیحدگی اختیار کرے گی؟"

منیزہ نے جواب دیا "میں تجھ کو اپنے ساتھ ایک ماہ رکھ سکتی ہوں اس کے بعد
فیصلہ کر دوں گی"

ہارون نے کہا "لیکن میں بھی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا، میں تجھ کو کسی بچے
بچوں کی ماں بنا کر عامر کی بدنصیبی کو آواز دینا پسند نہیں کرتا۔ میں یہاں ایک ماہ بھی کیوں
جبکہ میں یہ قطعی فیصلہ کر چکا ہوں کہ جب تک عامر جوان نہ ہو جائے میں کسی دوسرے
باپ نہیں بنوں گا"

منیزہ نے دفعتہً جذبات میں آنکھیں بند کر لیں بولی "تب پھر تو اسی وقت
جا اور دو سال تک اپنی اس غلطی پر سوچتا رہ اگر اس عرصے میں تو ندامت محسوس کرنے
اور میری گود بھی آباد کرنے پر آمادہ ہو جائے تو میں تیری واپسی پر خوش آمدید کہوں گی اور
دو سال بعد بھی تو خود کو نہ بدل سکے تو از راہ مہربانی مجھ کو طلاق دے دینا تاکہ میں آزاد
جاؤں اور اپنے بارے میں کوئی اور فیصلہ کر دوں"

ہارون نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنے دو سال بعد والے فیصلے کا بھی اسی وقت
اعلان کر دے لیکن وہ منیزہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ سب وہ یہ سوچتا کہ اس کی منیزہ
کسی اور کی آغوش میں چلی جائے گی تو وہ ایک عجیب سا کرب محسوس کرنے لگتا۔ دوسری طرف
اس کا باپ اور بیکر دونوں ہی خیالوں میں اس کو منع کر رہے تھے اور ہاتھ کے اشاروں سے
اس کو روک رہے تھے کہ خبردار جو تو نے منیزہ کو اولاد دی کیونکہ جب بھی تو ایسا کرے گا عامر

ز ہو جائے گا۔
ی طرف دل کے اندر معلوم نہیں کون یہ مشورہ دے رہا تھا کہ دو سال تک صبر
ن عرصے میں خود منیزہ کو اپنی بے جا ضد پر افسوس ہو اور شرمندگی کا اظہار کر کے
ہو جائے۔
و اس کے چہرے پر نظریں گاڑے امید و بیم کی اذیت جھیل رہی تھی۔ وہ ہارون
ر پُر امید ہو گئی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے کان
پر سننا چاہتے تھے، دل وہ مفہوم پا چکا تھا۔ ہارون کی کچھ دیر کی خاموشی اس
برداشت ہو گئی۔ بے چینی سے بولی اٹھی "ہارون! مجھے پریشان نہ کرو اور اپنے
ی آگاہ کر دو۔"
نے محبت بھری نظروں سے منیزہ کو دیکھا اور مسکرا دیا گو کہ اس مسکراہٹ میں
کا احساس بھی شامل تھا مگر اس احساس کو منیزہ محسوس نہ کر سکی۔ ہارون نے
ار لیجے میں کہا "منیزہ! افسوس کہ میں تجھ کو بے حد چاہتا ہوں اور اس پر
کہ اگر کسی وجہ سے مجھ کو تجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا پڑے تو میں زیادہ
ہوں گا۔۔۔۔"
نے بات کاٹ دی، بے اختیار بولی "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو نے اپنا فیصلہ بدل
ن اپنے بچے کی ماں بن جاؤں گی؟"
نے جواب دیا "نہیں، یہ بات نہیں، میں اپنے فیصلے پر اب بھی قائم ہوں۔
جھ سے تجھ سے جدا ہو جاتا ہوں۔ تو یہ دو سال اسی امید میں گزار دے گی کہ شاید
گئی ہو اور میں اس ہجر کو یوں برداشت کر لوں گا کہ اگر تو مجھ سے واقعی محبت
ممکن ہے کہ تو خود ہی اپنے فیصلے سے منحرف ہو جائے اور میرے پاس

ے آنکھیں بند کر لیں اور بستر پر گر گئی، بولی "تب پھر تو ہمارے اسی وقت
بعد مجھ سے ملاقات کر، لیکن میرے بارے میں ہمیشہ اس یقین پر عمل کرنا
ر کوئی سمجھوتہ کر لوں گی تو یہ تیری بھول ہو گی۔"
ایک دم کھڑا ہو گیا، بولا "اچھا منیزہ! اب میں یہاں نہیں ٹھہروں
نے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ دو سال بعد تیرے فیصلے کے بارے میں معلوم

منیزہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہارون فوراً ہی رختِ سفر باندھ دے گا۔ بولی
اگر تو چاہے تو ابھی ایک ماہ تو رہ سکتا ہے؟"
ہارون نے جواب دیا "میں نے کہہ جو دیا کہ میں اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتا
بدلنا ہی نہیں تو پھر ایک ماہ بھی کیوں رہوں؟"
منیزہ نے ہونٹ بھینچ لیے، بولی "تیری مرضی، اب میں بھی اصرار نہیں کر
ہارون کمرے سے باہر نکلا تو اپنے بہنوئی اور منیزہ کے باپ کے انداز سے
ان دونوں نے بھی اس کی باتیں سن لی ہیں۔ بہنوئی دونوں میں سے کسی ایک نے بھی
کہ اندر کیا فیصلہ ہوا؟
اس نے عامر کا ہاتھ پکڑا اور بڑے دکھ سے کہا "آؤ بیٹے دمشق چ
دادا کے پاس۔"
عامر نے معصومیت سے پوچھا "اور میری نئی ماں؟ کیا وہ نہیں چلیں گی
ہارون نے اپنے غم کو سینے میں دبا لیا، بولا "ہاں بیٹے! منیزہ نہیں آئے
یہیں رہے گی اور ممکن ہے کہ وہ اب ہمیشہ ہی یہیں رہے اور ہماری پھر کبھی ا
ملاقات ہی نہ ہو۔"
منیزہ کا باپ آگے بڑھا اور بولا "ہارون! میں تیرا انتظار کروں گا۔"
بہنوئی نے کہا "بہرحال میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا اور اس جدائی کو
رہا ہوں۔ منیزہ تیری ہے اور ہمیشہ تیری ہی رہے گی۔"
ہارون نے جواب دیا "بہرحال یہ جو کچھ ہوا یا جو کچھ ہوگا اس میں ب
کارفرما ہے۔"
بہنوئی نے کہا "اگرچہ بے شک تیرے دل میں بیٹھ گیا ہے کہ اس اختلاف
میں میرا ہاتھ کام کر رہا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں، مجھ کو معاف کر دے۔"
بعد عامر کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "یہ معصوم ان ہنگاموں میں کیوں شامل ہو؟" پھر
سوال کیا "عامر بیٹے! کیا تو ہمارے معاملات جاننا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تو
ہی رہ جائے میں تیری پرورش کر سکتا ہوں۔" پھر ہارون سے پوچھا "کیا تو
ساتھ ہی لے جائے گا؟"
ہارون نے جواب دیا "ہاں میں عامر کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"
بہنوئی نے کہا "میری طرف سے منیزہ اور تجھ کو ایک پیش کش ہے

ن نے پوچھا۔ "کون سی پیش کش ہے؟"
ی نے جواب دیا۔ "تیرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے اگر تو چاہے تو عامر
کر دے، میں اس کو بڑے پیار سے رکھوں گا، اس طرح تو منیزہ کی خواہش
ے گا۔"
ن نے پوچھا۔ "پھر؟ یعنی اس سے مجھے کیا سہارا ملے گا؟"
ی نے جواب دیا۔ "اس سے یہ سہارا ملے گا کہ تو عامر کی طرف سے بے نیاز ہو
ں رکھ سکے گا۔"
ن کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت عامر کو اپنے بہنوئی کے حوالے کر دے اور
س واپس جاتے اور رہن کر یہ خوش خبری سنا دے کہ وہ منیزہ کی ہر خواہش
نیار ہے۔
پھر اچانک اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور عامر کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس
ے کے در پر کھڑی ہارون کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ منیزہ کا باپ اور
ی دونوں ہی اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو
یہ دو بارہ گر گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

* *

ن دمشق واپس گیا اور اپنے باپ کو پوری تفصیل بتا دی۔ باپ ساری روداد
ہا، آخر میں پوچھا۔ "پھر اب کیا ہو گا، میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں۔"
ن نے جواب دیا۔ "باوا جان! میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے، آپ ہی بتلائیے
ا ہے؟"
نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "تو خراسان یا کسی اور محاذ پر چلا جائے گا، عامر کی دیکھ
ے گا؟"
ن نے کہا۔ "میں خود بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔"
نے کہا۔ "تو نے منیزہ سے کہہ دیا ہوتا کہ دو سال بعد بھی میں اپنے ارادوں پر
اس لئے جو فیصلہ کرنا ہے ابھی کر لے۔"
ون نے جواب دیا۔ "باوا جان! میں نے یہ بات کہہ دی تھی مگر اس نے کہا کہ نہیں
کو نہیں جانتی کیونکہ دو سال بعد یہ جذبات نہیں ہوں گے جو اس وقت ہیں

اور جب یہ جذبات نہیں ہوں گے تو یہ فیصلہ بھی نہیں ہوگا، اس لیے اس وقتی ہنگا
اور جذباتی فیصلے کو میں نہیں مانتی۔"

باپ نے کہا "تب پھر تو منیزہ کو طلاق دے دے اور دوسری شادی کرلے۔"

ہارون ہنس دیا "میں دوسری شادی کیوں کرلوں؟ اس کا فائدہ؟"

باپ نے جواب دیا "اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عامر کی پرورش اور نگہداشت
طرح ہوجائے گی۔"

ہارون نے کہا "اور جب یہ دوسری بیوی بھی مجھ سے اولاد کی خواہش کرے
اس وقت میں کیا کروں گا؟"

باپ پھر سوچ میں پڑ گیا، بولا "عامر کی فلاح اسی میں ہے کہ کسی اور لڑکی
سے تیری اولاد نہ ہو۔"

ہارون نے کہا "افسوس کہ میں خراسان واپس جاؤں گا، عامر کس کے پاس
اس کو کس کے پاس چھوڑ جاؤں؟"

باپ کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

ہارون کی عدم موجودگی میں اس کے بہنوئی نے بڑی کوشش کی کہ منیزہ کو
پر آمادہ کرلے لیکن وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی اس نے اپنے بھا
کہہ دیا کہ اگر یہ شخص اسی طرح باتیں کرتا رہا تو وہ دمشق میں اپنے شوہر ہارون کے
چلی جائے گی۔

ہارون نے خراسان جاتے ہوئے عامر کو اپنے ساتھ لیا کیونکہ وہ عامر کے سلسلے
باپ کو نہیں پریشان کرنا چاہتا تھا۔ وہ عامر کو لے کر خراسان کے چپے چپے میں گھوم
رہا۔ اس کو اپنے باپ سے یہی ایک معمولی سی شکایت تھی کہ وہ ہارون کو مشورہ تو ایسا
دے دیتا جن کی افادیت مسلم تھی، لیکن اس پر عمل درآمد کرانا۔ ہارون بمشکل ڈیڑھ سو
گزار سکا اس کے بعد وہ سیدھا حمص پہنچا اور منیزہ کے سامنے وہ زر و مال ڈھیر کر
اس نے مختلف جنگوں میں انعام و اکرام اور مال غنیمت سے حاصل کیا تھا۔ منیزہ اس کا
تو کر رہی تھی لیکن انتہی بے چینی سے نہیں کیونکہ اس کے اپنے حساب کے مطابق ہارو
ٹھیک دو سال بعد واپس آنا تھا۔ جب منیزہ کے سامنے مال و زر کا ڈھیر لگایا گیا تو ا
باپ کی مال تک پڑی اور اس نے بیٹی کو حکم دیا "ہارون تھکا ہوا ہوگا اس لیے اس
غسل اور آرام کا انتظام کردے۔"

عامر بھی ان دونوں کے سامنے ہی تھا مگر اس پر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی توجہ نہیں دی۔ ہارون نے عامر کو حکم دیا کہ "عامر! تو نے اپنی ماں کو سلام نہیں کیا؟"

عامر نے جھجکتے ہوئے نہایت تکلف سے منیزہ کو سلام کیا۔ منیزہ نے بھی کسی قدر تکلف سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلام کا جواب دے کر پوچھا "تو ٹھیک ٹھاک تو ہے؟"

عامر نے گردن ہلا کر جواب دیا "بالکل ٹھیک ہوں ماں۔"

ہارون نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا "منیزہ! میرا ہمنوی کہاں چلا گیا؟"

منیزہ نے جواب دیا "اس نے دوسری شادی کر لی۔"

ہارون نے اطمینان کی سانس لی، بولا "منیزہ! تو نے بہت بڑی خوش خبری سنائی ورنہ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو ناچاقیاں ہوئیں ان میں میرے ہمنوی کا بڑا ہاتھ تھا۔"

منیزہ نے جواب دیا "لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

ہارون نے پوچھا "وہ آج کل کہاں رہ رہا ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا "یہیں، اسی گھر میں میرے پاس ہی۔"

ہارون نے کہا "خوب! تو اس نے ابھی بیچا نہیں چھوڑا۔"

منیزہ نے پوچھا "تو دمشق گیا تھا؟"

ہارون نے جواب دیا "نہیں، میں ابھی دمشق نہیں گیا، سیدھا تیرے پاس آیا ہوں، اب یہاں سے تجھ کو لے کر دمشق جاؤں گا۔"

منیزہ نے کہا "ہم دونوں میں دو سال کی مدت طے ہوئی تھی۔ تو نے کیا فیصلہ کیا؟"

ہارون نے جواب دیا "میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھ کو لے کر دمشق چلا جاؤں۔"

منیزہ نے کہا "لیکن میں اس وقت تک تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک کہ میں اس پر یقین نہ کر لوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی۔"

ہارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا "منیزہ! کچھ تو لحاظ کر، اس موضوع پر پھر بات ہو جائے گی اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا ہمنوی بھی نکل گیا۔ میرا خیال ہے کہ تجھ کو اب ضد نہیں کرنا چاہیئے۔"

منیزہ نے جواب دیا "یہ تو بار بار ہمنوی کا ذکر بیچ میں کیوں لے آتا ہے میں اس کو نہیں جانتی، میرا سلسلہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔"

منیزہ کا باپ جو ذرا سی دیر کے لئے ٹل گیا تھا دوبارہ آ گیا۔ ہارون نے اپ
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کو کہیں اندر رکھوا دیجئے۔"
منیزہ کا باپ سامان اٹھانے لگا۔ ہارون کے آنے کی خبر سن کر پاس پڑوس
بھی آ گئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ ہارون کو دیکھتے ہی فرطِ جوش میں لپٹ
پوچھا "ہارون! یہ تو کب آیا؟ خوب" اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا "اور تو
کیسا ہے؟"
عامر نے بھی مسکراہٹ میں جواب دیا "اچھا ہوں۔"
منیزہ اٹھ کر جانے لگی تو ہارون نے پوچھا "کہاں؟"
منیزہ نے جواب دیا "میں ابھی آتی ہوں تم لوگ باتیں کرو۔"
ہارون اپنے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا "تم نے شادی کر لی اور مجھ
بھی نہ چلا۔"
بہنوئی نے جواب دیا "ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور
اس شادی کی اطلاع دینا بھی ہتا تو کہاں دیتا؟"
ہارون نے کہا "یہ اچھا کیا۔"
بہنوئی ہنس دیا، کہا "ہاں، اچھا ہی کیا کیونکہ جب تک میں شادی نہ کرتا
ہی رہتا۔ تلوار کی طرح تیرے سر پر لٹکا رہتا۔"
ہارون نے کھسیا کر جواب دیا "ایسی بات نہیں تھی بھائی، لیکن میں کچھ
شے میں ضرورت مند ہو گیا تھا۔"
بہنوئی نے کہا "بقیہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، بعد میں کر لوں گا، لیکن ا
میں چند ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو منیزہ کی موجودگی میں شاید نہ کہہ سکوں۔"
ہارون نے کہا "ہاں ہاں، بھائی ضرور کہو، میں تیار ہوں۔"
بہنوئی نے پوچھا "میرا خیال ہے تو منیزہ کی دی ہوئی دوست سے پ
آ گیا ہے؟"
ہارون نے جواب دیا "ہاں، تقریباً چھ ماہ قبل۔"
بہنوئی نے پوچھا "کیا تو نے یہ فیصلہ کر لیا کہ منیزہ کی خواہش پوری کرو
ہارون نے جواب دیا "بھائی! میں منیزہ کو نہیں چھوڑ سکتا اور عامر سے
بھی نہیں برداشت کر سکتا، اس لیے تم ہی کوئی مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟"

بہنوئی نے کہا۔" تو منیزہ کی خواہش پوری کرتے کیونکہ میں نے اس دوران طرح ٹٹول کر یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ جو چاہتی ہے اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔"

ہارون نے پیشانی کو انگلیوں سے سہلایا، پوچھا۔" بھائی! اگر میں منیزہ کی خواہش پوری کر دوں تو کیا وہ اپنے بچے کی موجودگی میں عامر کو نظر انداز نہیں کر دے گی؟"

بہنوئی نے ذہن پر زور آزمائی کر دے کر جواب دیا۔" اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو تجھ یہ مشورہ کبھی نہ دیتا کہ تو منیزہ سے کوئی بچہ نہ ہونے دے لیکن اب صورت حال بدل ہی ہے اور منیزہ بچے کی خواہش میں دیوانی ہو رہی ہے تو اب اسے زیادہ دنوں تک میں بہلایا جا سکتا اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تو اس کی خواہش پوری کر دے۔ وہ یا عامر تو اس کو میرے پاس چھوڑ دے، میں اس کو خوش رکھوں گا اور کوئی کمی نہیں سوس ہونے دوں گا۔"

ہارون نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔" بھائی! پہلے مجھے غور کر لینے دو، اس بعد میں کوئی فیصلہ کروں گا۔"

ہارون نے اپنے بہنوئی کی بیوی کو بھی دیکھا جو بظاہر ایک سیدھی سادی عورت نظر آتی تھی۔

تین دن تک ہارون نے منیزہ سے مزید کوئی بات نہیں کی، اس کے اعزاز میں ضیافتیں دی گئیں اور ہارون انہیں اٹھاتا رہا۔ بہنوئی نے عامر کی دلجوئی شروع کر دی اور اس اپنے پاس بہلا رکھا۔ عامر بھی اپنے پھوپھا میں خلوص اور محبت محسوس کر رہا تھا۔ اس منیزہ کو اپنی طرف سے کھنچا کھنچا محسوس کیا تو پھر منیزہ کے پاس جانے کی ضرورت بھی میں محسوس کی۔

منیزہ نے چھٹے دن ہارون کو ایک بار پھر گھیر لیا اور پوچھا۔" ہارون! میں مستقل چینی محسوس کر رہی ہوں، تو نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا کہ تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

ہارون بہت خوش تھا، مسکراتا ہوا منیزہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا۔" میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھ کو اپنے ہاتھ سے کر دشق چلا جاؤں، اور خراسان واپس جانے کے سوچے کو ذہن سے نکال دوں۔"

منیزہ نے جواب دیا۔" لیکن میں دمشق اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک کہ اولاد والی نہ ہو جاؤں۔"

ہارون نے کہا۔" اگر میں تیری خواہش پوری کر دوں تو تو یہ جانتا کہ عامر کا کیا

بنے گا، وہ کہاں رہے گا؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "ہارون! یہ خدشہ تو اپنے ذہن سے نکال دے کہ میں اپنے کی موجودگی میں عامر سے زیادتی کروں گی، میں نے عامر کو ہمیشہ اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے ہمیشہ ہی بیٹا سمجھتی رہوں گی، تجھ کو اس کی طرف سے فکرمند نہیں ہونا چاہیئے۔"

ہارون نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو میرا فیصلہ بھی سن لے میں یہاں آیا ہوں، اس وقت تک میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ میں نے تیرے سر واقعی بڑی زیادتی کی ہے اور اب اس کی تلافی چاہتا ہوں۔ عامر تیرے ہی پاس رہے گا یاد رکھ کہ اگر اس کو کوئی شکایت ہوئی تو میں بھی بے مروتی اختیار کر لوں گا۔"

یہ خبر منیزہ کے باپ کو بھی مل گئی۔ اس نے خوشی کا بے پایاں اظہار کیا۔

اب ہارون کی اس گھر میں جو قدر و منزلت تھی، اس سے پہلے اس کو نصیب بھی نہ ہوئی تھی۔ منیزہ کے قہقہے اور شوخیاں پھر عود کر آئی تھیں۔ منیزہ کا باپ ہارون کی ناز برداریوں میں لگا رہتا۔ ہارون کا ہر ہنوز بھی بے حد شوخ تھا۔ ہاں اگر ان سب کوئی ذخیرہ تھا تو وہ عامر تھا۔ وہ معلوم نہیں کس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ منیزہ ہارون دکھانے کے لیے اگر کسی وقت عامر کی طرف پیار و محبت سے متوجہ بھی ہوتی تو اس میں وہ شدت اور گرمی نہ ہوتی جو پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ عامر اس کمی کو محسوس کر رہا تھا لیکن ہارون اس سے بے خبر تھا۔ ہارون کا ہر ہنوز بھی عامر کے خلا کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی دبے لفظوں میں عامر کو سمجھائے لگتا۔ "بیٹے عامر! تیرا باپ تجھ سے چھن گیا تو ذرا بھی فکر نہ کر، میں جو موجود ہوں۔"

عامر کہتا۔ "لیکن پھوپا جان! میری نئی ماں منیزہ پہلے تو ایسی نہیں تھی، یہ اب کو کیا ہو گیا ہے؟"

پھوپا جواب دیتا۔ "ہاں پہلے وہ تجھ سے پیار کرتی تھی، مگر اب وہ اپنی محبت کا ذخیرہ اپنے بچے کے لیے محفوظ کر رہی ہے۔ اپنے اس بچے کے لیے جو ہنوز عدم میں ہے آنے کے لیے بازو ہلا رہا ہے۔"

پھوپا کی سمجھ میں عامر کی باتیں تو آ رہی تھیں مگر پھوپا کی باتیں عامر کی میں بالکل نہیں آ رہی تھیں۔

* * *

کئی ماہ حمص میں رہنے کے بعد ہارون اور منیرہ نے دمشق جانے کا منصوبہ
بنایا۔ اب منیرہ کے باپ کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہارون کو اب ایک ہی فکر تھی، وہ
اس کا باپ منیرہ کو یاور دیکھ کر خوش نہیں ہوگا۔ اس نے کئی راتیں اس فکر اور تشویش
میں گزار دیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے باپ کو جواب کیا دے گا؟

جب جانے کی تیاریاں مکمل ہوگئیں تو منیرہ نے ہارون کو مشورہ دیا۔ "ہارون!
صبح دن سے تجھ کو ملول اور فکر مند محسوس کر رہی ہوں، کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ
کیوں ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "منیرہ! اب میں تجھ سے کوئی بات کبھی نہیں چھپاؤں گا میں
سوچ رہا ہوں کہ میرا باپ جب تجھ کو دیکھے گا تو مجھ پر بہت برہم ہوگا۔ میں
سوچ رہا ہوں کہ میں اس کے جواب میں کیا کہوں گا!"

منیرہ کا منہ فق ہوگیا۔ بولی۔ "تیرے باپ کو یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیئے۔"

ہارون نے کہا۔ "میرے باپ کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے، یہ ان
باتوں کو سمجھا سکتا ہے۔ میرا دعوت تو یہی سوچتا ہے کہ میرا باپ تجھ کو اس حال میں دیکھ
کر خوش نہیں ہوگا۔"

منیرہ نے ہمدردانہ لہجہ بنایا۔ "مجھ کو اس حال میں دیکھ کر اگر وہ خوش نہیں ہوتا
تو، مجھ کو اس کی پرواہ بھی نہیں، تو اس کا یہ مطلب بھی ہوا کہ میں دمشق میں زیادہ
دن نہیں رہ سکوں گی۔"

ہارون نے تسلی دی۔ "بہرحال میں کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھا لوں گا اور ایک
بات یہ بھی ہے کہ میرا باپ کہیں عامر کو اپنے پاس ہی نہ روک لے کیونکہ اس کو تو امید ہی
نہیں رہے گا کہ اب عامر پر پوری توجہ نہیں دی جا سکے گی۔ میں اپنے باپ کے
لئے یہ شبہ کس طرح نکالوں گا اور پھر یہ امکان بھی موجود ہے کہ میرا باپ عامر کو
اپنے ہی پاس روک لے اور اس کو تیرے خلاف کرنا شروع کر دے۔ انہی فکروں نے
مجھ کو ہلکان اور پریشان کر رکھا ہے۔"

منیرہ نے چٹکی بجائی۔ "اس کا حل ہے میرے پاس۔"

"اس کا کیا حل ہے؟"

"اس کا حل یہ ہے کہ دمشق میں زیادہ قیام ہی نہ کیا جائے اور عامر کو حمص
بھیجا جائے۔ تیرا باپ عامر پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔"

ہارون نے اپنے ذہن پر ذرا سا زور دیا تو منیزہ کی یہ تجویز بہت اچھ
بولا۔" لیکن اس میں ایک خرابی بھی ہے۔"
"کون سی خرابی؟ میں بھی تو سنوں اس خرابی کے بارے میں تفصیل
ہارون نے جواب دیا۔" اس میں خرابی یہ ہے کہ اگر عامر حمص میں رہا تو
مجھ سے دل پر یہ اثر ہوگا کہ ہم دونوں نے اس کو نظر انداز کرنا شروع کر
اور یہیں سے اس میں احساس محرومی پیدا ہو جائے گا۔"
منیزہ نے کہا۔" اتنی گہرائیوں میں مت جا ہارون۔ میرا کہنا مان او
اپنے بہنوئی کے پاس ہی چھوڑ جا۔ میرا خیال ہے تیرا بہنوئی عامر کو اتنا خوش
گا کہ وہ ہم دونوں کو بھول جائے گا۔"
ہارون نے جواب دیا۔" بہرحال اس پر خوب اچھی طرح غور کر
قدم اٹھانا ہوگا۔"
منیزہ نے مسکرا کر کہا۔" میں نے یہ کب کہا تھا کہ جو بھی کرنا ہو فو
کر ڈالو۔"
ہارون نے عامر کو لے جانے یا نہ لے جانے پر خاصہ غور و فکر سے کا
بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ عامر کو اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی فائدہ نہیں، ن
نقصان ہے۔ اس نے خاموشی سے منیزہ کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا، بولا۔" منی
میں تیرے اسی فیصلے پر عمل کروں گا۔ ہم دونوں دمشق چلیں گے عامر یہیں ہم
پاس رہے گا۔ اس طرح میرے باپ کو در غلانے پھسلانے کا موقع نہیں
وہ عامر کو روک بھی نہیں سکے گا۔"
منیزہ کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا، بولی۔" میں ہمیشہ تجھ کو وہی مش
دوں گی جس سے تجھ کو نقصان نہ پہنچے۔ میں تیری شریک حیات ہوں، بیوی، زندگ
ساتھ۔ میں ہمیشہ تیرے لئے وہی چاہوں گی جو خود اپنے لیے پسند کروں گی، ا
کو مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔"
ہارون نے منیزہ کو آغوش میں سمیٹ لیا، بولا۔" افسوس کہ میں نے
سمجھنے میں بڑی غلطیاں کی ہیں لیکن اب یہ غلطیاں نہیں ہوں گی۔"
منیزہ نے ہارون کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کیں تو دیدے
بند کر لیں، بولی۔" ہارون! کوئی انسان بھی غلطی نہ کرے اگر اس کو دوسرے

لطیاں کھانے پر مجبور نہ کر دیں۔ تو معصوم اور پاک باز انسان ہے جب کہ دوسرے
ں اور عیار تھے۔ ان چالاکوں نے تجھ کو ورغلا کر گمراہ کر دیا تھا اس لیے مجھ کو
سے کوئی شکایت نہیں، مجھ کو ان لوگوں سے شکایت ہے جو دوسروں کے معاملات
خواہ مخواہ دخل دے کر نہیں تباہی اور بربادی کے کنارے پر پہنچا دیتے ہیں۔
ں کہ تیرا باپ بھی انہی میں سے ایک ہے۔"

ہارون شرمسار بیٹھا تھا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا اور شرما کر آنکھیں
ر لیں۔

عامر نے ابھی تک یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا باپ اور منیزہ اسے چھوڑ کر دمشق
جائیں گے۔ پھوپھا نے بڑی تسلیاں دیں لیکن عامر کا دکھ دور نہیں ہوا۔ دوسری طرف
ن بھی عامر کی کمی محسوس کر رہا تھا مگر منیزہ نے تسلی دی اور سمجھایا کہ عامر کو بھی
تنہا چھوڑ کر اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے کا موقع دو۔ ہارون کو غم کے ساتھ
خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا باپ اس کی اس حرکت پر خوب خوب لعن
کرے گا۔

عامر کا یہ حال تھا کہ کئی دن تک اس کی ٹھوکر پیا اس اڑی رہی۔ لیکن اس کا
ا برا دل جوئی کرتا رہا۔ عامر بار بار ٹھنڈی سانس بھر کے پوچھتا "یہ بادِ جان
اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے، مجھے یہاں کیوں چھوڑ گئے ہیں؟"

پھوپھا نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور جواب دیا "بیٹے عامر! اب تو میرا
ہے، اپنے باپ کو زیادہ نہ یاد کر۔ اب تو میرے ہی پاس رہے گا۔ تیرا باپ ایک اور
ی فکر میں ہے۔"

ایک اور عامر کی فکر کا مطلب عامر کی سمجھ میں نہیں آیا اور اس سلسلے میں اس
ئی سوال بھی نہیں کیا۔ وہ زیادہ تر باتیں اپنے آپ سے معلوم کرنا چاہتا تھا کسی
ال کیے بغیر وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا۔

ہارون اور منیزہ کو عامر کے بغیر دیکھ کر ہارون کے باپ کو حیرت بھی ہوئی اور
بھی۔ اور ساتھ ہی ایک لایعنی سا خوف بھی محسوس ہوا، لیکن جب اس کو یہ
ہوا کہ عامر خیریت سے ہے اور حمص میں اپنے پھوپھا کے ساتھ رہ رہا ہے تو ہارون
سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے ہارون کو مال و زر اور سامان کے بغیر دیکھا تو اور زیادہ
ان ہو گیا، پوچھا "کیا اس بار تو خالی ہاتھ آیا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا "نہیں باباجان میں خالی ہاتھ تو نہیں آیا۔ کچھ
لایا تھا اسے حمص میں چھوڑ آیا۔"

"حمص میں چھوڑ آیا، کیا مطلب؟ حمص میں کس کے پاس چھوڑ آیا؟"

ہارون نے جواب دیا "حمص میں منیزہ کے گھر کیونکہ میں خود اسا
سیدھا حمص گیا تھا۔"

باپ نے تلخی سے کہا "لیکن حمص میں تیرا اپنا گھر تو نہیں ہے۔ یہ کیسی
دیکھ رہا ہوں میں تجھ میں۔"

ہارون نے جواب دیا "ہاں باباجان! مجھ میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئی آ
باپ نے سر سے پاؤں تک بیٹے کو بغور دیکھا "عامر کو بھی اپنے سا
لایا۔ اپنا مال و زر بھی حمص ہی میں چھوڑ آیا، مجھ میں عجیب سی تبدیلیاں دیکھ
ہوں میں۔"

ہارون نے جواب دیا "ہاں باباجان! میں نے ڈیڑھ سال تک اپنے سا
غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں غلطی پر ہوں، مجھ کو اپنے مسائل کا حل خود
چاہیے۔ مجھے اپنے معاملات کا خود ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔"

باپ نے بوکھلا کر پوچھا "یعنی، یعنی کیا مطلب؟"

ہارون نے منیزہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، دونوں ہی کے چہ
مسکراہٹ عود کر آئی، پھر باپ سے کہا "مطلب یہ کہ میں منیزہ کو ناخوش نہ
سکتا۔ وہ جن کی عمر میں ختم ہو چکیں اور عدم کی سرحد پر کھڑے ہیں ان لوگ
صحیح مشورہ کس طرح دیں گے جو بظاہر عدم کی سرحدوں سے دور ہیں۔ میں منیزہ
سے محروم نہیں رکھ سکتا۔"

باپ نے ہارون کی باتیں بڑے تحمل سے سنیں اور کسی قدر لاپرواہی سے
دیا "اپنے غلط فیصلوں کے نتائج بھی تو خود ہی بھگتے گا۔ میں جانتا تھا کہ تو
ایک دن بڑوں کے فیصلوں سے منحرف ہو جائے گا۔"

ہارون نے کہا "میں بڑوں کے فیصلے سے منحرف نہیں ہوا، بلکہ فیصلے
غلطی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔"

باپ نے ان دونوں میں دلچسپی ہی نہیں لی، انہیں ان کے حال
اب ہارون اور منیزہ کا بیشتر وقت حاتم کے ساتھ گزرتا تھا۔ ان کی محب

ن ہو گئی تھیں۔ احتیاط اور ہدایات کی طنابیں کھل گئی تھیں اور انہیں پہلی
ت اور آزادی کے نشے اور لذت کا صحیح علم ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دن دمشق
ہے اور پھر حمص چلے گئے۔ حمص میں بھی یہ دونوں آزادی سے ادھر ادھر گھومتے
رہے۔ ہارون کے ہمنوائی نے عامر کی ذہنی دلداریاں بڑی محنت اور محبت سے نبھائیں
جب عامر کو اپنے ہمنوائی کے پاس خوش و خرم دیکھتا تو اس کی طمانیت اور سکون
اضافہ ہو جاتا۔ دمشق میں ہارون کا باپ تنہا رہ رہا تھا۔ وہ اکثر ان حسین اور
ل سے بھرپور دنوں کو یاد کرتا رہتا جب اس گھر میں ہارون کی پہلی بیوی،
ارون کی بہن اور دوسرے لوگ سرگرم عمل رہتے تھے۔ انہی میں منیزہ بھی
ی، لیکن منیزہ کی یاد سے وہ ملول ہو جاتا۔ ہارون نے اپنے باپ کو تقریباً نظر انداز
تھا۔ منیزہ کو یہ سوچ سوچ کر خوشی ہوتی تھی کہ آخر کار اس نے اس بوڑھے
لے لیا۔

ایک سال بعد منیزہ بھی ایک بچے کی ماں بن گئی۔ ہارون لڑکے کا نام عامر کے
ر ظاہر رکھنا چاہتا تھا لیکن منیزہ نے اس نام کو ناپسند کیا اور اس کا نام ابراہیم
یا۔ یہ بات عامر کو بھی معلوم ہوئی تو اس کو دکھ پہنچا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں
کہ منیزہ اس سے نفرت کیوں کرنے لگی۔ ابراہیم کی ولادت کی خبر جب ہارون
کو پہنچی تو وہ رونے لگا اور ہارون کو خط لکھا کہ عامر کو اس کے پاس بھیج
تاکہ اس کی تنہائی دور ہو جائے، لیکن عامر کو اس کے پھوپھا نے بھیجنے سے
دیا۔

ہارون کو ایک بار پھر حمص چھوڑنا پڑا، لیکن اب اسے موصل کے آس پاس
ں سے جنگ کرنا تھی۔ وہ علیزمعینہ مدت کے لئے جزیرہ اور اس کے مضافات
ع دیا گیا۔ ہارون کے ہمنوائی نے عارضی طور پر سیاہ گری چھوڑ دی اور حمص
م کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ عامر پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہ عامر کی خوش قسمتی
قسمتی کہ اس کا پھوپھا اولاد سے محروم تھا چنانچہ دونوں سیاں بیوی نے عامر
اولاد کی طرح رکھا اور منیزہ کی عدم توجہی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ مگر دونوں
ح عامر کے دل میں جھانک سکتے اور انہیں کوئی ایسا وسیلہ حاصل ہوتا جس سے
ے احساسات معلوم کیے جا سکتے تو وہ عامر کے دل میں نفرت کا ایک ایسا شعلہ
ہ دیکھتے جو بڑھ کر بڑی سے بڑی شے کو جلا سکتا تھا۔

ہارون اپنی بیوی کو خطوں میں یہی لکھتا رہتا تھا کہ اب ابراہیم کی موجو
منیزہ پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ عامر کا بھی اتنا ہی خیال رکھے جتنا وہ ابراہیم
ہو گی۔ وہ ابراہیم کے لیے جو کچھ بھیجتا وہی عامر کے لیے بھی بھیجتا لیکن منیزہ
بھی یہ کہہ لیتی اور عامر کو اس کی ہوا تک نہ دیتی۔ وہ عامر کے ذکر پر یہی
لگتی کہ یہی وہ ذات ہے جس کی وجہ سے کئی سال تک اس کو اپنی اولاد سے
رکھا گیا۔ اس کا یہ انداز فکر اس کے دل میں عامر کے خلاف نفرت بن بڑھتا جا
اب جب کہ اس نے یہ دیکھا کہ ہارون ابراہیم کا تنہا ذکر کر کبھی بھی نہیں کرتا، اس
عامر کا ذکر ضرور کر دیتا ہے، اس طرح سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ
اب حمص میں نہیں رہنا چاہیے۔ کیونکہ عامر جب تک حمص میں رہے گا، ہارو
کے بیٹے ابراہیم پر خاص توجہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ عامر
ساتھ نہیں رہتا تھا، ہارون کے بہنوئی کے پاس رہ رہا تھا اور ہارون کے بہنو
سکونت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی منیزہ کے حسد کو بڑی ہی طرح محسوس
منیزہ عامر سے جتنا زیادہ حسد کرتی، ہارون کا بہنوئی اسی قدر خوش ہوتا اور
نوازشوں اور عنایتوں کی بارش کر دیتا۔ وہ منیزہ کو اس طرح جلا جلا کر ایک
لذت حاصل کر رہا تھا۔

ایک دن جب وہ حمص کے حاکم کے پاس سے اٹھا تو گھر میں داخلے
اس کی ایک اجنبی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ شخص سامان کی پوٹلی سنبھالے منیزہ کے
بہت پوچھ رہا تھا۔ منیزہ کا باپ اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ اس نے اس شخص
احترام سے اپنے گھر میں بٹھایا اور اپنا تعارف کرایا "میں ہارون کا بہنوئی ہوں،
کا کوئی پیغام تیرے پاس ہے تو مجھے دے دے"۔

اس شخص نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پوٹلی اس کے حوالے کر دی
ہارون نے بھجوائی ہے اس میں ایک خط بھی ہے اور کچھ رقم بھی، اس کے
کپڑے بھی ہیں"۔

اس نے پوٹلی لے لی اور ہارون کا خط پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا
گیا تھا:-

"صبح کی شفق کی طرح گلنار اور مشرقی افق پر سے طلوع ہونے وا

حسین منیزہ! میں عنقریب واپس آرہا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی لگا ہے کہ کہیں کوئی خارجی مہم ناکام تمام نہ کر دے کیونکہ دونوں پہلے ہی ایک خارجی ر میں آ گیا تھا۔ ہم تین ہزار سپاہی خارجیوں کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے کہ رات کو خارجیوں نے ہم پر شب خون مار دیا۔ ان کے اچانک اور خوفناک نے ہمیں اتنا بدحواس کر دیا تھا کہ ہم میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی ، انہوں بیدردی سے قتل کرتے رہے ، ہمارے خیموں کی طنابیں کاٹ کر انہیں آگ ں ، اور ہمارے گھوڑوں پر قبضہ کر لیا۔ میں نے ذرا سی دیر میں اپنے ساروں طرف ے فوارے چھوٹتے دیکھے ، زخمیوں کی چیخ و پکار نے قیامت صغریٰ برپا کر رکھی میں نے بھی ہتھیار سنبھالا ، مارا جھپٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس ہنگامۂ دار و گیر علوم نہیں کس طرح میں نے یہ تدبیر کی کہ قتل ہونے والوں میں مُردوں کی طرح گیا۔ خارجیوں نے ہم پر شب خون کے فوارے چھوٹتے دیکھے ، زخمیوں کی چیخ و لے قیامت صغریٰ برپا ایک خارجی نے اپنا پاؤں میرے منہ پر رکھ دیا اور ہو نکل گیا۔ میں دم سادھے اذیت کی پرواہ کیے بغیر مُردے کی طرح پڑا رہا۔ ے اپنے جگہ سے حرکت تک نہ کی جب تک کہ مجھ کو یہ یقین نہیں ہو گیا کہ سارے ھا چکے ہیں ، اور اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پاتا چھپتا چھپاتا موصل پہنچا اور خارجیوں کے خوفناک شب خون کی حکومت ع دی۔

منیزہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا؟ شاید تیری ، عامر راہیم کی وجہ سے۔ کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے حکومت نے مجھے انعام و ے نوازا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی باور کرایا ہے کہ میں نے خارجیوں کا بردست مقابلہ کیا اور ان کے خطرناک منصوبے کو بزور قوت بچ نکلنے میں ہو گیا۔

منیزہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارجیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ جری ں جن کے چند افراد سینکڑوں بلکہ ہزاروں کو شکست دے دیتے ہیں۔ بڑے تجربہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روئے زمین پر نہیں اور نہ پہلے تھے۔

مجھ کو تیری ، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند ریشمی ٹکڑے

بھیج رہا ہوں، ان میں کے دو نیلے پاپے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو نیلا رنگ پسند ہے۔ بقیہ تو اپنے اور ابراہیم کے لئے رکھ لے۔

میں نے اس سے پہلے جو سلیپر میں روانہ کی تھیں، وہ پسند آئیں یا انہیں کو اپنی سلیپر کیسی لگی؟

منیزہ! میں تجھ کو خدا اور رسولؐ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تو عامر کا خاص خ ابراہیم کی سفارش اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ وہ تیرا بیٹا ہے اور اس کے لیے کچھ ا بانہ نکھوں تو اس کا خیال بہرحال رکھے گی مگر عامر کے لیے اس لیے لکھ رہا ہوں چند سالوں سے ہماری توجہ سے محروم ہے، میرے بہنوئی نے اس کی ذمہ داری کر کے ہم دونوں کو کسی حد تک بے نیاز کر دیا ہے مگر میں اس بے نیازی کو نا ہوں۔ میں نے تیری خواہش پوری کر دی اور ابراہیم سے تیری گود بھر دی، اب میری خواہش پوری کر اور عامر پر وہی نوازشیں برسا دے جو کبھی دمشق میں کرتی تھی۔

میرے خوابوں اور خیالوں کی پُراسرار ساحرہ! کیا تو جانتی ہے کہ دمشق باپ بیماری جھیل رہا ہے، افسوس کہ اس وقت میں اس کے پاس نہیں، لیکن ج ابھی اس تجھ لے کر دمشق چلا جاؤں گا، اگر تو اپنے باپ کے ذریعے میرے بیمار با خبر گیری کر سکے تو سزد کہ میں تیرا عمر بھر احسان مند رہوں گا۔"

ہارون کے بہنوئی نے اس شخص کو رخصت کر دیا پھر خط اور سامان کو منیزہ کو پہنچا دی۔ اس نے منیزہ پر یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ اس نے ہارون کا لیا ہے۔ منیزہ خط کو لے کر کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد جب باہر نکلی تو اس اترا ہوا تھا، بہنوئی نے پوچھا "کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟"

منیزہ نے جواب دیا "ہاں ہارون بہت جلد آنے والا ہے۔ وہ خارجہ ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔"

اس نے پوچھا "اور کچھ؟"

منیزہ نے جواب دیا "اور یہ کہ ہارون کا باپ دمشق میں بیمار پڑا ہے تو عامر کو ساتھ لے کر فوراً دمشق چلا جا، کیونکہ یہ میری نہیں ہارون کی خو

وہ منیزہ کے جھوٹ پر حیران رہ گیا، پوچھا "اور کچھ؟"

منیزہ نے جل کر جواب دیا "اور کچھ نہیں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

وہ بڑی دیر تک منیزہ کے پاس ہی بیٹھا رہا کہ شاید ریشمی پارچے عامر
لے کر دیتے جائیں لیکن منیزہ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ عامر بھی یہ خبر سن
ں آ کر بیٹھ گیا کہ اس کے باپ کا خط آیا ہوا ہے، لیکن منیزہ نے اس کی موجودگی
ل نظر انداز کر دیا اور نکھیوں تک سے دیکھنا گوارا نہ کیا۔ اس نے عامر کو
کے لیے ابراہیم کو گود میں اٹھا لیا اور اس کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہوئی بولی۔
م (تیرے باپ نے تجھ کو پیار لکھا ہے اور ہدایت کی ہے کہ میں تجھ کو خوب بھینچ
ر تیرے باپ کی طرف سے پیار کر دوں۔"

بہنوئی نے عامر کی طرف دیکھا جو کھویا کھویا، گم صم یہ منظر دیکھ کر دل
میں رو رہا تھا۔ بہنوئی نے پوچھا۔ "کیا ہارون نے عامر کے لیے کچھ بھی
لکھا؟"

منیزہ نے چونک کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور عامر کے بھولے پن کو
دیکھ کر کہا۔ "نہیں، عامر کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا اور پھر ابراہیم سے عامر کا کیا مقابلہ
عنت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ابراہیم ابھی ماں کا دودھ پی رہا ہے چنانچہ
خدا جس محبت اور توجہ کا مستحق ہے عامر تو اس توجہ اور محبت کا مستحق
ہو سکتا۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "منیزہ! تیرا انداز فکر درست نہیں، ایک باپ کی نظر
وٹے بڑے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہارون عامر
بڑی محبت کرتا ہے اور اگر اس نے اپنے خط میں عامر کی بابت کچھ نہیں لکھا تو
ہے۔"

منیزہ نے ہراساں سا کہا۔ "میں تجھ سے ایک بات کچھ عرصے سے نہیں کہہ پا
ں لیکن اب کہہ ڈالوں گی۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "تو ضرور کہہ ڈال کیونکہ جب دلوں میں کدورت پیدا ہو
صداقت سے بچنا چاہیے۔"

منیزہ نے پوچھا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تو اس گھر میں کیوں رہ
ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں اس لیے رہ رہا ہوں کہ تو نے اور تیرے باپ نے مجھ
ایسا سمجھ رکھا ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر تو اس طرح سوچ رہا ہے تو سوچ رہا ہے اب تجھ کو یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں تیرے کہنے سے تو ہرگز نہیں جاؤں گا، مجھ کو عرصے سے شبہ تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھ سے اس قسم کی باتیں ضرور کرے گی لیتے میں نے عامر کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اب جب تک عامر میرے ساتھ ہے میں یہ نہیں جاؤں گا۔"

منیزہ نے کہا۔ "عامر کو میں اپنے پاس رکھ لوں گی تو یہاں سے چلا جا۔"

بہنوئی نے عامر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اس کو تو اپنے پاس رکھے گی کو تو رکھے گی؟ خوب! کیا تجھ کو عامر کا کوئی خیال ہے؟ میرا خیال ہے نہیں، اور بھی عامر کو تیرے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اس کا فیصلہ بھی بہت جلد ہو جائے گا۔ ہارون آنے کی دیر ہے، پھر میں عامر کو جبراً اپنے پاس رکھ لوں گی۔"

بہنوئی نے اکڑ کر کہا۔ "ہاں صرف اس صورت میں کہ خود عامر بھی تیرے رہنے پر آمادہ ہو جائے۔"

منیزہ نے تن کر کہا۔ "میں عامر کو تجھ سے زیادہ محبت دے سکتی ہوں، تجھ سے زیادہ اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔"

بہنوئی ہنس دیا اور بولا۔ "بیشک، بیشک، مجھ کو یقین ہے جو عورت عیاشی میں غائب کر دے اور ریشمی پارچے اڑا دے وہ واقعی بڑی محبت سے رکھ سکتی ہے۔"

منیزہ دنگ رہ گئی، کٹ سی گئی، گرم ہو کر بولی۔ "بداخلاق انسان! اس کا مطلب ہوا کہ تو میرے خطوط پڑھ لیتا ہے۔ مجھ کو تو اس کا پہلے ہی شبہ تھا اور اسی لیے سلیپر اور ریشمی پارچوں کو دبا کر بیٹھ گئی تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تو خطوط پڑھتا ہے یا نہیں، چنانچہ آج اس کا انکشاف ہو گیا، بھانڈا پھوٹ گیا۔"

بہنوئی نے کہا۔ "اب فضول باتیں نہ کر۔ جب تیری چوری پکڑی گئی تو اس کی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔"

منیزہ نے عامر سے پوچھا۔ "عامر! سچ سچ بتا تو کس کے پاس رہنا گوارا کرے گا، میرے پاس یا اپنے پھوپھا کے پاس؟"

عامر نے بغیر کسی پس و پیش کے جواب دیا۔ "پھوپا کے پاس"۔
منیزہ نے غصے میں جھنجھلا کر پوچھا۔ "یعنی میرے پاس نہیں؟"
عامر نے جواب دیا۔ "ہاں آپ کے پاس نہیں"۔
منیزہ غصے میں کھڑی ہو گئی بولی۔ "کوئی بھی میرا نہیں، میں کتنی احمق تھی
تک تجھ کو اپنا بیٹا سمجھتی رہی"۔
عامر نے جواب دیا۔ "آپ نے بھی اپنا سمجھا ہو مجھے تو وہ مجھے یاد نہیں لیکن
اچھی طرح یاد ہیں اور زندگی بھر یاد رہیں گی کہ آپ نے مجھ سے حسد کرنا
کر دیا ہے اور مجھ میں ایک قسم کا احساس محرومی پیدا کر دیا ہے"۔
پھوپا کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی اور وہ سارا دن مگن رہا کہ گزار دیا۔
میں اس کو ہر چیز اچھی نظر آئی۔ منیزہ کو یہ کوفت کھائے جا رہی تھی کہ اگر عامر نہ
ہارون کا سب کچھ منیزہ اور ابراہیم کو ملتا لیکن اب یہ ناممکن تھا۔
منیزہ غصے میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ہارون کا بہنوئی
مرد دونوں اپنے گھر چلے آئے۔

* * *

بہنوئی نے از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ عامر کے ساتھ دمشق چلا جائے گا اور
ہارون کے والد کی تیمارداری میں مشغول ہو جائے گا۔
اس کے اس منصوبے سے ہر شخص لاعلم ہی رہتا لیکن بہنوئی زیادہ گہرا نہیں
تھا اس نے ایک ایک کو اس کارستانی روک روک کر بتانا شروع کر دیا اس
نے دادا کی بیماری کی خبر دی اور کہا کہ ہم دونوں بلکہ میری بیوی کو بھی چند
دن کے لیے دمشق چلا جانا ہے تاکہ تیرے بیمار دادا کی شاندار تیمارداری کی جا سکے۔
جب چپکے چپکے عامر کو منیزہ کی وہ ساری باتیں بتا دیں جو اس نے ہارون کے خط میں
پڑھی تھیں۔ اس نے عامر سے کہا۔ "عامر! سمجھ لو منیزہ اور اس کے پاس سے جو مال و زر
نکلے مایوس ہو جانا چاہیے کیونکہ اس حریص عورت کے پاس سے کچھ نکلوانا بڑا
کام ہے"۔
لیکن عامر اپنے باپ کی طرف سے بہت فکر مند تھا، اس نے پوچھا۔ "پھوپا
یہ خالہ جی کون ہیں؟"

چھوپا نے ہنس کر پوچھا" یہ یکایک تجھ کو خارجیوں کا کیا خیال آ گیا؟"
عامر نے جواب دیا" مجھ کو ان کا یوں خیال آ گیا کہ انہوں نے میرے
کو مارتے مارتے چھوڑ دیا اور میرے باپ نے آپ کے بقول ان کی بہادری کی
کی ہے"
چھوپا معلوم نہیں کیا سوچ کر ایک دم اچھل سا پڑا، بولا" بیٹے عام
خارجیوں کی بابت بس تو یہ سمجھ لے کہ یہ ایماندار اور بہادر لوگ ہیں، اس رد
زمین پر اپنا ثانی نہیں رکھتے"
عامر نے حیرت سے پوچھا" کیا یہ لوگ اچھے ہوتے ہیں؟ آپ تو ان کی تع
کر رہے ہیں"
چھوپا نے جواب دیا" ہاں میں ان کی تعریف کر رہا ہوں اور اس لئے
کر رہا ہوں کہ وہ تعریف کے مستحق ہیں۔ تیرے باپ نے بھی اپنے خط میں ا
بڑی تعریفیں کی ہیں"
عامر نے پوچھا" اگر وہ اتنے ہی اچھے ہیں تو حکومت ان سے جنگ کیو
ہے، میرا باپ ان کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھاتا ہے؟"
چھوپا نے جواب دیا" ان میں کچھ برائیاں بھی ہیں، بس ان برائیوں کے
جنگ کی جاتی ہے"
عامر نے کسی قدر تند و تیز لہجہ سے کہا" برائیاں کہاں نہیں ہیں، کس میں ہیں
پھر جنگ سب سے کیوں نہیں لڑی جاتی؟"
چھوپا نے قاضیانہ شان سے کہا" تو ان باتوں پر مت سوچ کر، دمشق چ
تیاری کر، ہم دونوں دمشق چل کر تیرے دادا کی تیمارداری کریں گے، اگر ہم نے
کیا تو میرزہ پہنچ جائے گی اور تیرے دادا کے سارے مال و زر پر قبضہ جمالے گ
لیکن عامر کو مال و زر سے دلچسپی نہیں تھی، بولا" میں دمشق اس لئے
سکتا ہوں کہ وہاں میرا دادا بیمار ہے اس کی تیمارداری کروں گا لیکن مال و زر کی ہو
کو ہرگز نہیں سادوں گا"
چھوپا نے کہا" کسی طرح چل تو سہی۔ مال و زر کی ہوس نہ کر، مگر اس ما
کو غلط شخص کے پاس بھی مت جانے دے"
چھوپا نے اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب یہ تینوں بالکل تیار ہ

منیزہ کو مطلع کر دیا، بولا "منیزہ! تو خوش ہو جا کہ میں تیری مرضی پوری کیے
ہوں"
منیزہ نے پوچھا "میری مرضی؟ کون سی مرضی پوری کر رہا ہے؟"
اس نے جواب دیا "منیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب یہاں نہ رہوں،
جا رہا ہوں....."
منیزہ نے بات کاٹ کر پوچھا "اور عامر؟ یہ عامر کہاں رہے گا؟ کس کے
گا؟"
اس نے جواب دیا "افسوس کہ عامر تیرے پاس نہیں رہنا چاہتا، وہ بھی
تھ ہی جائے گا"
منیزہ نے کہا "تم دونوں نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ تم لوگ چلو چند
ریں بھی پہنچ رہی ہوں"
چنانچہ دو دن بعد یہ لوگ دمشق روانہ ہو گئے۔ عامر کو منیزہ سے جدائی کا
ال نہ تھا بلکہ وہ خوش تھا۔ کئی دن بعد یہ تینوں خوشگوار موسم میں دمشق پہنچے
ود تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پُرکیف ہوائیں جسم میں سرور
دوڑا رہی تھیں۔ شہر کے لوگوں نے ان تینوں کو ذرا غور سے دیکھ کر یہ اندازہ
پریشان حال پردیسی کسی مقصد سے دمشق آئے ہیں۔ یہ تینوں پُرہیج راستوں
تے ہوئے اس مکان کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے جہاں عامر کا دادا اکیلا
ا سا انیس لے رہا تھا۔ یہ تینوں اندر داخل ہو کے تو قریب المرگ بوڑھے کے
چند پڑوسیوں کو بیٹھے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا "تم لوگ کون ہو
سے آئے ہو؟"
ہاسدوں کے بہنوئی نے جواب دیا "میں اس بوڑھے کا داماد ہوں" پھر عامر کی
رہ کیا "اور یہ لڑکا اس بوڑھے کا پوتا ہے"
پڑوسی ادھر اُدھر کھسکنے لگے۔ عامر اپنے دادا پر جھک گیا اور بڑی محبت
دادا جان! میں عامر آ گیا، اب آپ کیسے ہیں؟
دادا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عامر کی طرف دیکھا اور شاید وہ پہچان نہ سکا۔
عامر نے ان کے دونوں شانے پکڑ لیے اور خود بھی ان کے سینے اور سر جھکے
ا اور بولا "دادا جان! مجھے آپ نے بلایا تھا، میں عامر آپ کا پوتا ہوں"

دادا نے بمشکل کہا "ہارون؟ کیا تو ہارون ہے؟"
عامر نے جواب دیا "نہیں، میں ہارون نہیں، میں ہارون کا بیٹا عامر
دادا کی جاتی ہوئی سانس واپس آ گئی۔ ایک بار پھر آنکھیں کھاڑ پھا
ان نیلوں کی طرف دیکھا اور بہنوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "تو تو
تو مجھ سے اتنی دور کیوں کھڑا ہے؟"
عامر نے ایک بار پھر دادا کو سمجھانے کی کوشش کی "دادا جان! یہ پھوپھ
ہیں، میرا باپ اور آپ کا بیٹا ہارون آنے ہی والا ہے، آپ فکر نہ کریں۔"
دادا کو دھڑکا آ گیا "مجھ کو سب نے چھوڑ دیا۔ عامر میرے سینے سے
جاتا کہ میں برسوں کے تنہا اور اداس دل کو سکون پہنچا لوں۔ مجھے سب نے
چھوڑ دیا، تنہا چھوڑ دیا۔"
عامر دادا کے سینے سے لگ گیا۔ عامر کے بوجھنے دادا کی سانس میں ف
پیدا کر دیا جس سے وہ کھانسنے لگا۔ عامر سینے سے الگ ہو گیا اور ادب سے اس
پاؤں دبانے لگا۔
دادا کو کسی کسی لمحہ ہوش آ جاتا لیکن یہ ہوش بھی مدہوشی سے کم نہ
مال و زر کا اس دنیا میں جو مقام ہے بوڑھا شخص مدہوشی میں بھی اسی کی قد
قیمت کا بالکل صحیح شعور رکھتا تھا۔ دادا کی سانسیں کئی بار اکھڑ اکھڑ کر واپس
اور ہر بار یہی شبہ گزرا کہ آئندہ چند لمحے موت اور زندگی کے لیے فیصلہ کن ہ
ہوں گے لیکن بڑے میاں نے تو باتوں تک سے توانائی ظاہر کرنے کی کوشش
اور اسی کوشش میں مشغول تھے کہ ان کی ناسازیٔ طبع کا خاص اثر نہ لیا جا
وہ عنقریب ادھر ادھر ہونے والے تھے۔

* * *

شام سے ذرا پہلے دادا کی حالت پھر بگڑ گئی اور بہکی بہکی باتیں کر
عامر نے کہا "دادا جان! ہوش میں آئیے، پریشان مت ہوئیے۔"
لیکن دادا کی آنکھیں پھٹ چکی تھیں، انہوں نے نہ تو کسی کی بات
اور نہ ہی کوئی اور ان کی باتیں سمجھ سکا۔ دامر اور اس کا چھوٹا بوڑھے کے پا
اس کے انجام کے منتظر تھے۔ بوڑھا مدہوشی میں بار بار ہارون کا نام لے رہا تھا

ہ رہا تھا کہ "ہارون! تو نے عامر پر ظلم کیا ہے، زیادتی کی ہے۔"
عامر کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ دادا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا
ا اور مرحوم بیٹے کو آوازیں دیتے ہوئے ڈوبتے چلے گئے۔ عامر نے آواز
ا جان! ہوش میں آیئے۔"
انہوں نے بے رونق اور نہ پہچان سکنے والی نظروں سے عامر کو دیکھ کر
تو کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟"
دامر نے جواب دیا "دادا جان! میں ہوں عامر آپ کا پوتا۔ مجھے پہچاننے
ن کیجئے۔"
لیکن دادا نہیں پہچان سکا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس نے
عالم میں کہا "میرے پاس جو کچھ ہے، عامر کا ہے، عامر کو بلاؤ تاکہ میں
ن کے حوالے کر دوں۔"
دادا نے سسکیوں کو آواز دی "جناب! یہ عامر آپ کے پاس ہی موجود ہے،
تیر۔"
لیکن دادا پہچانے بغیر ہی رخصت ہو گیا۔ عامر دادا کے بے جان پاؤں پر
انہیں کئی بوسے دیئے اور اپنے پھوپا کے ساتھ آخری رسوم کی ادائیگی
ونے لگا، لیکن تدفین سے پہلے ہی ہارون اور منیزہ بھی پہنچ گئے،
ا کی میت پر خوب خوب رویا لیکن منیزہ نے کھوکی سانس لی کہ اس کی
سے بڑا پتھر ہمیشہ کے لیے ہٹ چکا تھا۔
تمام رسوم سے تارغ ہونے کے بعد ہارون نے فیصلہ کیا کہ اب وہ دمشق
سہے گا اور سامان اور مالی ذمہ داری کو قابو میں لے کر اور مکان کو بیچ کر ہمیشہ
ن چلا جائے گا لیکن بہنوئی نے اس کی مخالفت کی اور کہا "ہارون! یہ مکان
ا اور اس گھر میں جو کچھ بھی ہے، تیرے باپ کی آخری وصیت اور خواہش
عامر کا ہے۔"
ارون اپنے بہنوئی کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ منیزہ بھی اس کے پاس
ن دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ ہارون نے پوچھا! "آخر اس کا مطلب
پ کی آخری وصیت اور خواہش کے مطابق یہاں جو کچھ بھی ہے عامر کا
طلب؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "میں نے مرنے سے چند لمحے پہلے خود سنا ہے کہ مرحوم نے اپنے مال و زر اور مکان کا مالک عامر کو قرار دیا ہے اس لیے اب یہاں کی ہر شے عامر کی ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "جب تک ہم میں ہارون موجود ہے ہارون کے مرحوم باپ کی چیزوں کا کوئی بھی وارث نہیں ہو سکتا اور پھر عامر کے ساتھ ہی ابراہیم کیا تو مرحوم کا پوتا ہے۔"

لیکن ہارون نے منیزہ کو سمجھایا۔ "منیزہ! تجھ کو نہیں سمجھنا چاہیے، میں خود بات کر لوں گا۔"

بہنوئی نے ہارون کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ "ہارون! تو اس معاملے میں خاموشی اختیار کر، جیسا میں کہتا ہوں اس کو اسی طرح رہنے دے کیونکہ آئندہ اختلاف کی خلیج وسیع تر ہو جائے گی مگر پٹے گی نہیں، اس لیے عامر کو جو کچھ مل رہا ہے اس کے پاس ہی رہنے دے۔"

لیکن ہارون نے اس کی بات نہیں مانی۔ "بھائی! ایسی باتیں نہ کر۔ عامر میرا بیٹا ہے، جب تک میں زندہ ہوں، تمام چیزیں میرے قبضہ میں رہیں گی اور عامر کو ان پر یوں تصرف رہے گا جس طرح مجھ کو حاصل ہے۔"

بہنوئی نے افسوسناک لہجے میں پوچھا۔ "تو کیا تو عامر کو ان چیزوں اور مکان سے محروم کر دے گا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں مکان بیچ دوں گا اور سارا مال و زر لے کر حمص چلا جاؤں گا۔ عامر اگر تیرے پاس رہا تو خیر، ورنہ میں اسے بھی اپنے ہی پاس رکھوں گا۔"

بہنوئی نے سکوت اختیار کر لیا۔ عامر کے دل میں نفرتیں جمع ہو رہی تھیں۔ ماں کے خلاف باپ کے خلاف اور دنیا کے خلاف۔

چند دنوں بعد مکان بھی بک گیا اور سارا سامان سمیٹ کر ہارون حمص روانہ ہو گیا۔ ساتھ میں عامر اور اس کا پھوپھا بھی تھا۔ منیزہ بہت خوش تھی، اب اس کی ہی جیت تھی۔ حمص میں داخل ہوتے ہی منیزہ نے ہارون کو سمجھایا۔ "ہارون! اگر تو چاہتا ہے کہ یہ مختصر سا کنبہ خوش و خرم اور نہال رہے تو تو اپنے بہنوئی کو یہاں چلتا کر دے۔"

ہارون نے دو ٹوک جواب دیا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

ہ نے پوچھا "تیری بہن مر چکی ہے، اس کی کوئی اولاد بھی نہیں اب تیرا
رشتہ ہی کہاں رہا"
ون نے جواب دیا "منیزہ! بات اور حالات سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ میرا
ور ہمیشہ، جب تک زندہ ہے میرا بہنوئی رہے گا۔ اس نے میرے عامر کو
ے رکھا ہے"
ہ نے کہا "تو اس کو یہاں سے چلتا کر دے، عامر کو میں اپنے پاس رکھوں گی
یں بناتے ہیں اور اب میں زیادہ باتیں نہیں سنوں گی"
ون نے جواب دیا "لیکن میں بہنوئی سے اس قسم کی باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ
پاس ہی رہے گا اور میں عامر کو بھی اس سے نہیں لے سکتا"
ہ کا جواب ہو کر غامرش ہو گئی، لیکن اس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ
ہوئی۔

ون حمص میں کئی بار آیا اور گیا، لیکن ابھی تک اس نے حمص کو اچھی طرح
یا اب باپ کی موت کے بعد جب وہ خود کو ہلکا اور آزاد محسوس کرنے
کی سوجھی۔ وہ منیزہ اور ابراہیم کو ساتھ لے کر گھومنے نکلا تو عامر کا خیال
ہا "منیزہ! میرا خیال ہے عامر کو بھی لے لیا جائے؟"
منیزہ نے مخالفت کی، بولی "عامر اب بچہ نہیں ہے وہ ہمارے ساتھ
ابراہیم تو بچہ ہے گود میں رہے گا۔ یہ بھی اگر عامر ہی جتنا ہوتا تو میں اسے
نہ لے جاتی"
ون چپ ہو گیا، لیکن بہنوئی ان دونوں کے سامنے آ گیا اور پوچھا "تم
ہے ہو؟"
نے جواب دیا "میں ہارون کر حمص کی خاص خاص چیزیں دکھانا

ی نے کہا "منیزہ! میں تجھ سے تو کوئی بات کروں گا نہیں، ہاں ہارون سے
اپنے ساتھ عامر کو بھی لیتا جا"
بہنوئی کے پیچھے کھڑا تھا۔ ہارون نے عامر کو دیکھنا چاہا، لیکن بہنوئی کے

آتا ہے۔ اگر عامر کو کسی اور وقت نے آتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "میں کسی اور وقت کیوں لاتا تم دونوں نے اس کو دیکھا تھا لیکن میں اس کا آزردہ اور افسردہ چہرہ نہیں دیکھ سکا اور اس کو یہاں لے آیا۔ تجھ کو عامر کا آنا پسند نہیں؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں تو ہارون سے یہ کہہ رہی تھی کہ دیکھ لیا تو نے، میں جو تجھ سے کہہ رہی تھی کہ عامر ہماری توجہ کا قطعاً مستحق نہیں اس کے چھوٹے پن کو وہ آخر پہنچا یا ہے کہ اب عامر کو ہماری فکر ہی نہیں رہی۔"

بہنوئی نے ابراہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ابراہیم کو ذرا بتا اس نے اس کو بھی اپنے قابو میں نہ کیا تو میرا نام نہیں۔"

بہنوئی نے عامر کے ہاتھ سے بھی مورتی کے پاؤں کے پاس سے اٹھائی مورتی کے قدموں میں ڈال دی۔

اب یہ چاروں ایک ساتھ چل پھر رہے تھے۔ ہارون نے از راہ مذاق کہا تم نے تو عامر کو پوری طرح قابو میں لے لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آگے چل کر تو شاید پہچانے بھی نہ۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "ابھی تو نے دیکھا اس کیا ہے؟"

ہارون نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا ابھی کچھ اور دیکھنا بھی باقی ہے؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "ہاں میں اس کو اس لائق کر دوں گا کہ یہ تلوار سونتے مقابلے میں آجائے گا۔"

ہارون نے ہنس کر کہا۔ "تو گویا تو اس کو گستاخ کر دے گا۔" پھر عامر سے بیٹے کیا تو تلوار سونت کر میرے مقابلے پر آسکتا ہے؟"

عامر نے شرما کر جواب دیا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

لیکن منیزہ نے رقی آواز میں کہا۔ "نہیں، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی بات ممکن ہے۔"

عامر منیزہ کی باتوں سے عاجز آچکا تھا۔ بولا کچھ بھی نہیں، مگر منیزہ کے لفظوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

★ ★ ★

عامر جس ماحول میں جوان ہو رہا تھا اس کا ہر فرد خود غرض اور چالاک تھا۔ ہاں نے محبتیں دی تھیں۔ پھر بھی اچھی طرح پیش آتی رہی لیکن وہ ان دونوں کی محبتوں شک و شبے سے دیکھتا تھا کیونکہ جب تک منیزہ کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا، وہ بھی سی طرح جاتی تھی لیکن جب ابراہیم پیدا ہو گیا تو منیزہ کی محبت جز بھی آ گئی اور ہستہ محبت کی جگہ حسد اور رقابت نے لے لی۔ اب اس کو کسی پر بھی اعتبار نہیں تھا کہ اپنے باپ پر بھی۔ کیونکہ باپ کے تغافل اور بے نیازی نے اس کو بڑے دکھ پہنچائے ا ہر ہارون کی محبت میں کوئی کمی نہیں محسوس ہوئی تھی لیکن جب کبھی کوئی ایسا یا جہاں ایک طرف منیزہ ہوتی اور دوسری طرف عامر تو عموماً فیصلہ وہی ہوتا جو منیزہ اس کا باپ منیزہ کی طرف جھک جاتا۔ اس طرح دنیا کے تمام رشتے اپنا اعتبار کھو ۔اب ابراہیم بھی بڑا ہو چکا تھا۔ ابراہیم اور عامر میں بڑا کشمکش ہوتی اور ابراہیم ہوتی کیونکہ منیزہ ہمیشہ ابراہیم ہی کی طرف ہوتی۔ زمانے کے دستور کے مطابق عامر ری بڑی محنت سے حاصل کرتا رہا۔ یہ بالکل اتفاق کی بات تھی کہ ابراہیم اپنے بڑے امر کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس کا حق پسند دل عامر کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر ہتا۔ ہارون اس سے بہت خوش ہوتا اور جب تب تنہائی میں ابراہیم کو یہی سمجھاتا براہیم! یہ مرے بڑے بھائی عامر پر بڑے ظلم ہوئے ہیں، لیکن تو اپنے بڑے بھائی کا ال رکھ اور زندگی بھر اس کا ادب کرتا رہ۔"

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن باپ کی باتوں کو گرہ میں باندھ لیا۔

ہارون اور ہمنوی دونوں ہی اپنی اپنی زندگی کے انحطاطی دور میں داخل ہو ہارون اپنے ہمنوی کا بہت شکر گزار تھا لیکن ہمنوی کا دل صاف نہیں تھا۔ اس ابھی تک بہرا تھا کہ عین اسی وقت جبکہ وہ دولہا بنا بیٹھا تھا اور منیزہ اس کی جانے والی تھی، ہارون نے بروقت حاضر ہو کر سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ وہ اکثر ہنسی ہنسی میں کہہ دیا کرتا تھا کہ "ہارون تو نے مجھے جس طرح ذلیل و خوار ا اسے زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

ہارون ہنس کر کہہ دیا کرتا "بھائی جو کچھ ہو گیا، ہو گیا اب اس کا بار بار ذکر کر ہی ا جانی چاہتا ہوں۔"

لیکن ہمنوی بات کو ہنسی میں اڑا دیتا۔ ہارون حیران تھا کہ ایک طرف تو اس کا ں کا احتاشای ہے کہ برسوں پرانی بات کا زخم یوں دکھا دیتا ہے گویا تازہ تازہ

ہارون نے سختی سے کہا "منیرہ! میں نے آج تک تجھ کو حکم نہیں دیا
اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو میرے ساتھ چل اور عامر کی ہونے والی دلہن کو دیکھ
داری سے بتا کہ یہ عامر کے لئے کیسی رہے گی؟"

منیرہ نے بھی بڑی لاپرواہی سے جواب دیا "میں اپنے بیٹے ابراہیم کے لیے
بھاگ دوڑ کو سکتی ہوں لیکن عامر کے لیے یہ سب کیوں کروں؟"

ہارون نے ایک بار پھر حکماً کہا "منیرہ! میں تجھے حکم دیتا ہوں، اگر تو نے
حکم نہ مانا تو میں تجھے طلاق دے دوں گا۔"

منیرہ کے باپ نے مداخلت کی، منیرہ کو سمجھایا "منیرہ! تجھے اپنے شوہر کا حکم
چاہیئے۔ آخر عامر بھی تو ہارون ہی کا بیٹا ہے۔"

منیرہ بے بس ہو گئی اور بادل نخواستہ ہارون اور اس کے بہنوئی کے ساتھ
گھر پہنچ گئی۔ لڑکی کا نام رابعہ تھا اور وہ اپنی شکل و صورت سے حور لگتی تھی۔ بڑی
پلکوں کے ساتے میں بڑی بڑی بادام جیسی آنکھیں، دبلا متوازن اور متناسب جسم، چہرہ
شہابی رنگ سرتاپا کیف میں ڈوبی ہوئی کہ جو دیکھے اس پر نشہ چڑھ جائے۔ باتوں
سلیقہ اور آواز میں موسیقی کی کھنک، منیرہ کو یہ لڑکی بہت پسند آئی۔ رابعہ کے گھر و
نے ان سب کی بڑی تواضع کی۔ منیرہ نے لڑکی کی ماں سے پوچھا "محترم خاتون! کیا
عامر کو دیکھا ہے جس کو اتنی اچھی لڑکی سونپ دینا چاہتی ہو؟"

لڑکی کی ماں نے جواب دیا "نہیں، میں نے لڑکا تو ابھی تک نہیں دیکھا
بھائی ہارون کو ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ظاہر ہے ہارون کا بیٹا بھی ہارون جیسا
ہی ہو گا۔"

منیرہ نے کہا "افسوس کہ یہاں یہ صورت حال ہرگز نہیں۔ اگر تم میرا کہا
تو عامر کے چھوٹے بھائی ابراہیم سے اس کا رشتہ کر دو۔ اللہ نے چاہا تو بڑے
سے رہے گی۔"

لڑکی والوں نے بھی معاملہ کی اہمیت اور نزاکت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا
لڑکی کی ماں نے پوچھا "کیا عامر اچھا لڑکا نہیں ہے؟"

منیرہ نے جواب دیا "عامر میرا بیٹا نہیں ہے اس لیے میں اس کی ضامن
نہیں بن سکتی اور پھر یہ کہ عامر میرے پاس رہا بھی نہیں، وہ ہمیشہ دور رہا
رہا ہے۔"

رابعہ کی ماں نے پوچھا: "اگر ایسی بات تھی تو عامر کی طرف سے میری لڑکی کو
یوں آنی تھیں؟"

منیزہ نے جواب دیا: "میں لڑکی کو دیکھنے نہیں لڑکی کے گھر والوں کو سب
نے آگئی تھی۔"

لڑکی کے گھر والوں نے ابراہیم کا رشتہ قبول کر لیا اور رابعہ کے بڑوں نے باہر یہ
کہ "رابعہ کو ابراہیم کے لیے پسند کر لیا گیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو کسی ایسے لڑکے
منسوب نہ کریں گے جو اپنے باپ سے دور رہ کر پلا بڑھا ہو، وہ یقیناً
ر سر پھر لڑکا ہوگا۔"

اس غیر متوقع اعلان نے ہر کسی کو چونکا دیا۔ ہمونی نے حیرت سے کہا: "یہ کیا
ن، یہاں ابراہیم کا رشتہ لے کر کون آیا تھا؟"

ہارون نے جواب دیا: "بھائی! میں سب کچھ سمجھ گیا۔"

یہ سب لڑکھال اور افسردہ سب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو ان سے بولا نہیں
ا۔ پچھے پاؤں لوٹ جاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منیزہ کسی کی پرواہ کیے بغیر
ے میں چلی گئی۔ عامر ہر کا بکا معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی زبان
سوال بھی نہیں کر سکا تھا۔ دوسری طرف عامر کا باپ ہارون منیزہ سے برہم
بھی منیزہ کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔ منیزہ بے حد خوش تھی وہ اپنا
ا رہی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے پیچھے ہارون کو دیکھ لیا اور فوراً گھوم گئی۔
ون! خیریت تو ہے؟"

ہارون نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا: "منیزہ! یہ کیا ہو گیا؟"

منیزہ نے پوچھا: "کیا ہو گیا، میں نہیں جانتی کہ تم کیا جاننا چاہتے ہو۔"

ہارون نے کہا: "ہم لوگ عامر کے رشتے کی بات کرنے گئے تھے۔"

منیزہ نے جواب دیا: "بے شک! لیکن وہ لوگ عامر کے بجائے ابراہیم کو پسند
ے۔"

ہارون نے افسوس سے کہا: "وہ خود عامر کے بجائے ابراہیم کو نہیں پسند کرتے
نے انہیں اس پر آمادہ کیا ہے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

منیزہ نے ناگن کی طرح پھنکار کر جواب دیا: "انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں
ن بن رہی ہوں، میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو بچہ میرے پاس نہ رہا ہو اسے

میں نے نہ پالا پوسا ہو اور جو اپنے ماں باپ سے دور بچھو پلس کے پاس رہا ہو، میں اس کی ضا
کس طرح بن سکتی ہوں۔"

ہارون نے تلملا کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ "تو نے غلط بیانی کی ہے، عامر ہم سے د
کبھی بھی نہیں رہا، اس کا پھوپا بھی ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے اور پھر تو عامر کی ضا
نہ بن، میں تو ضامن بن سکتا ہوں۔"

منیرہ نے آہستگی سے کہا۔ "لیکن اب تو میں ابراہیم کی بات کر بھی آئی۔ عامر کی ع
زیادہ ہے جبکہ ابراہیم اس کے لئے بالکل موزوں ہے۔"

ہارون نے سختی سے کہا۔ "لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ رشتہ عامر ہی سے ہوگا
ابراہیم سے بھی نہیں۔"

منیرہ نے تیوریاں چڑھا لیں۔ "ہارون! میں نے کبھی کسی معاملے میں ضد نہیں
کی لیکن جب میں نے ابراہیم کے لئے زبان دے دی ہے تو یہ رشتہ ابراہیم سے ہی ہ
کرے گا۔"

ہارون چیخ پڑا۔ "میں ایک عرصے سے تیری نیا دتیاں دیکھ رہا ہوں۔ تو
عامر پر جو ظلم کیے، میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا ہوں لیکن اب تو ان زیادتیوں
باز آجا، ابراہیم اور عامر میں نفرتوں کی خلیج نہ پیدا کر، کیونکہ ہم دونوں کے بعد انہیں
جل کر زندگیاں گزارنی ہیں، اگر ان میں نفرتیں پیدا ہو گئیں تو یہ زندگی بھر آپس ہی
لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔"

منیرہ اپنے فیصلے پر قائم رہی، بولی۔ "ہارون! تو میری عادت سے واقف ہے
نے ایک بار جو فیصلہ کر لیا، کر لیا۔ میں فیصلے بدلنے کی قائل ہی نہیں۔ بہت عرصہ
سب میں نے تجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اسے لوگوں کی مخالفت کی پروا
بغیر پورا کیا۔ پھر جب تم لوگوں نے سازش کے ذریعے مجھے بے اولاد رکھنا چاہا اور
نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بچے کی ماں بن کر رہوں گی تو میں اپنا مقصد حاصل کر
رہی، اور اب میں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ رابعہ کی شادی ابراہیم سے ہوگی تو یہ
ابراہیم ہی سے ہو کر رہے گی۔"

ہارون نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ گزشتہ تلخیوں کو بھلا
جائے اور خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے۔"

منیرہ نے جواب دیا۔ "تو اس کے لیے بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ رابعہ سے ا

ردی جاتے۔"
ہارون نے خوب اچھی طرح محسوس کر لیا کہ منیزہ کسی طرح بھی اپنا فیصلہ
لے گی تو اس نے ایک دوسری ترکیب پر عمل کرنا شروع کیا۔ وہ ابراہیم کو گھر
کھور کی بیلوں کے سایے میں لے گیا اور پوچھا "ابراہیم! سچ بتا عامر تجھے
؟"
ابراہیم نے جواب دیا "بھائی عامر بہت اچھے ہیں، مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"
ہارون اس جواب سے بہت خوش ہوا، بولا، "بیٹے! میں تیری ماں کی مخالفت
ہا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دانستگی یا نادانستگی میں تیری ماں نے عامر پر ظلم کیے
ی کی ہے۔"
ابراہیم کے چہرے پر افسوس اور ندامت کے اثرات پائے جاتے تھے، بولا "لیکن
ں ہے میں اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔"
ہارون نے خوشامدانہ کہا "میں یہ نہیں کہتا کہ تو اپنی ماں کی مخالفت کر، بلکہ میں یہ
ہ کہ تو اس شادی سے انکار کر دے۔"
ابراہیم نے سر جھکاتے ہی جھکاتے جواب دیا "میں نے شادی پر آمادگی ہی کب
ی، مجھے بھائی عامر سے ہمدردی ہے۔"
ہارون نے بے اختیار ابراہیم کو اپنے سینے سے لگا لیا "جزاک اللہ میرے بچے!
ے اور صالح ہے۔"
عامر کا پھپھا منیزہ کی حرکت سے اتنا بدظن اور دل برداشتہ تھا کہ وہ منیزہ کے
خطرناک عزائم کا منصوبہ تیار کرنے کی فکر میں تھا اس عورت کے خلاف کوئی
ہ مگر خطرناک منصوبہ بنایا جائے کہ منیزہ کو بس مزہ ہی آجائے۔ اس نے کئی
ہا بے چینی میں گزار دیں اور منیزہ کے خلاف ہی سوچتا رہا۔ اس دوران عامر بھی
ہن میں نہیں تھا وہ بھی معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ گھر سے کافی کافی
ائب رہنے لگا اور آخر یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ وہ سارا سارا دن غائب
ن اور اس کا بہنوئی دونوں ہی عامر کی ان حرکتوں سے پریشان تھے مگر عامر
، پر سرکش کے آثار دیکھ کر دونوں ہی خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔
ایک دن علی الصبح عامر باہر جانے لگا تو اس کے پھپھا نے اس کو روک لیا
تو کہاں جا رہا ہے؟"

عامر نے جواب دیا "میں شام تک واپس آجاؤں گا۔"

پھوپا نے کہا "تو آج کہیں نہ جا، کیونکہ میں منیزہ اور تیری چپقلش کے مستقبل کے ہنگامے دیکھ رہا ہوں۔ اس خاموش ماحول کی مثال اس ماچس جیسی ہے جس کے اندر چنگاریاں چھپی ہوں اور جو کسی بھی وقت آگ میں بدل جانے کو تیار ہو۔"

عامر نے جواب دیا "پھوپا جان! میں خود کو اس ماحول میں غیر اور اجنبی محسوس کرتا ہوں اس لیے میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔"

پھوپا نے راستے دی "میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تیرے باپ کو مال و زر کی پرواہ نہ کروں کیونکہ میں نے منیزہ کی فطرت اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ ہارون کی غلامی میں یہ تجھ کو تیرے حق سے بھی محروم کر دے گی۔"

عامر نے جواب دیا "میں مال و زر کو مصیبت سمجھتا ہوں، اس لیے میرے کا مال و زر اس کو مبارک، مجھے اس میں سے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔"

پھوپا بگڑ کر کھڑا ہو گیا "یعنی اب تو میری بات بھی نہیں مانے گا۔ مال مصیبت نہیں کا راستہ ہے۔ میں تجھ کو یوں منفی انداز فکر پر قائم نہیں رہنے دوں گا۔"

لیکن عامر نہیں رکا اور چلا گیا۔ اس کا پھوپا سارا دن ہارون سے لڑتا جھگڑتا رہا کہ وہ اپنی نہ سہی اسی میں عامر کا حصہ الگ کر دے لیکن ہارون اس پر یوں خفا ہوتا تھا کہ وہ پہلے عامر کی شادی کرنا چاہتا تھا اس کے بعد اس کو الگ کر کے خود کے ساتھ رہنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

لیکن پھوپا نے اصرار کیا "نہیں، پہلے تقسیم بعد میں شادی اور آخر میرے ساتھ رہائش۔"

کسی طرح منیزہ کو بھی اس بحث مباحثے کا علم ہو گیا۔ اس نے دونوں کو دیا۔ بولی "جب تک میں موجود ہوں ایسا نہیں ہو گا۔ مال و زر نہیں تقسیم ہو گا شادی کرے گا تو وہ ساتھ رہے یا الگ، میں اپنے پاس سے اسے کچھ بھی نہ دوں کیونکہ مجھے اپنے ابراہیم کی فکر ہے۔"

لیکن ابراہیم نے صاف صاف کہہ دیا کہ "ماں جس مال و زر کی طمع میں آپ سہارا نے کر بھائی عامر کو ان کے حق سے محروم کرنا چاہتی ہیں میں اس میں آپ کا نہیں دوں گا۔"

نیزہ نے ڈانٹ دیا "تو چپ رہ نادان لڑکے، تیری بہنوئی کو جتنا بہتر میں سوچ
کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔ تیری ماں نے اس موجودہ مال و زر کو بڑی
محنت سے محفوظ رکھا ہے اگر میں ایسا نہ کرتی تو آج اس گھر میں خاک اڑ
رہی کو بھی حق، حصے کی باتوں کا موقع نہ ملتا۔"

ارون نے اپنے بہنوئی کو مخاطب کیا "بھائی! تم عامر سے کہہ دو کہ میں اس کو اس
سے دے دینا چاہتا ہوں اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر دیوار کو میں
" پھر نیزہ سے کہا "اور نیزہ! تو بھی اچھی طرح میری بات ذہن نشین کر لے
اس معاملے میں میری مخالفت کی تو میں پھر بھی وہی کروں گا جس کا میں
یا ہے اور تیری خدمت پیش نظر یہ بھی ممکن ہے کہ میں تجھ سے ہمیشہ کے
ن اختیار کر لوں۔"

نیزہ نے بھی سختی سے جواب دیا "ہارون! میں اپنے مال و زر کے حصے بخرے
نے دوں گی۔ اگر تو اس بہانے سے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے تو
ے بھی تیار ہوں کیونکہ یہ میری انا کی بات ہے، اور میں اپنی اور اپنے بیٹے
ں حقیر ہو جانا کسی قیمت پر بھی گوارا نہ کروں گی۔"

ن ہارون اپنی ضد پر اڑا رہا اس نے اپنے بہنوئی سے کہا "بھائی! عامر کو بلاؤ
بھی اور اسی وقت چکا دیا جائے۔"

نوئی نے جواب دیا "عامر گھر میں موجود نہیں ہے، امید ہے شام تک واپس
نا یہ قضیہ بھی چکا دیا جائے گا۔"

یزہ نے اپنے بیٹے ابراہیم کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی "مجھ
یہ معلوم تھا کہ ہارون کو دغا دیا جا رہا ہے مگر مجھے کوئی پرواہ نہیں۔
نمت لوں گی۔"

ون اور اس کے بہنوئی نے بھی بحث ختم کر دی اور دونوں ہی عامر کی واپسی
لگے۔

ام ہو گئی مگر عامر نہیں آیا، رات ہو گئی مگر عامر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ پھر نصف
پھر پاکم مگر ہارون زیادہ فکر مند ہوا۔ دوسری صبح نمودار ہوئی مگر عامر
تھا۔ ہارون تلملایا تلملایا ادھر ادھر پھرتا رہا وہ عامر کی تلاش میں اپنا
ا رہا۔ نیزہ بہت خوش تھی کہ ایک کانٹا جو اس کے دل میں مستقلاً چبھ

رہا تھا اب دوسرا ہو چکا تھا۔ وہ ہارون اور اس کے بہنوئی کی پریشانیوں سے بے
ہو رہی تھی۔

ایک دن، دو دن، چار دن، ہفتہ، کئی ہفتے، مہینہ، دو مہینے پھر چ
گئے مگر عامر کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ہارون کا اضطراب بڑھتا رہا۔ اس کو غم نے نڈھا
پژمردہ کر دیا۔ بچہ پاگل تھا مگر نسبتاً کم۔ اب ہارون کم گو ہو گیا تھا
کے غم کو دیکھ کر ابراہیم عامر کی تلاش میں نکل گیا کہ پھر وہ بھی واپس نہ آیا۔ ا
گمشدگی نے منیزہ کو بھی ہلا ڈالا۔ اب یہ گھر مستقل بیت الحزن بن چکا تھا۔ کسی کا
میں دل ہی نہ لگتا۔ منیزہ کا باپ بھی خود فردہ اور فکر مند رہنے لگا تھا۔ منیزہ
کہ اس کا بیٹا ابراہیم کسی کی سازش کا شکار ہوا ہے اور اس سے خیال میں اس سے
باقی سیانی ہارون کا بہنوئی تھا۔ منیزہ کا بس چلتا تو وہ ہارون کے بہنوئی
چبا جاتی۔

دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے ہارون کو مژدہ کر دیا۔ اب اس کا کسی
دل ہی نہ لگتا۔ منیزہ بھی اکثر و بیشتر روتی ہی رہتی۔ ہارون کا بہنوئی بھی ا
لگا تھا۔ منیزہ کا باپ مرنے کی خواہش میں جی رہا تھا۔ ہارون اور منیزہ گاہے
میں جھگڑ پڑتے۔ ہارون کہتا "یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے تیری خود غرضی
کہیں کا بھی نہ رکھا۔"

منیزہ کہتی "ہارون! مجھے مورد الزام ٹھہرا کر میرے زخموں پر نمک
اگر زیادہ تنگ کیا تو میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے کہیں دفعان ہو جاؤں
اور تو تو میں میں کسی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔

ہارون نے آنا کر بدرجہ مجبوری اپنے سابقہ پیشے سے رجوع کر
روانہ ہو گیا۔ ان دنوں کوفے اور بصرے میں خلافت کی نیابت حجاج
کوفی چکی تھی اور وہ خوارج کے خلاف مہمات میں بڑی طرح الجھا ہوا تھا
سپاہیوں کی ضرورت تھی چنانچہ وہ بڑی آسانی سے لوج میں داخل کر لیا
حجاج کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ ہارون وہی شخص ہے جس
میں وہاں کے عامل امیہ کا ساتھ چھوڑ کر باغی بکیر کی حمایت کی تھی تو غضب نا
(اگر اس بار بھی غداری کی تو یہ سمجھ لے کہ میں امیہ سے قطعی مختلف انسان ہوں
زندہ اسارہ میں امیہ کی جگہ میں ہوتا تو آج تو نظر نہ آتا، تیری خاک کا بھی

ں کو معاف نہیں کرتا۔"

ادون نے جواب دیا۔" امیر! میں نے کوئی غداری نہیں کی تھی، اگر میں غدار
حشر بھی غداروں کے ساتھ ہو چکا ہوتا، لیکن میں ایک وفادار انسان ہوں
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں میں اپنی گردن تک
۔"

اج نے کہا۔" تب پھر جیش میں شامل ہو جا جو دشمنانِ خدا اور دشمن خدا
پیکار ہے اگر تیری جیش نے انہیں شکست دے دی تو میں تجھے اور تیرے
انعام واکرام سے نواز دوں گا۔"

دون نے افسردگی سے جواب دیا۔" امیر! میں لالچی نہیں ہوں اس لیے میں اپنی
انعام واکرام کی صورت میں نہیں لوں گا۔ میں حمص سے چل کر یہاں آیا ہوں،
سبب میں انعام واکرام کا مستحق ٹھہروں تو مجھے کوفے میں رہنے کی جگہ دے

اج نے پوچھا۔" تجھ کو حمص میں کیا تکلیف ہے جو تو کوفے میں منتقل ہو جانا
؟"

دون نے جواب دیا۔" امیر! میرے دو بیٹے معلوم نہیں کہاں چلے گئے، اس لئے
ں رہائی اذیت محسوس کرتا ہوں جہاں میرے دونوں بیٹے رہتے اور
تھے۔"

اج نے کہا۔" تو فکر نہ کر، خوارج کے فتنے سے نجات مل جائے تو میں تیرا انتظام کرنے
گا۔"

دون نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ حمص واپس نہیں جائے گا۔ اس
رت ہو گئی تھی کیونکہ وہ پورے لشکر کا نیزہ ہی کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔ دونوں بیٹوں
اس میں مایوسی اور قنوطیت پیدا کر دی تھی۔ اس نے خدا سے تو لگاتی تھی
ہی دعا مانگتا رہتا تھا کہ" خدایا یا تو خوارج کے مقابلے میں مجھ کو کامیاب
ے یا پھر شہادت سے ہمکنار کر دے۔"

دون کو مشہور غارتی سردار شبیب کے مقابلے پر بھیج دیا گیا۔ شبیب نے اموی
نوں پر شکستیں دے کر تہلکا مچا دیا تھا حجاج ان شکستوں کی وجہ سے
تھا اور دن رات شبیب اور خوارج کا خوف اور اندیشہ کھائے جا رہا تھا۔

حجاج کو یہ خبر مل چکی تھی کہ شبیب اپنی فوج کے ساتھ کوفے کی طرف بڑھا چلا آ رہا
حجاج فرات کے کنارے اپنے محل میں بیٹھا فوجی ترتیب میں مشغول تھا۔ شبیب
کے دوسرے کنارے سنجہ نامی قصبے میں پڑاؤ ڈال کر حجاج کا انتظار کرنے لگا۔ ہا
دستہ شبیب کے مقابل حجاج کے حکم کا منتظر ڈٹا ہوا تھا۔

حجاج نے محل کی چھت سے میدان جنگ کا معائنہ کیا۔ اس نے فرات کے
سنجہ میں مسجد کے سامنے شبیب کی فوج کو پڑاؤ ڈالے دیکھا۔ شبیب کے پاس فوج
نہیں تھی اس لیے وہ فرات کے کنارے کو دور تک محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ ا
نے فوراً ہی ایک فرمان کے ذریعے ہارون کے دستے کو فرات کے اس پار اتر وا دیا ا
سے تاکید کر دی کہ وہ شبیب سے خوفزدہ ہوئے بغیر اپنی جگہ اس وقت تک ڈ
جب تک وہ خود ان کی مدد کو نہ پہنچ جائے۔

محل کی چھت سے اچھی طرح جائزہ لے چکنے کے بعد حجاج نیچے اترا
دو غلاموں کو زرق برق لباس پہنا کر ساتھ لیا اور اپنی سپاہ کو لے کر فرات کے پا
حجاج کی مخصوص کرسی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ حجاج سنجہ کی مسجد
کا منصوبہ بنا چکا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ اگر خارجیوں کی اس مسج
پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ شبیب اور اس کے ساتھیوں کو خوفزدہ کرنے
ہو سکے گا۔

شبیب نے حجاج کی فوج کو جمع ہوتے دیکھا تو وہ ان کی طرف بڑھا۔
زرق برق لباس میں ڈوبے ہوئے اپنے ایک غلام کو حکم دیا "اے شخص! اگر
کو ہلاک یا زخمی کر دے گا تو ایک بہت بڑے انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔ آگے
شبیب کو قتل کر کے آ جا"

غلام نہایت شان اور آن بان سے آگے بڑھا اور شبیب کو للکارا۔ شبیب
کو حجاج سمجھ کر آگے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ غلام اور شبیب میں ذرا دیر مقابلہ ہوا ا
لمحوں بعد شبیب نے غلام کو قتل کر دیا۔ وہ جوش و خروش سے گھوڑا اڑاتا ہوا
فوج کے قریب چلا گیا اور اعلان کیا "اے مجھ سے نبرد آزما لوگو! اگر یہ حجاج تھا
برقی لباس میں میرا مقابلہ کرنے آیا تھا تو جان لو کہ میں نے اس کو قتل کر دیا اور
اس کے خوف اور عذاب سے نجات پا چکے ہو"

حجاج نے دوسرے غلام کو حکم دیا "اب تو جا اور شبیب کے دانت

تے ہوتے اس کو ہلاک کر دے۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھے آزاد بھی کر
دوں گا بلکہ کسی بلند منصب پر فائز بھی کر دوں گا۔"

غلام جوش اور جذبے سے آگے بڑھا، شبیب نے ایک دوسرے شاندار شخص
کو آتے دیکھا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ شاید حجاج وہ نہیں تھا جو قتل ہوا، بلکہ
یہ جواب اس کے مقابلے پر آیا ہے۔ وہ پچھلے جوش و خروش سے اس کی طرف
بڑھے وار کرنے لگا۔ غلام بھی معمولی شمشیر زن نہیں تھا، اس نے بھی بڑی
اور مہارت سے شبیب کا مقابلہ کیا۔ شبیب نے کہا "افسوس کہ میں نے تجھ سے
نص کو حجاج کے دھوکے میں قتل کیا تھا، وہ تو نہیں کوئی اور ہی تھا لیکن خیر اب
ہر آیا ہے تو میری تلوار کا مزہ چکھ۔"

غلام نے بھی یہی تاثر دیا کہ وہی حجاج ہے، بولا "شبیب! کیا تو مجھے کوئی معمولی
سپاہی ہے؟ یاد رکھ کہ میں حجاج ہوں اور تیری موت میرے ہاتھوں لکھی گئی ہے۔"
شبیب نے کہا "افسوس کہ تو انسان ہو کر خدائی کا دعویدار ہے اور تو تیرے
بھی نہ کہتا کہ میری موت تیرے ہاتھوں لکھی گئی ہے۔"

غلام نے ہنس کر جواب دیا "اس میں کیا ہے، ابھی پتہ چلا جاتا ہے کس کی موت
کہاں لکھی گئی ہے۔"

حجاج ان کی باتوں اور جذبوں سے خاصا متاثر تھا۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیا "مجھے
پالکی سمیت آگے بڑھاؤ یہاں تک کہ میں اس مسجد کے قریب ہو جاؤں کیونکہ میں خواب
میں جب میں اس مسجد کے پاس پہنچ جاؤں گا تو گویا فتح میری ہی ہو گی۔"
پالکی کو کرسی ذرا آگے بڑھا دی گئی۔

حجاج کا غلام طہمان اور شبیب کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پھر
ان کا بھی کام تمام کر دیا۔ حجاج کا غلام طہمان زخمی ہو کر جیسے ہی گرا، شبیب
لوگوں سے کہا "دوستو! اگر یہ شخص حجاج تھا تو میں نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔"
شبیب کے کسی ساتھی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے حجاج کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے امیر المومنین آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حجاج تو وہ رہا، جو کرسی پر تمکنت
سے

شبیب نے دور سے حجاج کو دیکھا اور بڑے اطمینان سے کہا "نہیں اگر حجاج ابھی
اپنے انجام کو پہنچنے کے لئے، اور اللہ نے چاہا تو اس دشمن فلاح و خیر

سے میں ہی نجات دلاؤں گا۔"

دوسری طرف حجاج اپنی فوج سے کہہ رہا تھا "اے اطاعت شعار اور فر
تم ثابت قدم رہو، اگر تم نے میرا کہنا مانا تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہما
اور فتح کے درمیان کوئی شے حائل نہیں رہے گی۔"

ابھی حجاج کا خطاب پورا بھی نہ ہوا تھا کہ شبیب نے ان پر بھرپور حم
شبیب اپنے چھ سو آدمیوں کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا لیکن حجاج کی موجودگی
کی سپاہ کے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ دھوپ کی چمک میں ہتھیار نظروں کو چیر
تھے۔ دونوں طرف سے تلواریں نیزے اور تیر انسانوں کو ہلاک اور زخمی کر رہے تھے
اور اس کے ساتھیوں کی ساری کوشش حجاج نے خاک میں ملا دی تھی اور وہ خا
پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے خارجی پسپا ہو رہے تھے حجاج کی
کی مسجد کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ شبیب نے اپنے ساتھیوں کو جوش دلایا "اے
کے دستو! اب گھوڑوں کی پشت پر سوار رہنے کا وقت نہیں رہا، پیچھے آجاؤ اور
سپاہ کو مسجد کی طرف بڑھنے سے روک دو۔"

ہارون نے حجاج سے اجازت طلب کی "امیر! میں اس خارجی سردار کو مو
گھاٹ اتار کر امر ہو جانا چاہتا ہوں۔"

حجاج نے جواب دیا "پھر انتظار کس بات کا، آگے بڑھ اور آب شجا
اس شعلہ جوالہ کو سرد کر دے۔"

ہارون نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، لیکن وہ جیسے ہی خارجیوں کے قریب
خوارج کی پیدل سپاہ میں سے چند سپاہی آگے بڑھے اور انہوں نے ہارون کے گھ
کی ٹانگوں کو کاٹ دیا۔ گھوڑا اگلی ٹانگوں کے کٹ جانے سے منہ کے بل گر گیا۔
گھوڑے کے سامنے ذرا فاصلے پر اس طرح جا گرا، گویا اس کو اٹھا کر پھینک د
ہارون کے ہاتھ کی تلوار بھی گر گئی۔ ہارون کو اس حادثے میں بھی یہ احساس باقی
خارجی اس کو چاروں طرف سے گھیر کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس نے چوٹ کی پروا
ذرا اٹھ کر واپس جانے کی کوشش کی لیکن ایک خارجی نوجوان نے اپنی تلوار کو
کے سینے پر رکھ دی اور حکماً کہا "بھاگنے کی کوشش مت کر، چپ چاپ کھڑا
ہلاک کر دیا جائے گا۔"

اس شناسا آواز نے ہارون کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ اس نے

طرف دیکھا اور خوشی میں چلایا۔ "اے عامر! یہ تو ہے؟ مگر تو یہاں کہاں؟"
مر کی تلوار کی نوک اب بھی ہارون کے سینے میں چبھ رہی تھی۔ عامر نے جلدی
نسوں کہ میں باپ ہونے کے باوجود تجھ کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ تو شاطی
ں بن مروان کو مسلمانوں کا امیر المومنین سمجھتا ہے اور میں شبیب کو اپنا
ں"
نی دیر میں دوسرے خارجی بھی ان دونوں کے آس پاس جمع ہو گئے اور ہارون
ن کے غالبوں میں چلا گیا۔ عامر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دوستو! افسوس کہ
یر میرا باپ ہے اس لیئے میں اس کو ہلاک نہیں کر سکتا، اگر فتار کر کے امیر المومنین
ے سر دوں گا جو وہ تم کو انعام میں دے دے دی جائے گی۔"
بن انہی میں سے ایک درا شنا نوجوان ہارون کے سامنے آ کھڑا ہوا، یہ
ں سوتیلی ماں کا بیٹا تھا۔ ہارون ایک بار پھر چیخا۔ "ابراہیم یہ تو ہے، واللہ
ہا ہوں؟"
امر نے پھر جواب دیا۔ "ہاں اب ابراہیم بھی ہمارے ہی ساتھ ہے ہم لوگوں
دنیا آخرت کے لیے فروخت کر دی ہے اس لیے ہمارے دلوں سے رشتوں کا
ل گیا۔"
جاج دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ان نے ہارون کو گھوڑے سمیت گرتے ہوئے
اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اے اللہ کے بندو! تمہارا ایک بھائی مصیبت میں
فوراً اس کی مدد کو پہنچو۔"
شامی سپاہ کا ایک دستہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور آناً فاناً ہارون سمیت کئی خارجیوں
ے میں لے لیا۔ حجاج کے کئی اور دستے بھی مختلف سمتوں سے بڑھ کر دہیں
ر خارجیوں کو بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ اب پانسہ پلٹ چکا تھا۔ عامر نے اپنی
سینے پر سے ہٹا کر شامیوں سے مقابلہ کرنا چاہا مگر شامیوں نے کمر میں پھینک
نہیں گرفتار کر لیا۔ انہی میں عامر اور ابراہیم بھی شامل تھے۔ ہارون نے اپنے دونوں
یوں میں جکڑا ہوا دیکھا تو بے چین ہو گیا۔
شبیب نے اپنے آدمیوں کو گرفتار ہوتے دیکھ کر شامی دستے پر یلغار کر دی لیکن
حجاج خارجیوں کو طاقتور کمک پہنچا چکا تھا۔ اس کی کمک نے خوارج کو تلواروں
رکھ لیا۔ اور اس میں شبیب کا بھائی مصاد قتل کر دیا گیا۔ خوارج نے خود کو

مجتمع کر کے فیصلہ کن وار کیا مگر شامیوں نے انہیں شکست دے دی۔ شبیب
ساتھیوں کو حکم دیا۔ "اے اللہ کے دوستو! اپنے بہترین وقت کی توقع میں با
محلوں سے منہ موڑ لو، شاید تمہارا والا کل ہمارے لیے نفع بخش اور مفید ہو۔"
خوارج پیچھے ہٹے۔ حجاج اپنی سپاہ کو آگے بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ
ساتھیوں سمیت پیچھے ہٹ گیا اور حجاج مسجد کے قریب پہنچ کر سپاہ سے ا
مسجد کے قریب جا ٹھہرا ہوا اور اعلان کیا۔ "اے اطاعت شعارو! اس ذات کی
کے دست قدرت میں حجاج کی جان ہے۔ یہ پہلی فتح ہے جو ہمیں حاصل ہوئی ہے
پھر وہ بیس آدمیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گیا اور اپنے آدمیو
دیا۔ "دوستو! تم اپنے اپنے چلوں میں تیر لگائے رکھو اور جب یہ دیکھو کہ خارجی
بڑھ رہے ہیں تو انہیں تیروں کی بوچھاڑ سے روک دو۔"
شبیب نے حجاج کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو مایوس ہو گیا۔ و
بھرتے دریا کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ساتھیوں سمیت دریا پار ا
جب وہ سب دریا پار اتر گئے تو شبیب نے پل توڑ دیا تاکہ اموی سپاہ اس کا
نہ کر سکے۔
حجاج قیدیوں کو لے کر اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ ہارون اپنے دو تو
لعنت ہیں حجاج سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ حجاج
اور سفاک انسان ہے وہ معاف کرنے کا قائل ہی نہیں۔
حجاج نے اسیر خوارج کو قید خانے میں ڈلوا دیا اور خود آرام کرنے کے
جانے لگا اس نے اپنی سپاہ کا ایک طاقتور دستہ طلایہ گردی کے لیے چھوڑ دیا
طلایہ گرد دستے کا سردار ہارون کو مقرر کر دیا مگر ہارون نے یہ منصب قبول کر
انکار کر دیا۔ حجاج یہ بات کہاں برداشت کر سکتا تھا، غضب ناک ہو کر بولا۔
حکم عدولی کا سخت مخالف ہوں مجھے منصب قبول کرنے میں تامل کیوں ہوا؟
ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہ
میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔"
حجاج نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ "میں زبان درازی بھی پسند نہیں
حکم ہے کہ تو اس وقت طلایہ گرد دستے کو لے کر دریا کے کنارے کنارے
کیونکہ شبیب کا کوئی بھروسہ نہیں، وہ ہماری غفلت سے کسی وقت بھی فا

لیکن ہارون نے اٹل لہجے میں جواب دیا "لیکن میں نے کہہ جو دیا کہ میں
وقت تک آپ کے قریب ہی رہوں گا جب تک کہ گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ
نہ کر دیا جاتا"۔

حجاج نے کرختگی سے پوچھا "ان سے تیرا تعلق؟ ان سے تیری دلچسپی
کیا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی داستان کا کچھ حصہ
آپ کے گوش گزار کر دوں، پھر آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مجھے ان گرفتاروں سے
کیا کیوں ہے؟"

حجاج نے ہارون کو قہر کی نظروں سے دیکھا "اچھا بتا مگر مختصراً، اجمالاً۔
میں داستان گوئی بالکل پسند نہیں کرتا"۔

ہارون نے نہایت اختصار سے اپنی روداد سنا دی۔ حجاج بڑے انہماک
سے سنتا رہا۔ آخر میں جلدی جلدی پلکیں جھپکا بیٹھا اور درشتی سے کہا "افسوس کہ تو
سرداری کا منصب کس طرح سنبھالے گا کیونکہ تو وہ نالائق انسان ہے جو اپنے
بہن، بہنوئی، بیوی اور اولاد کسی پر بھی قابو نہیں رکھ سکا، اب میں اپنے آپ پر
لعنت بھیجتا ہوں کہ میں نے تجھ کو سمجھنے میں اتنی بڑی غلطی کیوں کی۔ میں تجھے فوراً یہ
منصب کی سرداری سے معزول کرتا ہوں"۔

اس کے بعد اس نے ایک دوسرے شخص کو سردار بنا کر روانہ کر دیا اور ہارون
سے کہا "اب تو یہاں سے دفعان ہو جا، میں تیرے سامنے تک سے بچنا چاہتا ہوں،
دفع ہو جا"۔

ہارون نے حجاج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ حجاج نے اس کی
آنکھوں میں تیزی محسوس کر لی، بولا "تو عورتوں کی طرح رو کیوں رہا ہے، ان
آنسوؤں کا مطلب؟"

ہارون نے جواب دیا "امیر! میں اپنے دونوں بیٹوں کے سلسلے میں آپ کی نظرِ کرم
کا طالب ہوں"۔

حجاج نے کہا "ہاں میں ان پر رحم کروں گا ان پر بھی اور تجھ پر بھی"۔

ہارون فرطِ خوشی سے مسکرا اٹھا "امیر! میں آپ کے رحم و کرم کا پیشگی شکریہ
ادا کرتا ہوں"۔

حجاج نے جواب دیا "کیسا شکریہ؟ کیسا رحم؟ میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ
ان دونوں نالائق اولادوں سے تیرا پیچھا چھڑا دوں۔ میں کل صبح ہی ان دونوں کو قتل
دوں گا تاکہ تیرا دل ان دونوں کی طرف سے اور زیادہ سخت ہو جائے اور ان نالائقوں
تیرا ہمیشہ کے لئے پیچھا چھوٹ جائے۔"

ہارون تلملا کر کھڑا ہو گیا "امیر! میں ان دونوں کا باپ ہوں میں یہ نہیں برداش
کر سکتا کہ میری دونوں اولادیں میری نظروں کے سامنے قتل کر دی جائیں۔"

حجاج نے سختی سے کہا "تو حمص واپس جا اور اپنے دونوں بیٹوں
صبر کر لے۔"

ہارون نے جواب دیا "امیر! میں ان کی طرف سے رحم کی درخواست
رہا ہوں۔"

حجاج نے کہا "ابھی ان پر مقدمہ چلے گا اس لئے رحم کی درخواست قبل
وقت ہے۔"

ہارون نے اپنے مقصد کا زیادہ شدت سے اظہار کیا "امیر! میں یقین دہانی چ
ہوں کہ آپ ان دونوں کو معاف کر دیں گے۔"

حجاج نے سختی سے جواب دیا "کیسی یقین دہانی، کس کی یقین دہانی! د
ہو جا یہاں سے، ورنہ میں ان دونوں کے ساتھ تجھے بھی بند کر دوں گا اور تو بھی
مستحق قرار پائے گا۔"

ہارون کا دل بھر آیا "امیر! تو مجھے قتل کر دے لیکن میرے بیٹوں کو رہا کر
حجاج نے کہا "تو ان بیٹوں کے لئے رحم کی درخواست کر رہا ہے جو ہمیشہ
بیری بریڈلے جوں کا باعث بنے رہتے ہیں۔ بخدا میں ان دونوں کو ایسی عبرت ناک سز
دوں گا کہ دیکھنے والے لرز جائیں، اور یوں بھی تیرا بڑا بیٹا عامر تو کسی حد تک عفو کا
بھی ہے مگر تیرا چھوٹا بیٹا ابراہیم، وہ سزا سے ہرگز نہیں بچ سکتا کیونکہ اس کی د
اور حاسدانہ سوچ آدمیوں کی اذیت اور پریشانی کا باعث بنی رہی ہے اب اس کو بھی
ہونا چاہیئے اب اس کو اذیتیں جھیلنا چاہئیں۔"

ہارون تھر تھر کانپنے لگا۔ حجاج اس کو لرزاں و ترساں چھوڑ کر اندر چلا گ
ہارون کے آنکھوں کے اندھیرا پھیل گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر جہ
تھا وہیں بیٹھ گیا۔

★ ★ ★

قیدی خوارج کو حجاج کے روبرو باندھ کر ڈال دیا گیا۔ امرا اور منصب دار
کے انتظار میں کھڑے تھے۔ رسیوں سے جکڑے ہوئے خوارج کے پیچھے جلاد اور
ردار کھڑے تھے۔ ہارون اور چند دوسرے منصب دار حجاج کے محل کے دروازوں
ج کھڑے اس کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ یہ لوگ اسیر خوارج کے لیے مقدمہ سے
ی معافی کی یقین دہانی حاصل کر لینا چاہتے تھے۔

کچھ دیر بعد جب پہرے دار ایک دم مستعد اور چاق و چوبند ہو گئے تو ہارون
سرے منصب داروں کو معلوم ہو گیا کہ حجاج کہیں قریب ہی موجود ہے اور عنقریب
ہونے والا ہے۔ کچھ دیر بعد حجاج اس طرح نمودار ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ چلتے
قاتا ہوا محل سے نکل رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو دو قدم پیچھے چار قاضی
خصوص لباس میں سر جھکائے چل رہے تھے۔ ایک قاضی کے دائیں ہاتھ میں کاغذ
ہ رقعے دبے ہوئے تھے اور ایسے ہی چند اور رقعے ایک دوسرے قاضی کے
ہاتھ میں تھے۔

ہارون اور اس کے پاس کھڑے ہوتے منصب داروں نے حجاج کا دامن پکڑنا چاہا
ج کے محافظوں نے انہیں مار مار کر دور ہٹا دیا۔

حجاج کسی کی پرواہ کیئے بغیر خوارج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک خدمت
اس کے پیچھے کرسی رکھ دی۔ حجاج اس پر بیٹھ گیا مگر چاروں قاضی مودب
رہے۔

حجاج نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ باری باری سے تمام خارجی اس کے روبرو
ائیں۔ یہ کل ستائیس خارجی تھے۔

جب ایک خارجی حجاج کے روبرو کھڑا کیا گیا تو حجاج نے پوچھا "او بے دین!
دا اور رہزن ہدا! بتا تیرا شبیب کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

خارجی نے جواب دیا "وہ امیر المومنین اور امام ہدا ہیں!"

حجاج نے پوچھا "اور امیر المومنین حضرت عبدالملک بن مروان کے بارے
ی کیا رائے ہے؟"

خارجی نے جواب دیا "خدا اس کو ذلیل اور رسوا کرے۔ تو نے امام ہدا کے مقابلے

میں کس گمراہ کا نام لے لیا۔"

حجاج نے بائیں ہاتھ کے رہنے والے قاضی سے ایک پرچہ لے لیا اور اس خا
کے حوالے کر دیا اور کہا "اس میں تیری سزا لکھ دی گئی ہے۔ چند لمحہ صبر کر، پھر میرا جلاد
کوئی ڈرہ بردار اس پرزے میں لکھی ہوئی سزا کے مطابق تجھے نواز دے گا۔"

اس کے بعد حجاج کے روبرو دوسرا قیدی پیش کیا گیا، حجاج نے اس سے بھی
اسی قسم کے سوالات کیے۔ اس نے بھی بڑی دلیری سے ویسے ہی جوابات دیئے، جو اس
پیش دو دے چکا تھا۔

زخمی ہارون بھاگتا ہوا آیا اور اپنے بیٹوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ حجاج کے آدمی
لے ایک بار پھر زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہارون کو یہاں سے ہٹا دینا چاہتے تھے
لیکن حجاج نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے آدمیوں کو منع کر دیا کہ وہ ہارون کو جہاں کا
ہے کھڑا رہنے دیں۔

ہارون نے سرگوشی میں اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھایا "بیٹو! خبردار جو تم نے حجا
مخالفت کی تم دونوں خوب سوچ سمجھ کر وہی جوابات دینا جس سے وہ خوش ہو جائے
حجاج سے رحم کی امید کرنا حماقت ہے۔"

عامر نے جواب دیا "لیکن باباجان! میں جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ جھو
بولنا زنا سے بڑا گناہ ہے۔"

ہارون نے ابراہیم سے پوچھا "ابراہیم! کیا تو نے میری بات سنی؟"

اس نے جواب دیا "ہاں میں نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔"

ہارون نے کہا "چنانچہ حجاج کو اس کے سوالوں کے ویسے ہی جواب دینا جا
ہے وہ خوش ہو جائے۔"

ابراہیم نے جواب دیا "باباجان! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آپ لوگ و
فاتحوں کے زیر اثر جھوٹ بول دینا آسان اور جائز سمجھتے ہیں جبکہ ہمارا ایمان ہے
کہ گردن کو سچ پر قربان کر دو۔"

ہارون چیخ مار کر رو دیا "او اپنے باپ کی دشمن اولاد! میں جانتا ہوں
دونوں بے دین اور گمراہ ہو چکے ہو اور میری باتیں کسی طرح بھی نہیں مانو گے اور
صاف مطلب یہ ہے کہ تم دونوں کے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔"

حجاج نے دور ہی سے ڈانٹا "او ذلیل اور خائن برباد ہارون! تو کیا دغا

"ادھر میرے پاس آجاؤ اور دیکھو میں تیرے بیٹوں کو بدترین سزا دے بیٹھوں گا۔"

ہارون نے اپنے بیٹوں سے مزید کہا: "بیٹو! مناسب تو یہی ہے کہ تم دونوں وہی کرو جو میں نے کہا ہے، ویسے تمہاری مرضی۔" پھر آنکھوں سے اُبل پڑنے والے آنسوؤں کو دامن سے پونچھتا ہوا حجاج کے پاس چلا گیا۔

حجاج نے طنز کیا: "او ظالم انسان! جن بیٹوں کو تو شب و روز اپنے پاس رکھ کر راضی ہونے سے نہیں روک سکا، اب انہیں چند نصیحتوں کے ذریعہ خارجیت سے منحرف کس طرح کر دے گا؟"

ہارون نے رو کر جواب دیا: "آپ درست کہتے ہیں، میں غلطی پر ہوں۔"

حجاج باری باری خارجیوں کو بلاتا اور سوال جواب کرتا رہا اور آخر میں کسی کو داہنا ہاتھ کاٹ کا غذ تھما دیتا اور کسی کو دائیں ہاتھ والا۔ یہاں تک کہ دامر کی نوبت آگئی اور اس کو حجاج کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ ہارون نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں اور دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کیونکہ وہ حجاج اور عامر کے سوال جواب کی اذیت سے بچنا چاہتا تھا اور ان دونوں کے چہروں کے تکلیف دہ تاثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس کو کچھ پتہ نہ چلا کہ حجاج اور عامر میں کیا باتیں ہوئیں۔

کچھ دیر بعد جب ڈر نے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور دونوں کانوں میں سے انگلیاں باہر نکال لیں تو اس نے دیکھا کہ عامر اور ابراہیم سزا کی پرچیاں سنبھالے دوسرے خارجیوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ حجاج نے ہارون سے کہا: "او بزدل شخص! افسوس کہ تیرے یہ دونوں بیٹے ہی خارجی نکلے۔ میں نے آج پہلی بار اپنی مرضی کے خلاف عامر کو سزائے موت دی ہے، لیکن اسے معاف بھی نہیں کیا۔ میں نے ہر شخص کے ہاتھ میں اس کی سزا کا پرچہ دیا ہے۔ افسوس کہ ابراہیم نے مجھ سے چند گستاخیاں کیں اور میں نے اسی کو وہ سزا دے کر وہ مرنے کے بعد بھی یاد رکھے گا۔"

ہارون نے ڈرتے ڈرتے اجازت مانگی: "یا امیر! کیا میں ان دونوں سے آخری مل لوں؟"

حجاج نے جواب دیا: "ضرور مل لے، میں نے تجھ کو ملنے سے منع تو نہیں کیا۔"

ہارون لوٹ کا پٹتا آہستہ آہستہ اپنے بیٹوں کے پاس پہنچا اور عامر سے کہا۔ "مرا! اپنی سزا کا پرچہ مجھے تو دکھانا۔"

عامر نے اپنا پرچہ باپ کو دے دیا۔ ہارون نے بڑی بے چینی سے اس کو کھولا اس میں بس ایک ہی فقرہ لکھا تھا "فقط پندرہ دن رہ گئے ہیں"

ہارون کے خوشی سے آنسو نکل آئے، سجدے میں گر گیا۔

کچھ دیر بعد سر اٹھایا اور ابراہیم سے کہا "ابراہیم! اپنا پرچہ دکھانا ذرا"

ابراہیم کا چہرہ اترا ہوا تھا، اس نے مُردہ دلی سے اپنا پرچہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا اس میں بس ایک ہی لفظ لکھا تھا "قتل"

ہارون کا دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس کے پیروں کی جان نکل گئی تھی اور ہڈیاں بُری طرح سنسنا رہی تھیں۔ اس نے ابراہیم کی ہمت بندھائی "ابراہیم بیٹے! تم گھبراؤ نہیں، میں حجاج کے پاس واپس جا رہا ہوں، میں اس کے قدموں میں گر کر تیرے لیے رحم کی بھیک مانگوں گا"

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہارون لڑکھڑاتا ڈگمگاتا حجاج کے پاس پہنچا اور بڑی عاجزی سے درخواست کی "امیر رحم! میرے بچے ابراہیم پر رحم کر، اس کی موت سے ہم دونوں ہی موت مر جائیں گے"

حجاج نے درشت آواز میں حکم دیا "ہارون! تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جا، پہلے بقیہ کیسے فیصلے بھی ان کے ہاتھوں میں تھما دوں۔ اس کے بعد تیری درخواست پر غور کروں گا"

دل گرفتہ ہارون دل میں امید کی شمع جلائے ایک طرف بیٹھ گیا۔ فرطِ غم سے دونوں آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔

حجاج نے بے نیازی سے ہارون کی طرف دیکھا اور ایک قاضی کو اشارے سے پاس بلا کر اس کے کان میں کہا "جلاد اور جلاد اور درّے والوں سے کہہ دے کہ جن جن سزاؤں کے پرچے نکل چکے ہیں ان پر فوراً عمل کیا جائے"

قاضی دبے قدموں جلاد اور درّہ برداروں کی طرف چل دیا۔

دوسری طرف عامر اور ابراہیم ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے، عامر نے پوچھا "ابراہیم، کیا بات ہے تو بہت ڈرا سہما نظر آتا ہے کیا موت سے ڈر گیا؟"

ابراہیم واقعی رو رہا تھا بولا "بھائی! میں موت سے نہیں ڈرتا میں تو سوچ رہا ہوں کہ میری ماں کو جب میرے قتل کی خبر پہنچے گی تو اس کا کیا حال ہوگا؟"

عامر کو اپنی سوتیلی ماں مینرہ مینرہ کے ظلم و ستم یاد آئے اور ذرا سی دیر کے لیے مینرہ کے غمگین چہرے سے اس نے ایک قسم کی خوشی سی محسوس کی۔ وہ غمگین چہرہ جو تصور میں قبل از وقت ہی نظر آ رہا تھا۔

عامر نے پوچھا "پھر تو کیا چاہتا ہے؟"

ابراہیم نے جواب دیا "بھائی! میں اپنی ماں کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں، اپنی ماں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

عامر ابراہیم کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کے بعد اپنا پرچہ ابراہیم کو دے دیا "لے اسے رکھ لے اور اپنا پرچہ مجھے دے دے تاکہ میں تیرے لیے رحم کی درخواست لے کر حجاج کے پاس جاؤں۔"

ابراہیم نے اپنا پرچہ عامر کو دے دیا اور عامر کا پرچہ خود لے لیا۔

اتنی دیر میں قاضی حجاج کا حکم پہنچا چکا تھا اور دُرّے بردار بڑی سرعت سے اس کی تعمیل میں لگ گئے تھے۔ قاضی ایک ایک کے ہاتھ سے پرچہ لیتا اور اس میں لکھی ہوئی سزا پڑھ کر جلاد یا دُرّے بردار کی طرف بڑھا دیتا۔ جلاد فوراً ہی گردن مار دیتا اور دُرّے بردار دُرّے لگانے لگتا۔

یہاں تک کہ ابراہیم کی باری بھی آ گئی اور اس کا پرچہ پڑھ کر اس کو دُرّے بردار کے حوالے کر دیا گیا۔ دُرّوں کی ضربات سے جو چیخیں نکل رہی تھیں انہیں سن کر ہارون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بیک وقت دو منظر دیکھے۔ ایک تو دُرّوں کی شاں شاں اور چیخوں کے ادھر ادھر گرنے اور بچھ جانے کا منظر اور دوسرا یہ کہ جلاد بڑی صفائی سے گردنیں مارنے کا فریضہ نہایت خشوع و خضوع سے انجام دے رہا تھا۔

ہارون نے حجاج سے درخواست کی "یا امیر! میرے بیٹے ابراہیم پر رحم کیجئے۔"

حجاج نے اس کو ایک ہار پھر ڈانٹا "تو خاموش بیٹھا رہ۔ میں جب تک سارے مقدموں کے فیصلے نہیں کر چکوں گا تیری درخواست پر غور نہیں کروں گا۔"

ہارون یہ جواب، افتاں و خیزاں محفل میں پہنچا، اس وقت جلاد اپنی تلوار

فضا میں بلند کر چکا تھا اور تلوار کے سائے میں عامر سر جھکائے کھڑا تھا۔ پلک جھپکنے میں تلوار پوری قوت سے نیچے آئی اور عامر کے سر کو تن سے جدا کر کے دوسری طرف نکل گئی۔ ہارون چیخ مار کر گر گیا، وہ بس ایک ہی ضربہ لگا سکا۔ "اس کو کیوں مارتے ہو یہ تو قتل کا مستوجب نہیں تھا۔"

ہارون بے ہوش ہو گیا اور ابراہیم پندرہ منٹ سے کھڑا سسکیاں لیتا ہوا بے ہوش باپ اور بے سر بھائی کے لاشے پر بیٹھ گیا۔ وہ سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور دیکھنے والوں کو کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ سسکیاں مُنہ کے زخم سے نکل رہی ہیں یا اپنے عظیم بھائی کے عظیم الشان ایثار پر دل کی گہرائیوں سے۔

خانه بدوش سرفروش

یان شان کے جنگلات کا سلسلہ مغرب سے مشرق میں دور تک پھیلا چلا گیا تھا۔
ے صحرائے اعظم گوبی کا مغربی کنارا تھا۔ گوبی کا ریگ زار تیان شان کے چیڑ صنوبر
درختوں کے سامنے یوں پھیلا ہوا تھا جیسے وہ اپنی آغوش وا کیے انہیں خوش
باہو، اور تیان شان کے درخت صحرائے اعظم گوبی کو حیرت اور دہشت سے
ھ رہے ہوں۔ میں اپنی داستان کا آغاز تیان شان کے جنگلات سے بطور
ا ہوں کیونکہ میری زندگی نے اہم ترین موڑ یہیں لیا تھا۔ میں جھیل بیکال کا
ب دور زنگ و جدال میں گزارنے والا منگول، رحم، محبت، کتابی علم اور
درشی سے قطعاً نابلد تھا۔ جادواں نیلے آسمان کے دیوتا ان عالموں کو تباہ د
ں، جنہوں نے ہمیں علم حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ جب تک ہم نے علم نہیں
تھا، اپنے بڑے بڑے مسائل کسی تذبذب کے بغیر حل کر لیا کرتے تھے لیکن
ے پڑھ لکھ لیا تھا، ہمارے مزاج اور طبیعت میں تذبذب، شکوک اور
کسی متعدی اور مہلک مرض کی طرح سرایت کر گئے تھے۔
قراقرم کا خاقان منگو خان میرے ماموں کا بیٹا ہے، خاقان کے تین اور بھائی
بلائی خان، ہلاکو خان اور اریق بوغا۔ ہم سب سے بڑا خاقان چنگیز خان
ڑی دنیا فتح کر کے دے گیا ہے کہ آج نیلے جادواں آسمان کے نیچے ہمارا کوئی
چنگیز خان کی عظیم روح اس کے جسم سے نکل کر ہمارے یاک کے نوڈھوں
م میں حلول کر گئی ہے، اور ہمارے گھوڑے اس پرچم کے زیر سایہ بڑی
ں اور حکومتوں کو روندتے پھر رہے ہیں۔ ہمارے قراقرم میں پوری دنیا کے
ہیں، عیسیٰ کے پرستار، ہندوستان کے بدھ مت والے، عرب کے مسلمان
فیوشس کے پیرو اور طاؤ مذہب کے علمبردار۔ یہاں پگوڈا مسجد اور
ب قطار میں کھڑے ہیں، یہاں موسیٰ کے ماننے والے بھی ہیں، اور ان کے
ی گرجا اور مسجد کے درمیان دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے اور میرے جیسے دوسرے
انہی لوگوں نے علم سیکھنے پر مائل کیا، یہ ہمیں اکثر و بیشتر پچھلے زمانے کی
باتیں بتاتے رہتے کہ ہم دنگ رہ جاتے۔ ہم جو کچھ کہتے یہ کہہ لیتے اور کافی
نے کے بعد جب وہ بات ہمارے حافظے سے نکل چکی ہوتی تو یہ لوگ پڑھ
دلاتے، اور ہم حیران ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگتے اور یہی وہ چند
در ترغیبات تھیں جن کے زیر اثر ہم نے علم حاصل کیا۔ اور ہمیں لکھنا پڑھنا

آگیا لیکن آہ! مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ جس کو یہ متمدن لوگ علم کہتے ہیں، ایک قسم
جو انسان کی نس نس میں اتر کر اس کے اوصاف مردانہ کو زنگ کی طرح چاٹ جا
آدمی کتابی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے خاقان منگو خان نے مغرب کے ملک ہلاکو خان کے انتظام میں
تھے، اور خاقان کی فوج کا پانچواں حصہ ہلاکو خان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ میں آ
ہلاکو خان کی فوج کے ایک حصے کا سردار ہوں۔

تیان شان جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ یادگار علاقہ ہے جس
گزار حصوں میں دنیا کے راندۂ درگاہ اور ٹھکرائے ہوئے نرم مزاج مذاہب
آکر بس گئے تھے۔ اس چھوٹی سی سرسبز و شاداب کوہستانی بستی میں شاکیہ منی
مسیح ناصری کے جاں نثار، اور ایران کے مانی کے پیرو صدیوں سے مل جل کر رہ رہ
مانی کے پیرو روشنی کو خدا سمجھ کر پوجتے تھے اور انہیں تاریکی سے چڑ تھی، یہاں
کے برہمی مجسمے تھے جن کی شاکیہ منی کے پرستار پرستش کرتے تھے، مسیح ناصری
مندر، ناصری کی ماں کی تصویروں کے سامنے جبیں سائی کرتے رہتے۔

میں اپنی پانچ ہزار فوج کے ساتھ شاہراہ ریشم سے قراقرم واپس جا
ساتھ چھکڑوں، اونٹ گاڑیوں اور گدھوں پر لدا ہوا وہ سامان تھا جو کاشغر کے
کے حکمرانوں نے ہمارے خاقان کو خراج میں بھجوایا تھا۔ چلتے چلتے جب ہم کو
آگے نکل گئے تو ہمارے ایک ساتھی نے شمال مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہ
"سنان! اس طرف دشوار گزار کوہستانی راستوں میں کہیں چند ایسی بستیاں بھی
ہم ابھی تک نہیں پہنچ سکے، سنتے ہیں وہاں بڑی دولت ہے اور ان کے پا
کا ایک جنگل پلا ہوا ہے!"

طمع سے میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا: "اگر تیرا خیال غلا
اس نے اپنا خنجر میری طرف اچھال دیا۔ بولا: "تو اس خنجر سے میری
زبان کاٹ لینا!"

میں نے سلطان اور دو ہزار آدمیوں کو یہیں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا
آدمیوں کے ساتھ اس طرف چل پڑا۔ سنسان پہاڑی پتھریلے راستوں میں
کی ٹاپیں گونج رہی تھیں، ان کی بازگشت سے کہستان لرز رہا تھا۔ نشیب
خم اور ہموار، ناہموار راستوں کو عبور کرتے ہوئے ہم بڑھتے چلے گئے ہمارے

جیسے کوہستانی سلسلوں کے اوپر جادوانی نیلا آسمان تھا اس کے نیچے پرندے
ہے تھے جیسے نیلے پانی میں مچھلیاں ہم نے اس شخص کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔
یں ان نامعلوم آبادیوں تک پہنچنے کی ترغیب دی تھی۔ میری ہتھیلیاں اور انگلیاں
مطالبہ کر رہی تھیں، وہ بار بار مخبر کے خنجر کی ضرورت محسوس کر رہی تھیں اور
زبان سے، اس کی دروغ گو زبان کو تراشنے کی تحریک پیدا کر رہی تھیں۔ آخر
دیوار نظر آنے لگی جس کے دوسری طرف انسانی آبادی تھی گھنے درختوں کے
سے یہ دیوار دھبوں کی طرح دکھائی دے رہی تھی، میرے آدمیوں نے راہ میں
نے والے درختوں کو کاٹ چھانٹ کر راستہ بنا لیا اور ہم شہر کی فصیل کے سائے میں
یہاں ایک دیوار پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔
"اس وآشتی کے جویا حضرات کے لئے اس شہر کی آغوش کشادہ ہے۔ خوش

لیکن ہم وہاں اس وآشتی کے کرم نہیں گئے تھے اور نہ خوش آمدید کے طلب گار
ے اپنی کمانوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر چلے میں تیر چڑھائے اور شہریوں کا
و شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کے لوگ سڑک کے آس پاس کھڑے ہو کر ہمیں تماشے
یکھنے لگے۔ مجھے ان بے وقوفوں پر بہت غصہ آیا کہ یہ ہمارا مقابلہ کیوں نہیں کرتے۔
ت اور مقابلے کے شہر میں داخل ہو جانا ہمارے لیے باعث ننگ و عار تھا۔ ہم
ستوں اور سڑکوں سے گزر کر ایک باغ کے صحن میں جا کھڑے ہوئے۔ میرے ساتھی
ں کا ہنس ہنس کر مذاق اڑا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے شہری ہمارے
جمع ہو گئے۔ سفید ٹوپیاں، سفید عبائیں اور سفید پاجامے پہنے ہوئے بے وقوف
کا ایک وفد ہماری خدمت میں حاضر ہوا اور ہم سے سوال کیا کہ "یہاں ہم سمن
تشریف لائے ہیں؟"

یں نے جواب دیا۔ "ہم یہاں دولت اور عورت کی غرض سے آئے ہیں ہمارے
نی عرصے سے عورت کو ترس رہے ہیں کیا تم لوگ اچھے میزبانوں کی طرح ہمیں
ین فراہم کرو گے؟"

وہ سب بیماروں کی طرح آہستہ سے پیچھے ہٹے اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے
ے "معزز جہاں! آپ کی خدمت میں کسی نہ کسی طرح دولت تو ضرور پیش کی
ہے، لیکن عورتوں کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے اس سے ہمیں معذور سمجھا جائے!"

میں نے وفد کو جواب دیا "ہم کسی چیز کی درخواست کم تر ہی کرتے ہیں
مطالبے خود ہی پورے کر لیتے ہیں، اس لئے ہمیں ہماری بات کا ہاں یا نہیں میں
دیا جائے!"

وفد دیر تک مجھے باتوں میں الجھاتے رہا اور اس درمیان ان کے کئی
ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہمارے مقابلے پر آ گئے۔ یہ دغابازی ہمیں پسند نہ آئی
ان پر بھرپور حملہ کر دیا۔ تیروں کی سنسناہٹ، تلواروں کی شاں شاں، نیزوں کی کھنک
گھوڑوں کی ہنہناہٹ نے قیامت کا منظر پیدا کر دیا تھا اور لوگوں کی چیخ پکار نے
سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے ان کے مردوں کو حکم دیا کہ وہ سب قطاروں میں کھڑے
لیکن انہوں نے ہمارے حکم کی پروا کیے بغیر جنگ جاری رکھی اور ہمارے کئی آدمی
ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہم نے ان سب کو تیروں، تلواروں اور نیزوں کی
لے لیا اور ذرا سی دیر میں ان کی بڑی آبادی کو جہنم واصل کر دیا یہ کام چور، کاہل
تے اندر رہنے بسنے والے شہری لوگ مزدوری سے زیادہ کتابی بن چکے تھے۔

واویلا کرتے ہوئے لوگوں نے جان کی امان کی درخواست کی۔ میں نے اُ
چیخ کر حکم دیا کہ "اگر امان چاہتے ہو تو آبادی کے تمام مرد اپنے ہتھیار ہمارے حوا
میدان میں کھڑے ہو جائیں"

چند گھنٹوں کے اندر ہمارے حکم کی پوری پوری تعمیل کر دی گئی، یہ
تقریباً بیس ہزار تھے یعنی ہماری سپاہ سے تقریباً سات گنے زیادہ، مجھے ان کی
تعجب ہوا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ لوگ سخت جان زندگی سے کم ہی دلچسپی
میں نے ان بزدلوں کو حکم دیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو پیچھے کمر پر باند
حکم کی بھی فوراً ہی تعمیل کر دی گئی۔ آخر میں چند آدمی بچ گئے۔ جن کے ہاتھ نہیں
تھے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ میرے آدمی
ٹوٹ پڑے اور تلواروں سے ان کی گردنیں الگ کرنے لگے، وہ لوگ چیخ چیخ کر
اپنے مردوں کا یہ حشر دیکھ کر ان کی عورتیں روتی ہوئی ہماری طرف بڑھیں لیکن
سو آدمی ان کی راہ روک کر کھڑے ہو گئے اور عورتوں کو دہشت زدہ کرنے کے
کے پیٹ بھی چاک کر دیے، میدان میں چاروں طرف خون ہی خون نظر آنے لگا
لاشے پھڑک رہے تھے، ادھر سے فراغت پا کر ہم ان کے گھروں میں گھس گئے
جو بھی ہاتھ لگا قبضے میں کیا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم بھی دے رکھا تھا کہ

عمر اور بوڑھی عورتوں کو قتل کر دیا جاتے اور جوان عورتوں اور لڑکیوں کو قبضے
جاتے۔ میں خود دس سپاہیوں کے ساتھ گھروں کی تلاشی لیتا پھر رہا تھا کہ
ی ایک ادھیڑ عمر عورت کو پکڑ لائے اور مجھے بتایا کہ "یہ عورت کہتی ہے کہ اگر
وڑ دیا جاتے تو وہ اس کے عوض ایک نہایت قیمتی لعل ہمارے حوالے
!"

میں نے اس عورت سے پوچھا "جس لعل کا تو ذکر کر رہی ہے۔ اس وقت
ہے؟"

اس عورت نے جواب دیا۔ "اسے میں نے نگل لیا ہے، اور مجھے اتنی قدرت
ہے کہ جب چاہوں پیٹ سے نکال لوں۔"

مجھے عورت کے جواب پر ہنسی آگئی۔ میں نے جواب دیا "او احمق عورت! اتنی
و مجھے بھی حاصل ہے کہ تیرے پیٹ سے لعل نکال لوں۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی تلوار کو اوھر ادھر گھما کر پیٹ کو دو حصوں میں تقسیم
دورت چیخ مار کر گر گئی۔ اس کی آنتیں باہر نکل آئیں اور سرخ سرخ خون فوارے کی
پڑا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ "اس کے پیٹ میں لعل تلاش کیا
"

یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ عورت جھوٹ نہیں تھی، اس کے پیٹ میں واقعی
موجود تھا۔ مجھ پر یہ ایک نیا انکشاف تھا کہ عورتیں لعل جیسی قیمتی چیزیں اپنے پیٹ
چھپا سکتی ہیں، میں نے غصے میں یہ حکم جاری کیا کہ تمام عورتوں کے پیٹ چاک کر
ں کی طرح ان کے معدوں کی بھی تلاشی لی جاتے کیونکہ یہاں کی عورتیں ضرورت سے
چالاک معلوم ہوتی ہیں۔

میں ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ اسی عالم میں، میں ایک ایسے مکان میں گھس
ں کی فضا عود و لوبان کی خوشبو سے معطر تھی۔ مکان تقریباً خالی تھا کئی کمرے
کر جب میں ایک بال کمرے میں داخل ہوا تو وہاں میں نے ایک عمر رسیدہ شخص کو
مورت کے آگے سجدے میں گرا دیکھا وہ غالباً دعا مانگ رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر
ی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ گھٹنوں کے آگے فرش پر ہتھیلی کے بل ٹیکے ہوئے
دونوں ہتھیلیوں کے درمیان پیشانی کے بل سر زمین پر ٹکا تھا۔ اور دونوں پیر پنجوں
سے زمین پر ٹکے اور ایڑیاں اوپر اٹھی ہوئی تھیں، میں پہ ہمارے داخلے کی

آہٹ کا ذرا بھی اثر نہ ہوا، ہمارا خیال تھا کہ وہ کم بخت ہمارا استقبال کرے گا اور اپنا پتہ بتائے گا لیکن وہ کسی گونگے بہرے کی طرح ہماری طرف سے غافل رہا۔ کرنل میر کا ایک ہتھوڑا رکھا ہوا تھا جس سے غالباً پیتل کے گھنٹے پر چوٹ لگائی جاتی تھی، میر ہتھوڑا اٹھا لیا اور اسے فضا میں بلند کر کے پوری قوت سے اس بوڑھے کی پیٹھ پر رسید کیا۔ ہڈی ٹوٹ گئی اور بوڑھا مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میرے آدمی اس کے لطف اندوز ہونے لگے۔

دوسرے کمرے سے اچانک ایک لڑکی روتی، چیختی چلاتی ہمارے کمرے میں داخل ہوئی اور اس بوڑھے کے متحرک جسم سے چمٹ کر رونے لگی۔ اس کی آواز اترجانے والے نغمے کی طرح میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اپنی کھینچ لیا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ "بوڑھے کا پیٹ چاک کر دیا جائے اور میں دیکھا جائے کہ وہاں کرنل کا لعل تو نہیں چھپا ہے!"

اسی دوران میرے چند آدمیوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ اگر تمام عورتوں کے پیٹ چاک کر دیے گئے تو ان کی عورتوں والی ضرورت کس طرح پوری ہوگی ان سے دریافت کیا۔ "اب تک کتنی عورتوں کے پیٹ سے حمل یا کوئی دوسری چیزیں نکل چکی ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "اس عورت کے سوا کسی ایک کے پیٹ سے نہیں نکلا!" میں نے انہیں حکم دیا۔ "اب جوان عورتوں اور لڑکیوں کے پیٹ نہ چاک کیے جائیں، بوڑھی عورتوں اور بچوں کو البتہ زندہ نہ چھوڑا جائے!" میں نے یہ حکم دیا۔ "یہ کام کم سے کم وقت میں انجام دیا جائے!"

یہاں سے ہمیں کئی ہزار زندہ عورتیں اور لڑکیاں ملنے والی تھیں، آخر ہم نے اپنا کام اس طرح آسان کیا کہ پوری بستی کو آگ لگا دی ہم نے یہ طریقہ اس لیے کیا کہ اگر کچھ لوگ زندہ بچ گئے ہوں تو آگ ان کا کام تمام کر دے، ہمیں یہاں کچھ ملا۔ ہم نے ان کے مویشیوں کے ریوڑ بھی اپنے قبضے میں کیے اور انہی کے گھوڑوں پر ان کا سامان لاد کر شہر سے باہر نکلے، باہر نکلتے ہی میری نظر لیک بار کی اس عبارت پر پڑ گئی۔

"امن و آشتی کے جویا حضرات کے لئے اس شہر کی آغوش کشادہ خوش آمدید!"

میں نے اپنے ایک سپاہی کو جو کچھ لکھنا پڑھنا بھی جانتا تھا حکم

کے نیچے لکھ دیا۔
"امن و آشتی کا انجام دیکھنے کے جویا حضرات کے لئے اس شہرِ خموشاں کی
کشادہ ہے، خوش آمدید!"
میرے دو ہزار سپاہی شاہراہِ ریشم کے کنارے ڈیرہ ڈالے ابھی تک پڑے
نہوں نے ہمیں دیکھتے ہی خوشی میں شور غل مچانا شروع کیا۔ جس شخص نے اس بستی
کر ہونے کی ترغیب دی تھی، وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے اپنے خیر
سی کا مطالبہ کیا اور یہ بھی کہا کہ مال و دولت کی تقسیم میں وہ دوہرے حصے کا مستحق
ں نے حامی بھر لی کہ ایسا ہی ہوگا وہ فکر نہ کرے۔
ہیں نے شاہراہِ ریشم کے کنارے دنیا کی چھت (پامیر) کے مشرق میں دو
ے لئے پڑاؤ ڈال دیا۔ میدان میں دور تک یورت ہی یورت نظر آنے لگے۔ مویشی
گئے اور پتھروں کے چولہوں پر انہیں سینکا بھونا جانے لگا۔ میدان سے سوندھی دھوئیں
سا بادل اٹھا اور ہمارے سروں پر منڈلانے لگا آہستہ آہستہ یہ اٹھا گہرا اور غلیظ ہو
سورج کی روشنی ماند پڑنے لگی۔
لڑکی کا نام ماریہ تھا اور جس بوڑھے کو ریچھ کی پڑی توڑ کر میں نے قتل کر دیا
ہ ماریہ کا باپ تھا، ماریہ کے بقول اس کا ایک محبوب بھی تھا، جوان دنوں بیت
ہیں بیت اللحم اور گلگتا کی زیارت کو گیا ہوا تھا۔ بیت اللحم، ناصرہ کا وہ گھر جہاں ان
ح پیدا ہوا تھا۔ اور گلگتا وہ جگہ تھی جہاں ناصری صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ گلگتا
لیب ہے کھوپڑیوں کا ڈھیر۔ میں نے ماریہ کو ڈانٹا اور پوچھا کہ کیا وہ اب بھی یہ امید
ہے کہ وہ اپنے محبوب کو حاصل کر سکے گی۔
ماریہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے ماریہ سے وعدہ کیا کہ اگر اس کا محبوب
بھولا بھٹکا اس کی تلاش میں قراقرم آ گیا تو وہ اسے شامانوں (مذہبی پروہتوں) اور
روں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دے گا۔ میں نے ماریہ کو اپنی دلہن بنا لیا۔
شادی میں خاقان منگوخان، ہلاکو خان اور ادیق بوخا نے بھی شرکت کی، قبلائی
چین کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ اس لئے وہ نہیں شریک ہو سکا۔ ہمارے مالوں کے
ذریعے چینی ریشم کے زیر جانے پر بھیڑ کی کھالوں پہنے ہوتے تھے، ان کے سروں
ٹوپیاں منڈھی ہوئی تھیں، ان میں موٹی جڑے تھے، ان کے بڑے بڑے سروں
ے بڑے بال تھے، اور ٹوپیوں کے نیچے سے دو گندھی ہوئی موٹی موٹی چوٹیاں

نکل کمان کی پشت پر پڑی ہوئی تھیں ان میں نہایت قیمتی جواہرات پھنسے ہو
ماریہ بظاہر خوش بہت تھی لیکن اس بات کا انکشاف تو بہت بعد میں ہوا کہ یہ
اور ہوشیار لڑکی کتنی عقل مند اور مکار تھی، میں چاہتا ہوں کہ اب میں جو کچھ لکھنے
اسے نہایت توجہ اور دلچسپی سے پڑھا جائے کیونکہ اس ربط اور تسلسل کے ذریعہ
انجام تک پہنچنے والا ہوں، ان سے درمیانی کڑیوں سے سرسری گزرنے کے بعد آ
لطف اندوز نہ ہوا جا سکے گا۔

میں نے ماریہ کو اکثر تنہائی میں مسیح ناصری کی پرستش کرتے دیکھا وہ
خدا کا بیٹا کہتی تھی، اس سے پہلے بھی جو ناصری قراقرم میں رہ رہے تھے، ان
اصرار تھا کہ مسیح ناصری خدا کا بیٹا ہے لیکن ہمیں اس کے ماننے میں تامل تھا،
واقعی خدا کا بیٹا تھا تو زندگی کے آخری لمحات میں اسے اس کے باپ نے
چھوڑ دیا تھا۔

میں نے تھوڑا سا تو پہلے ہی پڑھ لکھ لیا تھا لیکن ماریہ نے اس میں
اضافہ کر دیا۔ وہ علم اور تہذیب کی اہمیت پر بے تکان بولتی رہتی۔ وہ ہمیں
انسانی خون خرابہ اچھی چیز نہیں ہے، وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ میں بورشت کے بجائے
مکان تعمیر کرالوں اور اس میں شہریوں کی طرح رہنے لگوں لیکن مجھے اپنے نانا چنگیز
ہدایت ابھی یاد تھی کہ "پکے مکانات بنوا کے چینیوں کی طرح حکاتوں میں ہرگز نہ
اس طرح تم کمزور ہو جاؤ گے"، یہ اس خان اعظم کا حکم تھا جس کی عظیم روح ہما
کے نوجوانوں والے پرچم میں اب بھی موجود تھی ہم اس کی علم دانی بات کو تو ہر طرح
تیار تھے لیکن تہذیب کی بات یا بالکل سمجھ میں نہ آتی، وہی تہذیب نا، جو انسان
مکار اور کل (مشین) بنا دیتی ہے۔ میں نے ماریہ کو ڈانٹ دیا اور کہا "ماریہ! خبر
نے اب کبھی تہذیب کی بات کی، تہذیب ہمیں غلامی کا عادی بناتی ہے اور ہم ا
ذہنیوں کے شہر کے رہنے والے لوگ تہذیب کے چکر میں غلامی کا جوا اپنی گرد
ڈال لیں"۔

میں ماریہ سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب
کہ میں دوسری عورتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ لیتا تھا، مجھے بعض دوسری عو
پسند آتیں لیکن ماریہ کو میری یہ عادت پسند نہ آتی۔

میرا باپ ابھی زندہ تھا اور قبلائی خان کے ساتھ چین کی مہمات پ

لیکن کچھ لوگ ایک دن گدھے کی پشت پر لاد کر اس کی لاش لے آئے، میرا باپ کسی لڑائی میں کام آگیا تھا۔ ہمارے یورت کے سامنے جب اس کی لاش لاکر گدھے سے اتاری گئی تو ہماری عورتوں نے لاش پر بین کیا، اور دیر تک سر کے بال نوچتی کھسوٹتی رہیں، ہم نے باپ کی لاش دریائے کیرولان اور دریائے تولا کے چشموں کے درمیان، برخان کلدون کوہستان قوت واقتدار کے ڈھلان میں دفن کردی۔ یہاں صنوبر کے درختوں کے بیچ سے دھوپ چھن چھن کر آتی تھی، میرے دل پر بھی باپ کی موت کا بڑا اثر تھا لیکن ساتھ ہی ایک خوشی بھی تھی، میرے باپ نے کئی شادیاں کی تھیں، اس کی آخری شادی کرائیت قبیلے کی ایک نوعمر اپیرادی تاشی سے ہوئی تھی، تاشی کی عمر بیوگی کے وقت مشکل سے بیس برس رہی ہوگی، یہ میری سوتیلی ماں تھی لیکن میں اس سے محبت کرتا تھا، اور اس سے شادی کرنے کی خواہش رکھتا تھا، باپ کی موت نے راہ ہموار کردی تھی، تاشی ہمارے باپ کے یورت میں دوسری کئی ماؤں کے ساتھ رہتی تھی۔ میں برخان کلدون سے سیدھا اپنے باپ کے یورت میں پہنچا وہاں ہلاکو خان اپنی بیوی دوقوز خاتون کے ساتھ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ دوقوز خاتون بھی پہلے ہلاکو خان کی سوتیلی ماں تھی لیکن باپ کی موت کے بعد وہ ہلاکو کی بیوی بن گئی تھی۔

ہلاکو خان نے تسلی دیتے ہوئے مجھے بہت سمجھایا اور یہ بھی کہا کہ ایران اور بغداد کی مہم پر روانگی کی تیاری شروع کردی جائے۔ ہلاکو خان کو خاقان اعظم منگو خان نے یہ فرمان جاری کیا تھا کہ "الموت کے شیخ الجبال کو پہلے ہمارے پاس روانہ کردو اور اس کے سارے قلعے اور پناہ گاہیں تباہ و برباد کردو"۔ ہلاکو خان اس مہم کی تیاری میں لگا ہوا تھا اور چونکہ میں خود بھی ہلاکو خان کی فوج سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے واقعی غم غلط کرنے کو میرے لئے تاشی اور ماریہ کی محبت کافی تھی۔

میں نے ہلاکو خان اپنے بھائی کے سامنے ہی تاشی کو بہ عجلت میں لے لیا اور کمر ت آواز میں کہا "تاشی! اب تو میری ماں نہیں رہی، بلکہ آج سے میری بیوی ہے، چل میرے ساتھ میرے اپنے یورت میں، اور دلہن بن کر رہ"۔

ہلاکو خان نے ہنس کر تاشی سے کہا "تو پہلے کی بہ نسبت اب زیادہ اچھی لگ رہی ہے، پہلے تو ایک بوڑھے کی بیوی تھی اور اب اس بوڑھے کے بیٹے کی دلہن بننے والی ہے!"

یہ کہہ کر ہلاکو خان اپنی جگہ سے اٹھا اور جھومتا ہوا ہمارے قریب آکر بولا "آغائی

خان! تو خوش قسمت ہے کہ تیان شان سے تو ماریہ جیسی لڑکی لایا اور اسے اپنی دلہن بنایا اور اب تجھے تاشی ملنے والی ہے تاشی بھی کچھ کم مقبل مند لڑکی نہیں ہے!"

میں نے پہلی بار تاشی سے بے تکلفی کا اظہار کیا

جس کا تاشی نے بھی گرم جوشی سے جواب دیا۔ ہلاکو خان اور

خاتون اور یورت میں موجود دوسرے مہمانوں نے اپنی باتیں پیٹ پیٹ کر جاری رکھیں کی، اور پھر ہم نے ان سب کی شراب اور گھوڑی کے دودھ سے تواضع کی، تاشی شو رنگ کے چمڑے کا پاجامہ اور چوڑا کوٹ پہنے ہوئے تھی، کمر گہرے نیلے رنگ کے کمر سے جکڑی ہوئی تھی، اور سینے پر ایک رومال بندھا تھا۔ ہم اپنے باپ کے یورت کافی دیر رک کر اپنے یورت کی طرف چل پڑے، تاشی میری رفاقت میں تھی اور میں اس حالت میں جیسے ہی اپنے یورت میں داخل ہوا ماریہ مجھے دیکھتے ہی سٹپٹا گئی۔ تلملا کر کھڑی ہوگئی اور حیرت اور غم کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔ "یہ کیا ہے، کیا تاشی میری ماں نہیں ہے؟"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "نہیں اب نہیں ہے، پہلے کبھی تھی!"

ماریہ نے بے چینی سے پوچھا۔ "آغائی خان! کہیں تو نشے میں تو نہیں؟"

میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں، تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

ماریہ نے جواب دیا۔ "تیرے باپ کی بیوی بیوی کس طرح بن گئی؟"

میں نے جواب دیا۔ "باپ کی موت سے۔ تاشی میرے باپ کا ورثہ ہے جو مجھے مل گیا!"

ماریہ نے جوش میں چلا کر کہا۔ "اسے چھوڑ دو، ورنہ میں روٹھ جاؤں گی۔ یہ نہیں برداشت کر سکتی!"

میں نے بھی اسے ڈانٹ دیا اور گرج کر کہا۔ "تو کیا نہیں برداشت کر سکتی احمق لڑکی! کیا تجھے یہ بات ابھی تک نہیں معلوم کہ میں تاشی سے عشق کرتا ہوں!"

ماریہ نے جل کر کہا۔ "تم جھوٹے ہو، یہی بات تم نے مجھ سے بھی کہی تھی، تمہاری وہ بات درست تھی جو تم نے مجھ سے کہی تھی، یا یہ جواب تاشی کے لئے کہہ رہی ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہم لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ دونوں ہی باتیں درست ہیں!"

ماریہ نے بے مروتی سے کہا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ دونوں ہی باتیں درست

ں، بھلا ایک دل میں دو عورتیں کس طرح بسائی جا سکتی ہیں؟"
مجھے اس پڑھی لکھی، شہری لڑکی کی احمقانہ بات پر ہنسی آگئی، میں نے کہا۔
ک دل میں دو تو کیا ہزار عورتیں بسائی جا سکتی ہیں میرا دل آغا خان کا یورت ہے
ں خان کا یورت، اس میں جو بھی آئے گا میرا مہمان ہوگا۔ تاشی بھی میری مہمان ہے'
ے بڑھ کر اس کی پیشوائی کرو!"
لیکن ماریہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں، میں غصّے میں آگے بڑھا اور ماریہ کو
وں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا تاشی کے قدموں تک لے گیا اور اسے زمین پر گرا دیا، ماریہ
ناک سے خون بہہ نکلا اور کئی دانتوں کے ہل جانے سے وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ میں
ے سختی سے حکم دیا۔ "ماریہ! تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تو تاشی کا احترام بجا لا اور
ں سے معافی کی طلب گار ہو!"
وہ اٹھی اور تاش کے آگے جھک گئی۔ اس نے تاشی سے معافی مانگی اس کے
ر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "آغا خان! تم مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارا دل
کھا دیا اور شاید تمہارے ساتھ ساتھ تاشی کا بھی، جبکہ ناصری نے یہ تعلیم دی ہے کہ کسی
دل سے دل آزاری نہ کرے، تم اس کے آگے اپنا دوسرا
ل بھی بڑھا دو، میں نے تمہاری حکم عدولی کر کے مسیح کی حکم عدولی کی، خدا مجھے
اف کرے!"
میں نے دیکھا اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے، مجھے اس پر رحم
یا اور میرے دل میں اس کی محبت بیدار ہو گئی۔ میں نے خود بھی اس سے اپنی زیادتی پر
رمندگی کا اظہار کیا۔ میں اپنی پشیمانی اور ندامت کا لڑکھڑاتی آواز میں اعلان کر رہا
تھا۔ اس وقت میری نوتِ گمراہی اور قوتِ ارادی میرے ساتھ نہ تھیں، میری معذرت
ر پشیمانی کا ماریہ پر بڑا اثر ہوا۔ بولی۔ "تم سب کو ایک نہ ایک دن یہ بات ماننی ہی پڑے
ی کہ گناہ بھی ایک چیز ہے ضرور!"
میں نے طیش میں پوچھا۔ "تو ہزار بار گناہ کا نام لے چکی ہے تو آج مجھے یہ
بتا دے کہ یہ گناہ کیا چیز ہے؟"
ماریہ نے جواب دیا۔ "ہر وہ کام جس سے ابن اللہ اور اللہ نے منع فرمایا ہے
گناہ ہے، تمدن کو غارت کرنا اور نسلِ انسانی کو تہ تیغ کر دینا بدترین گناہ ہیں، ان
افعال سے توبہ کرو!"

ہیں نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ میں خوب اچھی طرح اس تلخ حقیقت سے آگاہ
کہ اگر نسل انسانی پر ظلم و جور نہ ڈھایا جاتے اور انسانی حلم و مروت اور خدا ترسی اور نیکی
سے کام لیا جائے تو دنیا کا بیشتر حصہ اپنے گلے سے مملوکی اور غلامی کا جوا اتار پھینکے اور
ہمارے لوروں میں قحط اور تنگ حالی کا راج ہو جاتے۔
ہیں نے تاشی اور ماریہ کو ایک ساتھ تنبیہہ کی کہ دونوں مل جل کر رہو اور پھر وہ
ہیں زیادہ بے تکا
اور بگانگت پیدا کرنے کی خاطر خیمے سے باہر چلا آیا۔

خاقان اعظم منگو خان نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو حکم دیا کہ وہ اپنے اردو کو
کو لے کر شیخ الجبال کے گھوڑسلوں جیسے قلعوں کا رخ کرے، اور انہیں تباہ و برباد کر
شیخ الجبال کو اس کے پاس روانہ کر دے اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ اس مہم سے فا
ہونے کے بعد ہلاکو خان مسلمانوں کے شہر بغداد میں گھس جائے اور پانچ سو سالہ عبا
خلافت کو مطیع یا تباہ و برباد کر دے، خاقان اعظم منگو خان اگر چاہتا تو یہ جنگی مہم مغربی ملک
کی طرف بھیج دیتا اور مسلمانوں کی عباسی خلافت اور شیخ الجبال کے گھوڑسلوں جیسے قلعے
ہماری یورش و یلغار سے محفوظ رہتے لیکن یہ سب کچھ ایک نہایت سوچے سمجھے منصو
کے ماتحت ہو رہا تھا۔ جب سے ہم منگولوں نے جادوائی نیلے آسمان کی کرم گستری سے
کے بڑے بڑے تاجداروں کو خاک میں ملایا تھا اور بڑے بڑے سرکشوں کی پیشانیاں اپنے
بلند ادنی یورتوں کی چوکھٹوں پر جھکوا دی تھیں، دنیا بھر کے مذاہب کے پیشواؤں نے ا
پایۂ (قراقرم) میں مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ ان میں مسیح ناصری، شاکیہ منی، موسیٰ اور
کے پرستاروں کے علاوہ مسلمان بھی شامل تھے جو عرب کے محمد (ص) کو دنیا کا آخری پیغمبر
تھے اور مکے میں خدا کے گھر کی طرف منہ کر کے عبادت کیا کرتے تھے۔ ہم ان پر ہنستے ہیں
ان کا خدا کیسا ہے جس نے پوری دنیا میں صرف مکے میں اپنا گھر بنایا۔ اس نے ہمارے امد
پایۂ (یورتوں کے شہر قراقرم) میں اپنا گھر کیوں نہ بنایا۔
مسیح ناصری کے ماننے والے بہت شاطر ہیں انہوں نے کچھ چھوٹے سیتے شعبد
دکھا کر ہماری عورتوں کو ناصری کی طرف مائل کر دیا ہے چنانچہ خاقان اعظم منگو خان، ہلا
خان، قبلائی خان اور ادیق بوغا کی ماں ناصریوں کے انداز میں عبادت کرتی ہے اور اس
کے پاس مسیح ناصری اور اس کی ماں مریم کی کئی تصویریں موجود ہیں، جن کے روبرو

رہ کرتی ہے، اس کے علاوہ ہلاکو خان کی بیوی دو تو خاتون بھی عیسائی ہو چکی ہے اور
کے خیمے کے ساتھ ہی اس کا چیپل بھی چلتا ہے، ان عورتوں کو ناصر یوں نے یہ باور کرا
ہے کہ مسلمان ظالم اور جھوٹے ہیں اگر ان کی طاقتوں کو تباہ و برباد نہ کیا گیا تو یہ لوگ
نہ ایک دن پورے دنیا اور خاص کر منگولوں کے لئے عذاب جان بن جائیں گے، جب
توں نے ہمیں یہ باور کرا دیا تو ہم لوگ بھی شیخ الجبال اور سباسی خلیفہ کی سرکوبی اور بیخ کنی
آمادہ ہو گئے۔ ہمارے ارادوں اور نئی مہم کا جب ماریہ کو علم ہوا تو وہ بھی بہت خوش
ئی وہ اپنے چیپل میں گئی اور ناصری کی اس تصویر کے روبرو سجدہ ریز ہو گئی جس میں
ری کو دو مصلوب چوروں کے درمیان صلیب پر چڑھا دکھایا گیا ہے، اس نے بھرائی
ز میں مصلوب ناصری سے کہا۔" اوقدس مسیح! کافروں (مسلمانوں) کے مقابلے میں منگولوں
شیوں کو عزت و کامرانی عطا فرما۔"

میں نے ماریہ کو پیچھے سے پکڑ لیا اور کہا "ماریہ! کیا تجھے اب تک یہ بات نہیں معلوم
تاشی کی خاوند کلثوم مسلمان ہے، پھر تاشی یہ کس طرح پسند کرے گی کہ اس کی خاوند کے دین
ذلیل و خوار کیا جائے!"

ماریہ نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں اپنا گریبان چاک
ایں ابولی "کلثوم ساحرہ ہے اور سادہ لوح تاشی کو یہ کیا معلوم کہ کلثوم اپنے جادو کے زور
ے ایک نہ ایک دن تاشی کی جگہ خود لے لے گی اور آغائی خان کلثوم پر جان چھڑکنے لگے گا
ونکہ آغائی خان کا دل، دل نہیں خان کا یورت ہے جس میں بہت سی لڑکیاں اور عورتیں
س سکتی ہیں!"

میں ماریہ کے اس تازہ انکشاف سے ڈر گیا۔ میں نے سوچا کہ کلثوم اگر واقعی ساحرہ
ہے تو بہت بری بات ہے اور اس کا زندہ رہنا سب کے لئے بہت برا ہے لیکن اس کے
احرہ ہونے کا ثبوت لئے بغیر اسے کیونکر سزا کس طرح دی جا سکتی تھی۔ میں پریشان حال
ب اپنے یورت میں داخل ہوا تو تاشی کو بناؤ سنگار کرتے دیکھا۔

"تاشی! ایک بات تو بتا، کیا یہ درست ہے کہ کلثوم ساحرہ ہے اور ہم پر کوئی بڑا
جادو کرنے والی ہے!"

"بکواس" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر شیرنی کی طرح دہاڑ کر بولی
"کہیں تم سے یہ بات ماریہ نے تو نہیں کہی جو مسلمانوں کی دشمن ہے؟"

میں نے اقرار کر لیا، تاشی اور زور سے چیخی۔ "خان! تم اس لڑکی کو سمجھنے کی کوشش کرو یہ منگول بچیوں کو شہری بنانا چاہتی ہے، یہ تمہیں پڑھا لکھا کر بڑوں بنا دینا چاہتی ہے اس بات کی بھی کوشش کرے گی کہ تم یورتوں کے شہر سے نکل کر کسی ایسے شہر میں جا بسو جہ اونچے اونچے پکے مکانات ہوتے ہیں، جہاں کے رہنے والے جھوٹ بولتے ہیں اور اپنے اور فعل میں مطابقت نہیں رکھتے!"

شور و غل سن کر ماریہ بھی آ گئی اور اس نے خود پر لگائے جانے والے الزامات کی نہیں کی، وہ تاشی کے روبرو ڈٹ کو کھڑی ہو گئی، اور کہنے لگی۔ "تمہارا نانا چنگیز خان ایک بہت بڑا آدمی تھا، یہ بڑے لوگ کہیں کہیں اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں، اس نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے جب آدھی دنیا فتح کر لی تو چین کے عقل مندوں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ خان! تم نے جن ممالک کو گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر فتح کیا ہے، ان پر گھوڑے کی پشت سے حکومت نہیں کر سکتے۔ چنگیز خان عقل مند انسان تھا۔ اس نے دانا لوگوں کی یہ بات مان لی اور قراقرم سے اپنے مفتوحہ علاقوں پر حکومت کرنے لگا۔ میں یہی بات آغائی خان سے کہوں گی کہ وہ اور اس کی نسلیں ہمیشہ یورتوں میں نہیں رہ سکتیں۔"

تاشی نے غصے میں ماریہ کو دھکا دے دیا۔ ماریہ شہری لڑکی اس کے دھکے کی تاب نہ لا کر دور تک لڑھکتی چلی گئی اور اس کا سر یورت کے بانس سے زخمی ہو گیا نے تاشی کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ یورت میں ہلاکو خان اور اس کی بیوی د خاتون داخل ہو گئے ہلاکو خان نے مجھے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور مجھے طما کرنے لگا، اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "آغائی خان! تو تاشی کو کس طرح مار سکتا ہے یہ تیری ماں رہ چکی ہے۔" پھر اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "دوقوز! میری بیو ہے لیکن بیوی بننے سے پہلے یہ بھی میری ماں تھی۔ شب کی خلوتوں اور تعیشی لمحات میں میری بیوی ہوتی ہے

دن کے اجالے میں اور فکر یہ لمحات میں یہ میری مشیر ہوتی ہے، یہ سمور کے فرش پر میرے ب بیٹھتی ہے، اور اس کی عقل پر میرا تصرف اور اختیار ہوتا ہے، کیا تاشی کو تو نے اس کے حقوق ادا کر دیے؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی تاشی نے احتجاجاً کہا۔ "خان! یہ ناصری کی بیٹ آغائی خان کو ورغلاتی رہتی ہے، یہ کہتی ہے کہ آغائی کو شہروں میں رہنا چاہیئے یہ ہماری زند کو جانوروں اور درندوں کی زندگی قرار دیتی ہے اور خان! تمہیں خان اعظم چنگیز خان کا

تو یاد ہوگا کہ ہم میں سے جو بھی بچھڑ کر کہیں اور جا بسے گا۔ اس کا حشر اس پتھر جیسا ہو
ر گہرے پانی میں جا گرے یا اس تیر جیسا جو کہیں اونچی اونچی گھاس میں گم ہو جائے، وہ
ت دنا بود ہو جائے گا!"

ہلاکو خان نے تائید میں سر ہلایا اور کرائیت قبیلے کی دوقوز خاتون بھی تاشی کی حمایت
ر زور زور سے گردن ہلانے لگی۔

ماریہ یورت کے ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی، پھر وہاں سے اٹھ کر اپنے حجرے
چلی گئی۔

ہلاکو خان اس لئے آیا تھا کہ وہ شیخ الجبال اور بغداد پر حملے کی تیاریاں مکمل
کا تھا اور روانگی سے پہلے وہ خان اعظم کے مدفن پر شاندار قربانی دینا چاہتا تھا۔ دوقوز
ون تاشی سے باتیں کرنے لگی، باتوں کے دوران جب دوقوز خاتون کو یہ پتہ چلا کہ ماریہ
ے چیل میں گئی ہوئی ہے تو وہ بھی وہیں چلی گئی اور جب واپس آئی تو اس نے پہلا سوال
دم کی بابت کیا، پوچھا "تاشی! کیا کلثوم مسلمان ساحرہ ہے؟"

تاشی نے جواب دیا۔ "وہ ساحرہ نہیں، میری کنیز ہے اور مسلمان بھی!"

دوقوز خاتون نے نفی میں گردن ہلائی، کہنے لگی۔ "تو مسلمانوں کو نہیں جانتی، یہ
حرہ ہوتے ہیں!"

ہلاکو خان، دوقوز خاتون کے زیر اثر تھا۔ اس نے بھی بیوی کا ساتھ دیا اور مجھے
م دیا۔ آغا فی خان! کلثوم کو میرے شاہانوں کے روبرو پیش کرو۔ وہ اس سے اس کے ساحرہ
نے کا راز اگلوانے کی کوشش کریں گے کیونکہ اگر اس نے ہمارے یورتوں کے اندر ہی کوئی
ر کر دیا تو ہم اپنی نئی مہمات میں کامیابیاں کس طرح حاصل کریں گے!"

تاشی نے جب یہ دیکھا کہ زمانے کی ہوا اس کے خلاف ہو چکی ہے تو اس نے
صلحت اندیشی سے غاموشی اختیار کر لی لیکن اسے اب یہ پورا یقین ہو چکا تھا کہ ساحرہ کلثوم
یں، ماریہ ہے جس نے چیل میں دوقوز خاتون کو مسحور کر لیا تھا۔

تاجروں کا ایک قافلہ ہماری آبادی میں طرح طرح کی چیزیں بیچتا پھر رہا تھا ان کے
س آگ جلانے کے پتھر، چینی ریشمی کپڑے منقش چمڑے، چاندی کے ہار اور خوبصورت
ستے ہماری دلچسپی کا باعث بن گئے تھے۔ منگول عورتیں انہیں نہایت شوق سے دیکھتیں
ور جن میں خریدنے کی استطاعت تھی، اپنی پسندیدہ چیزیں خرید لیتیں، یہ تاجر ہمارے
ورتوں کے آگے پیچھے آوازیں لگاتے گھومتے رہتے، ان سے تاشی اور ماریہ نے بھی کچھ چیزیں

خریدیں مجھے ان تاجروں سے سخت نفرت تھی، کیونکہ میرا تجربہ تھا کہ یہ لوگ بڑے دغاباز ہوتے ہیں، ہم انہیں ٹوپی کمر بند والے کہتے تھے۔

دریائے کیرولان اور دریائے تولا کے درمیان برخان کلدون (کوہستان اقتدار) کے جنوب میں خاقان اعظم منگو قان، ہلاکو خان اور اریق بوغا اپنے نویان نوئر غانوں (نوجی اور غیر فوجی عہدے دار) کے ساتھ جمع ہوتے ہیں وہ عظیم الشان کا درخت ہے جس کے نیچے ہمارا خان اعظم چنگیز خان نشست کی حالت میں دفن تو ہمارے سامنے حدِ نظر تک انسان ہی انسان پھیلے ہوتے تھے، یا اپنے سروں کو گدو ڈھانپ لینے والی چمڑے کی ٹوپیوں سے چھپاتے اور سمور کے لبادوں سے سینے اور کو ڈھانپے ہوتے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے، ان کے پاجامے بھی چمڑے کے ان میں جو اعلا منصب کے مالک تھے ان کے لبادوں میں قیمتی جواہرات وغیرہ ہوتے تھے۔

ایک طرف ہزاروں جانور کھڑے پڑے تھے اور ان کے بھونے جانے کا ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ہزاروں چھکڑوں پر شراب کے مشکے رکھے ہوتے تھے، ان کے باہر دو طرفہ آگ کے الاؤ روشن تھے، جن کے تیز شعلے فضا میں لہرا رہے تھے وہاں ایک چادر کی شکل میں اٹھ کر فضا میں پھیلتا جا رہا تھا۔ خاقان اعظم کے یورت پہلو میں ایک بہت بڑا یورت ایستادہ تھا جس میں چالیس سفید گھوڑے اور چالیس حسین لڑکیاں قید تھیں یہ لڑکیاں چین، متا، اور آنہر، ایران اور الیشائے کوچک شہروں سے لائی گئی تھیں، اور انہیں خان اعظم کے مدفن پر بطور ہدیہ پیش کرنا تھا

یہ موسم بہار کے ایام تھے، ہوا میں خوشگوار خنکی تھی، قربانی کی رسم سے گھوڑ دوڑ ہوئی جس میں لڑکوں تک نے حصہ لیا اور بارہ میل کا چکر کاٹ کر خان اعظم کے مدفن کو بوسے دیئے پھر خاقان اعظم کے حکم سے ڈھول تاشے بجنے لگے، میں ہلاکو خان کے ساتھ گھوڑا دوڑا اور حسین عورتوں کے یورت کی طرف بڑھا۔ خاقان اعظم اپنی بیوی تائی کے ساتھ اپنے یورت کے در پر کھڑا ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ ہماری بیویاں بھی کے در پر کھڑی اداسی رسم کا تماشا دیکھ رہی تھیں، میں اور ہلاکو خان جب گھوڑا لڑکیوں کے یورت سے لے کر باہر نکلے تو گرد و پیش اتنا ہجوم بڑھ چکا تھا کہ خاقان کے حکم پر انہیں ڈنڈے مار مار کر راستے سے ہٹانا پڑا۔ چالیس آدمی چالیس گھو لگامیں پکڑے آہستہ آہستہ چل رہے تھے، ان کے پیچھے حسین لڑکیاں تھیں، ان

ر دہشت سے سفید پڑ گئے تھے، اور ان کے پیروں میں اتنی طاقت بھی باقی نہ رہی
دسے وہ چل سکتیں، ہمارے طاقت ور سپاہی انہیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ
، شدتِ کرب اور خوفِ مرگ سے وہ بین کر رہی تھیں، ان کی پنڈلیوں اور ایڑیوں سے
رہا تھا۔ بعض چل رہی تھیں اور کچھ خاموش تھیں، جو خاموش تھیں، وہ بے ہوش
یں، آگے چل کر خاقانِ اعظم، اس کی بیوی قتوق تاتی، ہلاکو خان کی بیوی دقتوز
دعیری بیوی تاشی بھی ہم میں شامل ہو گئیں، ان میں خاقانِ اعظم اور اس کی
ب سے آگے تھے۔ تاشی میرے قریب آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"ماریہ کہاں ہے؟"

تاشی نے نفرت سے جواب دیا۔ "یورت میں!"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیوں نہیں آئی؟"

تاشی نے جواب دیا۔ "وہ کہتی ہے کہ جادوائی نیلے آسمان نے منگولوں کو جسم اور
طا کئے تھے، انہوں نے جسم سے تو کام لیا اور دماغ کو زنگ لگا دیا۔ لیکن بن کے
سم کے ساتھ ہی دماغ بھی ہے وہ ان تقریبوں میں کس طرح حصہ لے سکتا ہے؟"

اگر قرہ بانی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں اسی وقت ماریہ کے پاس جاتا اور اسے زبردستی
ا میں نے تاشی کو چپ کرنے کے لئے کہا۔ "ماریہ کو اپنے علم اور عقل پر بہت غرور
اس کا بہت اچھا جواب دوں گا!" پھر تاشی سے پوچھا۔ "کلثوم کہاں ہے؟"

تاشی نے جواب دیا۔ "یورت میں، میں اسے قصداً اپنے ساتھ نہیں لائی، جب تم
چلو گے تو جادوائی نیلے آسمان کی برکت سے میں تمہیں ایک بہت اچھا تماشہ
ں گی!"

ابھی میں کوئی جواب بھی نہ دے سکا تھا کہ ہلاکو خان میرے قریب آیا اور تاشی
ذم کی بابت سوال کیا۔ تاشی سے یہ جاننے کے بعد کہ وہ یورت میں ہے، ہلاکو خان
ی سے کہا۔ "ہاں! میں بات کا خیال رہے کہ وہ مسلمان ساحرہ کہیں فرار نہ ہو جائے۔
مانوں کے روبرو اسے بھی پیش کر دیا جائے گا اور پھر کیا ہو گا یہ کوئی
جانتا!"

تاشی نے ہلاکو خان سے کہا۔ "خان! کلثوم تنہا نہیں مرے گی، اس کے ساتھ
جانا اور جائے گی!"

ہلاکو خان ہکا بکا رہ گیا وہ سمجھا تاشی خود بھی کلثوم کے ساتھ مرنا چاہتی

ہے، بولا۔ "تو کیسی منگول زادی ہے، جو ایک ناپاک مسلمان ساحرہ کے سا
چاہتی ہے!"

تاشی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "خان! تمہاری بات کا کل ہی ج
دوں گی!"

خانِ اعظم چنگیز خان کی فیرڈھلان پر واقع تھی، وہاں مول موٹی لکڑیو
گزنما ڈنڈے پہلے ہی سے مہیا کر دیے گئے تھے۔

خاقانِ اعظم آگے بڑھا اور اس کے حکم پر یکے بعد دیگرے چالیس
ذبح کر دیے گئے، ان گھوڑوں کا خون بہہ بہہ کر صنوبر کی جڑ اور خانِ اعظم چنگیز خا
قدموں میں جمع ہونے لگا۔ گھوڑوں کی قربانی کے بعد ہم لوگوں کے روبرو چالیسوا
پیش کی گئیں۔ خاقانِ اعظم نے ایک لڑکی کو گلے سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ قربانی کے ج
طرح بدکنے لگی لیکن طاقتور خاقان نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا اور گلا
لڑکی کا جسم تھرتھرانے لگا، اور وہ دونوں پیر گھسلنے لگی، اس کی دونوں آنکھیں اب
آگئیں، اور زبان دانتوں کے درمیان سے نکل کر پھنس گئی۔ خاقان نے پھڑکتا ہوا
خانِ اعظم کے پانتنی گھوڑوں کے تھنوں کے گڑھے میں پھینک دیا۔ لڑکی کا سرخون
میں چلا گیا اور بقیہ حصہ اوپر رہ گیا، وہ اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ خاقانِ اعظ
پر گزنما ڈنڈے برداشت آگے بڑھا اور ڈنڈے کی ضربوں سے اس کی ریڑھ کی ہڈ
لگا۔ چند ہی ضربوں میں وہ لڑکی بغیر ہڈیوں کے لاشے کی طرح لجلجی سی ہو گئی۔

وہ لڑکیاں جنہیں قربان ہونا تھا خوف اور دہشت سے یا تو بے ہوش
یا پھر نیم جان رہ گئیں اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں، ان سب کو یکے بعد دیگ
طرح قربان کر دیا گیا۔ قربانیوں سے فارغ ہو کر ہم اپنے یورتوں میں واپس پہنچے اور
خوری کا دور شروع ہوا لوگ گوشت کے ٹکڑے حلق کے نیچے اتارے چلے جا رہے
زیادہ سے زیادہ کھانے کی ہوس تھی جب وہ بہت زیادہ کھا چکنے کے بعد یہ محسو
کہ اب پیٹ میں گنجائش نہیں رہی تو وہ چپ چاپ یورت سے باہر نکل جاتے اور
کے پھر واپس آجاتے اور پھر کھانے لگتے، کھانے کے بعد شراب کا دور چلا اور میں نے
تک پی لی کہ اپنے قدموں سے میں خانِ اعظم کے مدفن سے واپس نہ جا سکا، خا
اور ہلاکو خان کو بھی ان کے خدمت گار اپنے کاندھوں پر ڈال کر ان کی اقامت
تک لے گئے۔

دوسرے دن ہلاکو خان کئی شامان لے کر میرے یورت میں داخل ہوا۔ اس کی
دقوز خاتون اس کے ساتھ تھی۔
ہلاکو خان نے مجھ سے پوچھا۔ "کلثوم کہاں ہے، شامان آگئے ہیں، وہ اس کے ساتھ
ہونے کی تصدیق یا تردید کریں گے!"
تاشی سینہ سپر ہوگئی۔ اس نے جواب دیا۔ "میں نے اسے بٹھا دیا ہے۔ جب میں
جانتی ہوں کہ وہ ساحرہ نہیں ہے تو خان تم شامانوں کو خواہ مخواہ لے آئے!"
ہلاکو خان نے ڈانٹ پلائی۔ "شیطان کی جنی! بکواس بند کر اور اس مسلمان
کو حاضر کر!"
دقوز خاتون نے بھی بے مروتی اختیار کی، کہنے لگی۔ "میری ہمدردیاں بھی ماریہ
کے ساتھ ہیں کیونکہ وہ ایک چیپل رکھتی ہے اور اس میں ناصری کی تصویریں ہیں جس کی
عبادت کرتی ہے!"
میں نے بھی تاشی کو دلاسا دیا اور اس سے کلثوم کا پتہ پوچھا۔ لیکن اس موقعے پر
وہ اطمینان قابل داد تھا۔ وہ ذرا بھی پریشان نہ تھی۔ یورت کے بغلی حصے سے ماریہ بھی
آئی۔ وہ اپنے چیپل سے اٹھ کر آئی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے اداس اور سوگوار
نظروں سے مہمانوں کی طرف دیکھا اور تاشی کے پیچھے دبک کر کھڑی ہوگئی۔ ہلاکو خان اور اس
کے ساتھ آئے ہوئے شامان، کلثوم کے منتظر تھے۔
تاشی نے مڑ کر ماریہ کو تیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "ماریہ! تم کیا کہتی ہو؟ کیا تم
نے یہی کہتی ہو کہ کلثوم جادوگر ہے؟"
ماریہ نے بیان بدل دیا۔ بولی۔ "میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، کلثوم نہایت ہی
باز اور سچی عورت ہے مجھے اس کے بارے میں ذرا غلط فہمی ہوگئی تھی!"
دقوز خاتون نے ماریہ کو درشت لہجے میں مخاطب کیا، بولی۔ "جب تو نے اس
عیسائی زادی کو ایک بار ساحرہ کہہ دیا تھا تو تجھے آخر وقت تک اپنے بیان سے منحرف نہیں
ہونا چاہیے تھا!"
ماریہ نے افسردگی سے تاشی کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوالات کرنے
لگی۔ "تم کیا کہتی ہو؟ میں خاموش رہوں یا کچھ بولتی رہوں؟"
تاشی نے جواب دیا۔ "میں کچھ نہیں جانتی جس طرح تو نے اسے یورتوں کے شہر

میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا، اسی طرح میں چاہوں تو تجھے خوار کر دوں!"
ماریہ نے پھر خوشامدانہ درخواست کی۔ "لوگو! سچ کہتی ہوں، ناصری نے فرما
جو شخص تمہیں بیگار میں ایک میل لے جائے تم اس کے ساتھ خندہ پیشانی
میل چلے جاؤ۔ اس مقدس قول کی روشنی میں، میں درخواست کرتی ہوں کہ کلثو
کو سزا نہ دی جائے!"
لیکن ہلاکو خان کہاں ماننے والا تھا۔ وہ بدستور کلثوم کی طلبی پر مصر رہ
تاشی نے تنگ آ کر حکم دیا کہ "کلثوم کو معزز خان کے روبرو پیش کر دیا جائے!
کے بعد درخواست کی۔ "خان! میں اپنے عقیدے کے اعتبار سے جو کچھ بھی
وہ اپنی جگہ لیکن میں تم لوگوں سے ایک درخواست کروں گی، میرا خیال ہے تم
اسے مان لوگے!"
ہلاکو خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاشی کے حکم پر ایک عورت کلثو
لینے چلی گئی۔
تھوڑی دیر بعد کلثوم اس طرح حاضر کی گئی کہ اس کے ساتھ ایک ا
تھا۔ سرخ و سفید، دبلا پتلا بیس بائیس سالہ نوجوان، وہ جیسے ہی سامنے آیا او
کی اس سے نظریں ملیں وہ چیخ مار کر اپنے چیپل میں چلی گئی۔ تاشی مسکرا
ہلاکو خان، دو خوبرو خاتون اور میں اشاروں کے ساتھ اس اجنبی کو حیرت اور رس
نظروں سے دیکھنے لگے۔
میں نے تاشی سے پوچھا۔ "تاشی یہ کون ہے؟"
"ایک تاجر اور ماریہ کا عاشق!" تاشی بہت خوش تھی۔ "یہ تاجر معلوم نہیں
سے ماریہ کو تلاش کرتا ہوا آیا۔ یہ اپنا سامان بیچنے کے بہانے کئی دن سے میرے یورت
لگا رہا تھا، پھر میں نے اسے ماریہ سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ
زبان میں ماریہ سے باتیں کرتا تھا کلثوم اس سے اچھی طرح واقف ہے اور اسی نے
بتایا کہ یہ نوجوان تاجر ماریہ کا عاشق ہے اور ماریہ کی تلاش میں یہاں تک ایک تا
رجب میں آ گیا ہے۔ میں نے اسے دھوکے سے بلا کر ایک یورت میں قید کر دیا، او
میں خان سے انصاف کی طالب ہوں، اس اجنبی نے آغائی خان کی بیوی ماریہ کو
اور یہاں سے نکال لے جانے کا منصوبہ بنایا کیا یا سادہ چنگیزی قانون میں اس جر
سزا نہیں!"

ہلاکو خان نے فکر میں ڈوب کر سر اٹھایا، اور کلثوم سے پوچھا۔ "کیا تو اس اجنبی کی
ے واقعی واقف ہے؟"
کلثوم نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "خوب اچھی طرح!"
ہلاکو خان نے کہا۔ "اچھا تو اس نوجوان سے مسیح ناصری کی قسم دے کر پوچھ کہ
واقعی ماریہ کے اغوا کی نیت سے یہاں آیا تھا!"
کلثوم نے شامی عربی میں اس نوجوان سے باتیں کیں، ہلاکو خان اور میں انتہائی توجہ
ہ نہ سمجھنے کے باوجود ان کی باتیں سنتے رہے کچھ دیر بعد کلثوم نے منگولوں کی زبان میں
معزز خان! یہ نوجوان اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے!"
ہلاکو خان نے جھگڑا چکانے کے انداز میں شامانوں سے کہا۔ "ذرا تم لوگ کلثوم
تزہ تو لو کہیں یہ مسلمان ساحرہ چپکے چپکے ہم پر جادو تو نہیں کر رہی؟"
نوکیلی اور سفید داڑھی والا شامان کلثوم کی طرف بڑھا اور اس سے کہنے لگا۔
لکی! اگر تو سب کچھ سچ سچ بتا دے تو یہ تیرے لئے بڑی اچھی بات ہوگی، بتا، کیا تو
ی ساحرہ ہے؟"
کلثوم نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "میں ساحرہ نہیں ہوں!"
شامان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تو جھوٹ بولتی ہے
ساحرہ ہے!"
"میں جھوٹ نہیں بولتی، میں ہرگز ساحرہ نہیں!"
ہلاکو خان نے کہا۔ "کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو نے ہمارے لوگوں پر جادو کر دیا
ے تاکہ جب ہم مسلمانوں سے جنگ کریں تو یہ اجاد و مسلمانوں کا ساتھ دے اور ہمیں ہلاکتوں
ساسا کرنا پڑے!"
کلثوم نے دلیری سے جواب دیا۔ "یہ مجھ پر سراسر تہمت ہے، اتہام ہے!"
شامان نے چمڑے کا تھیلا نیچے رکھ دیا اور اس میں سے ایک ہتھوڑا اور بہت سارے
نجیں نکالیں، پھر کلثوم سے کہنے لگا۔ "یہ میخیں جادو کا اثر زائل کر دیتی ہیں اگر تو نے جادو
یلہ ہے اور خوف سے اقرار نہیں کر رہی تب بھی ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم اپنا علاج جاری رکھیں!"
اس کے بعد دوسرے شامانوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً آگے بڑھیں اور کلثوم کو نیچے
گرا کر داب لیں، اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ کلثوم پچھاڑ دی گئی۔ بڑا شامان ہتھوڑا اور
چند میخیں لے کر کلثوم کے پیروں کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ اس نے ایک میخ کلثوم کے داہنے

پیر کے تلوے میں ٹھونک دی۔ کلثوم نے چیخ ماری اور زمین پر لوٹنے لگی۔ ہم لوگ بھی گھبرا گئے اور کلثوم دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جب اس نے یہ اچھی طرح یقین کر لیا کہ شامان اسے جیتا نہ چھوڑیں گے تو اس نے زندگی کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ہلاکو خان سے سوال کیا "خان! اگر میں سچ بول دوں تو کیا تم لوگ میری جان بخشی کر دو گے؟"

ہلاکو خان نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

کلثوم نے جھوٹ موٹ کہہ دیا "ہاں میں بے شک ساحرہ ہوں اور میں نے ا کے بورتوں پر جادو کر دیا ہے۔"

ہلاکو خان کا چہرہ کھلا ہوا تھا اس نے سر کے ہلکے سے اشارے سے حکم دیا "تم جادی رہے۔"

دوسرے شامانوں نے کلثوم کو دبا لیا اور بوڑھا نوکیلی داڑھی والا شامان اپ ہتھوڑے کی ضربوں سے میخیں ٹھونکتا رہا۔ اس کے دونوں پیر، دونوں ہاتھ اور ٹھوڑی۔ نیچے میخیں ٹھونک دی گئیں، کلثوم اس طرح میخیں مار مار کر روئی جیسے ذبح ہونے والی بکریاں میاں میاں کرتی ہیں۔ ابھی کلثوم کا دم بھی نہ نکلا تھا کہ ہلاکو خان نے نیا حکم دیا "کلثوم کو چمڑے کے تھیلے میں سی دیا جائے۔"

اسی وقت شامانوں نے چمڑے کے تھیلے کو خوب صاف کیا اور اس میں کلثوم کو سبزی کی طرح ٹھونس دیا، پیر اور ہاتھوں کی ہڈیاں آسانی سے آ ہی گئیں، شامانوں نے انہیں توڑ دیا اور تھیلے میں بند کر کے اس کا منہ سی دیا اور پھر اس تھیلے کو ہلاکو خان ہی کے حکم پر میں ڈبو دیا گیا۔ اب ہم جب کلثوم کے سحر سے محفوظ ہو گئے تھے۔

اب اجنبی تاجر، ماریہ کے عاشق کی باری تھی، میں آگے بڑھا اور اس کے منہ ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

میں نے پوچھا "نوجوان تاجر! کیا وہ الزام جو تجھ پر لگایا گیا درست ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے ہلاکو خان سے کہا "یہ اگر واقعی ماریہ کا عاشق ہے تو اسے ہماری زبان ضرور آتی ہو گی، کیونکہ ماریہ بھی ہماری زبان جانتی ہے۔"

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ "یہ مہذب لوگ جھوٹے بہت ہوتے ہیں اور عیار۔"

میں نے اجنبی تاجر سے پھر سوال کیا "تجھ پر ناصری کی رحمتیں نازل ہوں،

نسم کھا کر سچ نہیں بول سکتا!"
تاجر کچھ پسیجا۔ میں نے پھر کہا۔ "کیا تو واقعی ماریہ سے محبت کرتا ہے اگر یہ بات
ز میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تو سب کچھ سچ سچ بتا دے ہم ساحت گوئی پر تجھے
ت بڑا انعام دیں گے!"
تاجر نے پوچھا۔ "کیسا انعام؟ کون سا انعام؟ کیا تم لوگ ماریہ کو میرے
دو گے؟"
"شاید!" میں نے جواب دیا۔ "اگر تو ہمیں یہ یقین دلا سکے کہ تو نے جو کچھ کہا وہ سچ
ید میں اپنی ماریہ بھی تیرے حوالے کر دوں!"
نوجوان تاجر میرے دام میں پھنس گیا۔ کہنے لگا۔ "ماریہ میری منگیتر ہے۔ جب تم
ا لائے ہو، میں بیت المقدس گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے ناصرے میں بیت اللحم کی زیارت
پھر حضرت مسیحؑ کی قربان گاہ گلگتا چلا گیا جب واپس آیا تو اس سانحے کا علم ہوا۔ اس
ی نیت سے آیا تھا کہ کسی طرح اسے یہاں سے نکال لے چلوں لیکن قسمت میں ناکامی
ر" پھر تاشی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "میں ذلیل عورت نے معلوم نہیں کس
سے ارادوں کو بھانپ لیا۔ آج میں گرفتار تم سب کے سامنے کھڑا اپنی سوت
ہوں!"
بلاکو خان نے دوقوز خاتون کی طرف دیکھا کہ وہ اس مسیحی حاشق کے لئے کیا سزا
تی ہے کیونکہ دوقوز خاتون عیسائیوں کی طرح عبادت کرتی تھی اور مسلمانوں کے مقابلے
یحیوں کے ساتھ امن کا ترجیحی سلوک رہتا تھا۔
تاشی بھی امن کی نیت بھانپ گئی۔ اس نے احتجاج کیا۔ "خان! اگر اس تاجر کی
نصاف سے کام نہ لیا گیا تو میں یہ مقدمہ خاقان اعظم کے پاس لے جاؤں گی، خاقان اعظم
ب کی عزت آبرو کا محافظ اور جان و مال کا مالک ہے!"
دوقوز خاتون نے ناصری سے سوال کیا۔ "اگر تجھے چھوڑ دیا جائے تو کیا تو یہاں سے
کے لئے چلا جائے گا؟"
ناصری نے نفی میں گردن ہلا دی۔
تاشی نے نیا مسئلہ اٹھایا۔ بولی۔ "ماریہ کو بھی یہیں بلایا جائے اور اس مقدمے کی
ائی اس کے سامنے ہونی چاہیئے!"
میں نے بھی تائید کی، اور بھاگ کر چیپل میں داخل ہو گیا۔ میں سخت مشتعل تھا اور

اگر ہلاکو خان اور دوقوز خاتون آڑے نہ آتے تو میں ماریہ کی سخت پٹائی کرتا۔ چنانچہ
چیپل میں یہ ارادہ کر کے داخل ہوا تھا کہ ماریہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لاؤں
میرے پیچھے دوقوز خاتون بھی پہنچ گئی اور بآواز بلند کہا۔ "چیپل میں نہ تو کسی پر ظلم
سکتا ہے نہ کسی کو سزا دی جا سکتی ہے بہتر ہے کہ ماریہ کو نرمی سے چلنے کا حکم دیا جائے
میں نے غصے میں جواب دیا۔ "میں ناصری نہیں ہوں اس لئے مجھ پر یہ وا
نہیں آتا کہ میں چیپل کا احترام کروں!"
مجھے سے ہلاکو خان کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔ "خارش زدہ کتے کی اولاد! خا
خاتون تیری حاکم ہے جیسا یہ کہتی ہے اس پر عمل کر۔"
میں نے ماریہ کو گدی سے پکڑ لیا اور کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں نے اسے ا
عاشق کے روبرو کھڑا کر دیا اور ہلاکو خان اور اس کی بیوی سے کہا۔ "خان! یہ میرا مجر
یا سا کا قانون میں بھی جانتا ہوں، اپنے مقدمے کا فیصلہ میں خود کروں گا اور سزا
خود دوں گا!"
ہلاکو خاں نے ماریہ کے رخسار پر طمانچہ رسید کیا اور مجھ سے کہا۔ "آغا
تیرا بڑا بھائی ہوں، کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں انصاف نہیں کر سکوں گا۔ یورپ والوں کا شہر
اور انصاف ہی کی وجہ سے تو آباد ہے کیا یہاں کا کوئی بھی شخص یہ پسند کرے گا کہ
کو ظلم اور ناانصافی سے تباہ و برباد کرا دیا جائے۔ مقدمے کا فیصلہ میں کروں گا،
عمل درآمد تو کرے گا!"
ہلاکو خان کے طمانچے نے ماریہ کے گال سے خون سا چھلکا دیا۔ دوقوز خاتون
سے ہمدردی تھی، آگے بڑھ کر تسلی دی، اور کہا۔ "ماریہ! تو اپنے عاشق سے کہہ کہ وہ
عشق سے دستبردار ہو جائے میں ناصریوں کا احترام کرتی ہوں، خان میرے کہنے سے تیر
کو معاف کر سکتا ہے!"
لیکن ہلاکو خان نے دوقوز خاتون کو بھی ڈانٹ دیا۔ "دوقوز! کیا تو نے
بات نہیں سنی کہ تمر تم حق و انصاف کی سرزمین ہے یہاں یاسا کے قانون کے مطا
کیا جائے گا۔"
تاشی ابھی تک خاموش تھی۔ اس نے پہلی بار دوقوز خاتون کی کھلم کھلا
کی، کہنے لگی۔ "تو نے کلثوم کو بلاوجہ ساحرہ قرار دے کر قتل کرا دیا تو خواہ مخواہ ناصر
اور مسلمانوں کی مخالفت کرتی ہے اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ جاودانی نیلا آسمان ناصریو

قانِ اعظم کو مجبور کر کہ وہ بھی یاسا کو چھوڑ کر ناصری ہو جائے!"
ہلاکو خان نے دونوں عورتوں کو ڈانٹا۔ "تم دونوں ہماری مائیں تھیں لیکن اس
دونوں تمہارے شوہر ہیں، اس لئے ہم تمہیں حکماً خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہیں!"
ہلاکو خان کے حکم سے سرتابی!! کس کی مجال تھی جو کرتا۔ دونوں چپ ہو گئیں۔
ہلاکو خان نے مجھے حکم دیا کہ ماریہ کے عاشق ناصری کو میں جس طرح چاہوں ہلاک
ں۔
تاشی کی خوشی اور ماریہ کی غم سے چیخیں نکل گئیں، میں نے منصف ہلاکو خان اور
ون کو عزت سے بٹھایا اور انہیں گھوڑی کا دودھ پیش کیا۔ وہ دونوں دودھ
ہو گئے۔ میں نے دو تلواریں نکالیں اور ناصری سے دریافت کیا۔ "کیا تجھے لڑائی
ہے؟"
اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔
میں، ماریہ، تاشی اور ناصری کو ساتھ لے کر یورت سے نکلنے لگا اور ہلاکو خان سے
تم دونوں چاہو تو باہر نکل کر اس ناصری کا حشر دیکھ سکتے ہو!"
وہ دونوں فوراً نہیں اٹھے، میں نے ایک تلوار ناصری کے حوالے کی اور دوسری اپنے
لے کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے حکم دیا ——— "ناصری! تو سر
لئے میں سپاہتا ہوں کہ تو مجھ سے مقابلہ کر، تیری موت تو یقینی ہے لیکن میں تجھے
موت کی دعوت دیتا ہوں!"
میرا خیال تھا کہ وہ کم ہمت ناصری تلوار نہیں اٹھائے گا لیکن اس نے تلوار اٹھا لی
اس روتے پر میں حیرت زدہ بھی ہوا اور پریشان بھی، وہ تلوار لے کر تاشی اور ماریہ
، الٹے قدموں ہٹا، میں یہ سمجھا کہ وہ دونوں کے پیچھے پناہ کی تلاش میں جا رہا ہے لیکن
خلاف توقع ماریہ کو زخمی کر دیا یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ ہلاکو خان اس وقت یورت
نکل رہا تھا اور اس نے ناصری کی کنپٹی پر گھونسا مار کو گرا دیا۔ ماریہ کا شانہ زخمی ہو گیا
وہ چیخ مار کر یورت میں چلی گئی۔ میں بے ہوش ناصری پر مردہ زدے کی طرح ٹوٹ پڑا۔
اس کے بعد اس کے ناک کان کاٹ لئے، اس کی انگلیاں، اس کی زبان
ائی، مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ مرا نہیں، بلکہ بے ہوش ہے اس لئے میں اس کے ہوش
نے پر تڑپنے تھرکنے کا منظر دیکھنا چاہتا تھا بلکہ ماریہ اور تاشی کو بھی دکھانا
تھا۔

ہلاکو خان اور دونوں خاتون واپس چلے گئے۔ میں نے اندر جا کر ماریہ
دوا لگائی اور دونوں کو لے کر باہر آ گیا۔ ماریہ نے غیر معمولی صبر و ضبط کا ثبوت
ہوش میں آتے ہی آہیں بھرنے لگا اور اس کا جسم تڑپنا کانپنے ہوتے جانور کی
تھرکنے لگا۔ ماریہ نے شاید جبر کے ساتھ یہ منظر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شاید
عاشق کے قاتلانہ رویے سے بہت ناخوش تھی اور تلوار کے گھاؤ نے اس کے
ناصری کی محبت بھاپ کی طرح اڑا دی تھی۔

مسلمانوں کا سب سے بڑا بادشاہ مغرب کے کسی بغداد نامی شہر میں
میں مشغول تھا۔ ہلاکو خان ایک لاکھ بیس ہزار فوج لے کر شاہراہ ریشم سے چل پڑا
بیوی دو خاتون بھی اس کے ساتھ تھی اور اس کا چھوٹا سا چیبل بھی ساتھ
تاشی اور ماریہ بھی میرے ساتھ تھیں، تاشی نے ماتھے کے بال مونڈ دیے تھے
گوندھی تھی، ہمارے بیشتر یورت سفید اونٹوں کے تھے، ان کا ڈھانچا لکڑیوں کا
سفید اون کا یورت منڈھ دیا گیا تھا۔ یہ پہیے والی گاڑیوں پر لاد دیے گئے، گاڑیاں
پہیوں کا درمیانی فاصلہ دونوں ہاتھوں کے پھیلانے سے جو فاصلہ بنتا ہے اس
گنا زیادہ تھا۔ ایک ایک یورت کو بیس بیس یا تیس تیس بیلوں کھینچ رہے
دریاؤں کے حائل ہونے کی صورت میں اونٹ گاڑیاں بھی ساتھ رکھی گئی تھیں تا
کو عبور کرنے کے لئے یورتوں کو اونٹ گاڑیوں پر منتقل کیا جا سکے۔ ہماری عورتیں
ان یورتوں میں یک جا تھے، یورتوں کے اندرونی سطح پر طرح طرح کی تصویریں
انگور کی بیل، چڑیاں، گھوڑے، اونٹ اور تیت کے یاک کی تصویریں یقیناً ہمارے
کے دل بہلا رہی ہوں گی۔

خاقان اعظم اور دوسرے معزز لوگ ہمیں رخصت کرنے کے لئے گھ
بیٹھ کر ساتھ ساتھ چلے، یہاں تک کہ ہم لوگ اپنی آبائی چراگاہ میں داخل ہو
ہمیں دور ہی سے یاک کی دموں والا پرچم زمین پر گڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس
ہمارے خان اعظم چنگیز خان کی عظیم سولدہ (روح) حلول کر چکی تھی اور اس
اور ۸ روحا حاصل کئے بغیر ہم آگے کس طرح بڑھ سکتے تھے، خاقان اعظم، پرچم
پہنچ کر گھوڑے سے اتر پڑا اس کی پیروی میں ہم لوگ بھی گھوڑوں کی پشت
گئے۔ خاقان اعظم نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو حکم دیا۔ "پرچم کو بوسہ دے

رعا کرو!"

ہلاکو خان نے حکم کی تعمیل میں پرچم کو بوسہ دیا اور گردن کو اکڑا کر دعا مانگی۔

ن کی عظیم سولدہ! کیا تو ہمیں دیکھ رہی ہے؟ کیا تجھے یہ نہیں معلوم کہ ہم کہاں جا رہے

م نے تیری آخری آرام گاہ کے قدموں میں چالیس گھوڑوں اور چالیس حسین

قربانی نہیں دی؟

ہلاکو خان کو اپنے سوالات کے جواب درکار تھے، خاقان اعظم نے اردو کے تین

کار طلب کیے اور ہلاکو خان کو حکم دیا کہ انہیں تلوار کے ایک ایک وار سے قتل کر دو

طرح کہ ان کا خون پرچم کی جڑ کی زمین میں جذب ہونے لگے۔ ہلاکو خان کے لئے یہ

ت معمولی کام تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تینوں کو یاک کے تو دموں والے پرچم

ے چڑھا دیا، اس کے بعد ان کی نظریں اوپر آسمان پر اٹھ گئیں وہ فضا میں دھندلی

سیاہی مائل پہاڑی چوٹیوں کے اوپر کسی چیز کو تلاش کر رہے تھے، اچانک اونٹ

جیسی ایک چوٹی کے پیچھے سے ایک عقاب نمودار ہوا اور اڑتا ہوا ان کے سروں

اس نے ادھر ادھر منڈلا کر کئی چکر لگائے اس کے بعد غوطہ مار کر نیچے آ گیا۔

لروتے لاغوں پر جھپٹا مارا اور ذرا دیر بعد وہ پرچم پر بیٹھ کر آدمیوں کی

کا شمار کرنے لگا۔

خاقان اعظم نے مبارک باد دی۔ "تیری قربانی قبول ہوئی ہلاکو خان! اب تو

ے کے آخری قلعے تک بڑھتا چلا جا اور ہاں شیخ الجبال کو قطعی معاف نہ کرنا، جب تو

گھونسلوں جیسے قلعے تباہ و برباد کر چکے تو شیخ الجبال کو میرے پاس بھیج دینا۔ اور ہاں

دربار میں نصیر الدین طوسی نامی ایک عقل مند انسان بھی موجود ہے اسے عزت و

سے میرے پاس بھیج دینا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ سانپوں کو مار کر ان کے بچوں کی طرف سے

برتنا بے وقوفی ہے، جب تو سانپوں کو کچل چکے تو ان کے بچوں کو بھی کچل دینا اور اس

پروا نہ کرنا کہ ان کے بہت سارے بچے پنگوڑوں میں اپنے انگوٹھے چوس رہے

ے تو تو ان کے ملک میں قاب بن کر داخل ہو گا اور پنگوڑوں کے بچوں تک سے ہرگز

اور رحم دلی نہ برتنا!"

ہلاکو خان نے تعمیل حکم کا وعدہ کر لیا۔

اس کے بعد ہم شاہراہ ریشم سے کاشغر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارا سفر کوئی معمولی

تھا۔ ایسا لگتا جیسے بہت بڑا شہر مشرق سے مغرب میں محو سفر ہے۔ شکار کھیلتے گھوڑوں

کو اچکتے کدلتے مہینوں سفر کرتے رہے، جب ہم تیان شان سے گذر رہے تھے
نے مجھے بلایا۔ وہ کھڑکی باندھے اپنے شہر کی طرف دیکھ رہی تھی، مجھ سے کہنے
واپسی میں تم مجھے ایک بار میرے شہر میں لے چلو گے؟"

میں نے وعدے کے طور پر اپنی گردن ہلا دی۔

دوران سفر ہی ماریہ کے لڑکا پیدا ہوا۔ دوتوز خان اور ہلاکو خان نے
دیا کہ "اسے سفری چیل میں لے جاؤ اور بپتسمہ دو!"

ماریہ کی بھی یہی خواہش تھی، میں نے اس پر عمل کیا۔ ماریہ نے کہا "
بچے کو تعلیم دلاؤں گی، علم سکھاؤں گی، اور عقل مند بناؤں گی۔ ماں رلے ایسی زندگ
کروں گی جو اونچے اونچے پختہ مکانوں میں پائی جاتی ہے!"

میں نے اسے ڈانٹ دیا "چپ رہ کیتا! بھلا بھیڑیے کو بکری کی طرح باڑے
طرح باندھ سکتا ہے تو؟!"

ماریہ نے کہا "یہ میرا بچہ ہے کیا اس پر میرا کوئی حق نہیں؟"

میں نے کہا "یہ میرا بچہ ہے" اس پر میرا حق مقدم ہے!"

تاشی نے جل کر کہا "ایک عقاب کو کبوتر کس طرح بنایا جا سکتا ہے،
عقاب ہی رہے گا!"

ماریہ نے بھی غصے میں جواب دیا "تو چپ رہ بے اولادی! تجھے کیا پتہ
اور عقاب کو کبوتر کس طرح بنایا جا سکتا ہے، یہ طریقہ میں جانتی ہوں!"

اس کے بعد ماریہ کا یہ طریقہ ہو گیا کہ جب بھی میں اس کے پاس جاتا
تشدد، رحم، دغا کی بے ثباتی اور تہذیب و شائستہ پر بات کرتی رہتی اور مجھ
دلیلوں سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی، میں بھی کچھ کچھ قائل ہو جاتا لیکن
مجھے سنان اعظم کا قول یاد آ جاتا کہ، جو بھی اپنے قبیلے سے جدا ہو گا، اس کی مد
پتھر جیسی ہو گی جو گہرے پانی میں ڈوب گیا ہو، یا پھر اسی تیر جیسی جو لمبی لمبی
نہیں گم ہو جائے!

تاشی ہمیشہ ماریہ کی مخالفت کرتی، اسے اپنے صحرا اور اس کے رسم و
گہری دلچسپی تھی، ایران میں ہر طرف اونچی اونچی عمارتیں اور چوڑی چوڑی سڑ
ماریہ بے قابو ہونے لگتی، وہ چیل میں بیٹھ کر معلوم نہیں کیسی کیسی دعائیں
جس سے تاشی نے ماریہ پر یہ الزام لگا دیا کہ ماریہ بھی ساحرہ ہے اور معلوم نہیں

نے میں مشغول رہتی ہے۔ ہلاکو خان اور دوقوز خاتون چونکہ عیسائی تھے اس لئے
کی طرفداری کرتے رہتے۔ میں ابھی تک نصرانیت سے عاری تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ
مذہب کو اختیار کرکے دوسرے راہب کے خراجوں کو ناراض کرلوں۔

ہم اپنی راہ کی مزاحمتوں اور آبادیوں کو تہہ و بالا کرتے ہوئے اصفہان تک پہنچ
س کے مغرب میں، لبنان تک شیخ الجبال کے گھونسلے نما قلعے بکھرے ہوئے تھے،
ان نے شیخ الجبال کو حکم بھیجا کہ "خود کو ہمارے حوالے کردو، ورنہ اگر تم نے جنگ کی ٹھانی
کا انجام جو کچھ ہوگا نہ تمہیں معلوم ہے نہ ہم جانتے ہیں!"

یہاں ہم نے جنگ سے پہلے خوب عیش کئے، یہیں ہم پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ
مسلمانوں سے بار بار شکستیں اٹھانے کے بعد اب ہمارے زیر سایہ آنے کے لئے بے
تھے، روزانہ سو پچاس عیسائی آتے، اور مخبری اور جاسوسی کے لئے اپنی خدمات پیش
تے لیکن ہلاکو خان کی تمنائیں بہت زیادہ تھیں، اس نے ماریہ کے لئے ایک بوڑھا
ی فراہم کردیا اور ہمیں بتایا کہ "یہ ماریہ اور اس کے بچے کو ذہنی اور اخلاقی تربیت
ے گا!"

اب ماریہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

شیخ الجبال سے کوئی مقابلہ نہ ہوا، یہ نصیر الدین طوسی اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ
ے کی غرض سے حاضر ہوا۔ ہلاکو خان نے اسے قید کردیا اور نصیر الدین طوسی سے خوش اخلاقی
پیش آیا اسے معلوم ہوا تھا کہ طوسی آسمانوں کے علوم جانتا ہے اور آنے والے حالات اور
نعات کا علم اسے پہلے ہی ہو جاتا ہے، ہلاکو خان کو یہ عجیب و غریب انسان اچھا لگا اور
نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا اس کے بعد ہم لوگ شیخ الجبال کے گھونسلوں میں گھس
ے۔ انہی میں وہ مشہور قلعہ بھی تھا جو الموت کہلاتا تھا۔ الموت دراصل آلہ الموت تھا۔
کیونکہ وہاں کی مقامی زبان میں آلہ نشیمن کو اور الموت عقاب کو کہتے تھے جس کا مطلب تھا
قاب کا نشیمن، ہلاکو خان ان عجیب و غریب قلعوں میں گھومتا پھرا اسے یہ معلوم تھا کہ شیخ
الجبال کے ذرائع بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور یہ کہیں اور کسی وقت بھی اپنے دشمن کا کام تمام
کرسکتے ہیں احتیاط کے طور پر وہ اپنے گرد و پیش منگولوں کا حفاظتی دستہ رکھتا۔ یہاں کے
خزانوں کو اپنے قبضے میں کرلینے کے بعد اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ یہاں کی پوری آبادیوں
کو تہ تیغ کردیا جائے کیونکہ اسے خاقان اعظم نے بھی یہی حکم دیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل پوری

سفاکی سے ہوئی جب قتل ہونے والوں کی چیخ و پکار سے پہاڑی چٹانیں گونجیں اور بازگشت نے شور و غل میں تواتر اور تسلسل پیدا کر دیا تو ہلاکو خان پر خوشی کا دورہ دیر تک قہقہے لگاتا رہا۔ ہم نے ماؤں سے ان کے بچے چھین لئے اور انہیں تھی منی سے پکڑ کر چٹانوں پر دے مارا۔ ہم نے پنگوڑوں سے چیختے چلاتے بچے نیزوں میں چھید اٹھا لئے، ہمارے ساتھی عیش کرتے پھر رہے تھے کیونکہ یہاں کی حسین و جمیل عورتیں نوخیز لڑکیاں ہمارے اختیار اور تصرف میں تھیں، گھوڑی کے دودھ اور شراب کی فراوانی میں گیارہ عورتوں اور لڑکیوں کو ریوڑ کی طرح اپنے یورت میں ہنکا لایا اور مارا اور تا موجودگی میں انہیں کچلتا روندتا رہا۔ وہ دونوں ایک فاتح قوم کے خاتمہ کو اس سے کس طرح محروم کر سکتی تھیں۔ انہوں نے چہروں پر مسکراہٹ پیدا کر کے مجھے باد چیش کی۔

یہیں ہلاکو خان کے روبرو چند ایسے نرحمان بھی پیش کئے گئے جن پر مقا کا الزام لگایا گیا تھا اور جو بڑے پیمانے پر جنگ کرنے کے لئے اپنے آس پاس آدمیو جمعیت اکٹھا کر رہے تھے، ہلاکو خان نے ان کے لئے ایک گہرا گڑھا کھدوایا اس کے نوجوانوں کے ہاتھ پیر باندھ کر گڑھے میں دھکیل دیا گیا اور ان گڑھوں کو دوبارہ بن گیا۔ بس ایک طرف ذرا سا سوراخ البتہ رکھا گیا جس سے ان نوجوانوں کی چیخیں گھٹ کر نکل رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے کہیں بہت دور کچھ لوگ چیخ چلا رہے ہوں ہلاکو ہنستا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا اس کی بیوی دوقوز خاتون بھی بہت خوش تھی۔ ایسے تماشے کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں!!!

ہلاکو خان نے ہمدان میں قیام کیا اور شیخ الجبال کو قراقرم بھیج دیا نصیر طوسی ایک زبان آدمی اور عقل مندی سے ہلاکو خان کا وزیر اور مشیر بن گیا۔ اس نے ہلا کو بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور یہ یقین دلایا کہ یہ صرف اس کی خواہش نہیں، وزیر اعظم حلقمی اور بغداد کی رعایا بھی یہی چاہتی ہے، ہلاکو خان نے مجھے پہلی بار فرستا آیا اس نے جواب دیا "میں مہم پر کوئی بڑا خطرہ نہیں مول لینا چاہتا کیا عباسی خ اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ وہ ہمارے آگے سرنگوں ہو جائے؟"

نصیر الدین طوسی نے تو سب دیا۔ "مجھے آسمانوں کے فیصلے کا علم ہے وہاں خلافت عباسی کے زوال اور اختتام کا فیصلہ صادر ہو چکا ہے اور خوش بختی اور اقبال ستاروں کی چالیں تمہارے حق میں ہیں!"

ہلاکو خان نے پوچھا۔ "کیا تیرے خلیفہ کے وزیر ابن علقمی سے تعلقات ہیں؟"

طوسی نے جواب دیا۔ "ہاں، میں اس سے خط و کتابت کر رہا ہوں!"

ہلاکو خان نے کہا۔ "تو ابن علقمی کو لکھ دے کہ وہ خلافت کی افواج کم کر دے اور ہتھیار موجود ہے، اس کا بیشتر حصہ ادھر ادھر سرحدوں پر روانہ کر دیا جائے۔ اس کا روانگی کے بعد میں بغداد پر حملہ کروں گا!"

طوسی نے اسی دن ابن علقمی کے نام ہلاکو خان کی طرف سے ایک خط لکھ دیا اور جب یہ خط ہلاکو خان کو پڑھ کر سنایا جا رہا تھا میں مشیروں میں موجود تھا۔ میں نے ابن علقمی کو لکھا تھا۔

"کتابوں کے رسیا اور مال دولت کے دلدادہ اور حریص خلیفہ کو فوج کی کمی پر آمادہ کر لو اس کو سمجھاؤ کہ فوجوں پر بڑی دولت خرچ ہو رہی ہے، جس کا کوئی فائدہ نہیں، خلافت کا رعب اور دبدبہ ہی اتنا زیادہ ہے کہ دشمن ادھر آنکھ اٹھانے کی ہمت تک نہیں کر سکتا۔"

فوج کی تنخواہیں اب تک خزانے سے دی جا رہی تھیں، اب یہ نیا طریقہ جاری ہو گا کہ سپاہی اپنی تنخواہیں باغات میں چل پھر کر محاصل سے حاصل کیا کریں، اس طرح فوج بد نظمی کا شکار ہو جائے گا اور رفتہ رفتہ خلیفہ کے خلاف ہو جائے گی جس سے ہمیں فائدہ پہنچے گا۔

دیکھو یہ ایک بہترین موقع ہے جس سے خلافت عباسی کا خاتمہ اور خلافت علویہ کا قیام عمل میں آ سکتا ہے، اور ہم مصر میں خلافت فاطمیہ کے عباسیوں کے ہاتھوں خاتمے کا انتقام لے سکتے ہیں، یہی تو وہ لوگ ہیں، جن کے آباؤ اجداد نے مصر کی خلافت فاطمیہ کو ختم کر کے عباسی خلافت میں ضم کر لیا تھا۔

اس خط و کتابت سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ بغداد پر حملہ کرنے میں ابھی دیر ہے، میں نے سوچا کہ چلو کچھ دن عیش ہی کر لیا جائے۔ شیخ اجمال کی رہائی میں کمی کیا ہے، عورتیں اور لڑکیاں میرے تربیت میں موجود ہی تھیں، میں کچھ دنوں کے لئے بدرت ہی میں بند ہو گیا اور خون خرابے اور قتل و غارت گری سے طبیعت میں جو کسیلا اور بے کیفی سی پیدا ہو گئی تھی، اس کے اثرات کم کرنے لگا۔ تاشی تو خیر منگول تھی لیکن مجھے پہلی بار ماریہ کے کردار کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ شہری ہونے کے باوجود نہایت صبر و شکر اور خندہ پیشانی سے رنگ رلیوں اور عیش کوشیوں میں شریک و معاون رہی، میں نے ماریہ

کا شکریہ ادا کیا کیونکہ میرے دل پر اس کے ایثار اور خاموشی کا بڑا اثر تھا۔ جواب میں ماریہ نے عجیب سی بات کہی، اس نے کہا۔ "میں نے سرکش نفس کو قابو میں کر لیا ہے تم لوگ روحانی بیماری میں مبتلا ہو، اصل خوشی یہ نہیں ہے کہ تم مال و دولت جمع کر کے رنگ رلیاں مناتے لگو بلکہ سچی خوشی اس میں ہے کہ نفس کا سرکش گھوڑا قابو میں کر لیا جائے اور دوسروں کی خوشیوں کو اپنی مرضی کے خلاف گوارا کر لیا جائے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تجھے اپنا ناصری عاشق بھی کبھی یاد آتا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "کبھی بھی نہیں، ناصری نے مجھے تیرے حوالے کر دیا ہے اب میں زندگی بھر تیری وفادار رہوں گی۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "ماریہ! تو سچ مچ اس لائق ہے کہ تیری بات غور سے سنی جائے اور تیرے مشوروں پر عمل کیا جائے۔"

اس نے کہا۔ "خان! تیری طرح میں بھی دل رکھتی ہوں کیا تو میری معمولی خواہش پوری کر سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "بے شک! بول کیا چاہتی ہے؟"

ماریہ نے کہا۔ "میں کھیتوں کی سیر کرنا چاہتی ہوں، باغات میں گھومنا پھرنا چاہتی ہوں، اونچی اونچی شاندار عمارتوں کو اندر سے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "یہ کون سا مشکل کام ہے، آج اس شہر کی ہر چیز تیرے قبضے میں ہے۔"

تاشی نے مخالفت کی، جھنجھلا کر کہنے لگی۔ "خان! ہوشیار، چالاک ماریہ تجھے فتح کرتی جا رہی ہے۔"

میں نے تاشی کو ڈانٹ دیا لیکن اس وقت مجھے یہ کہاں معلوم تھا کہ صحرا کے رہنے والوں کو کھیتوں، پکے مکانوں اور باغات کی آب و ہوا راس نہیں آتی۔

میں ماریہ کو لئے ہوئے کھیتوں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ماریہ نے لہلہاتی فصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "خان! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس اناج کی تمہیں کس ضرورت رہتی ہے؟"

"معلوم ہے، بہت زیادہ، لیکن ہم اناج کی جگہ جانور بھی تو کھا سکتے ہیں؟"

ماریہ نے کہا۔ "تم یہ بھی تو نہیں جانتے کہ اناج کے ایک دانے سے ہزار دانے پیدا کئے جا سکتے ہیں، لیکن ایک جانور سے ہزار جانور نہیں پیدا کئے جا سکتے، اور پھر [illegible]

حقیقت کو کس طرح جھٹلا سکتے ہو کہ انسان ہمیشہ جانور ہی پر زندہ نہیں رہ سکتا!"

میں نے بے بسی سے پوچھا۔ "آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

اس نے جواب دیا "وہ لوگ جو انسان کے لئے غلہ پیدا کرتے ہیں ہم سب کے لئے لائق احترام ہیں، ہمیں ان کا شکر گزار اور احسان مند ہونا چاہیئے، تم ہلاکو خان سے کہو انہیں قتل کر کے وہ محسن کشی سے باز رہے!"

میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور درشت لہجے میں کہا۔ "بے وقوف عورت! تو انہیں پرورش کہہ رہی ہے کیا تجھے معلوم ہے اگر میری باتیں ہلاکو خان سن لے تو وہ تجھے اس کی کیا سزا دے گا؟"

ماریہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "میں سزا سے نہیں ڈرتی، سچ بات کہنے ہی کے لئے ہوتی ہے، پھر میں چپ کیوں رہوں!"

میں نے اسے دھکیل دیا اور کہا۔ "لیکن خبردار جو تو نے یہ باتیں تاشی یا کسی اور منگول کے سامنے دہرائیں؟"

اس کے بعد میں اسے لے کر ایک ایسی عمارت میں داخل ہوا جہاں سے کچھ عجیب و غریب بو اٹھ رہی تھی، ایک لمبی داڑھی والا مسلمان ہمارے قریب آیا اور اس نے رہشت زدہ آواز میں پوچھا۔ "معزز خان یا خاتون کو کیا مرض لاحق ہو گیا ہے، کیا وہ یہاں علاج کی غرض سے آئے ہیں؟"

میں نے اس بوڑھے کی داڑھی مٹھی میں دبالی اور ہلکے ہلکے جھٹکے دے کر دریافت کیا۔ "یہاں کیا ہوتا ہے اور تم کون ہو یہاں کیا کرتے ہو؟"

بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ "جناب میری داڑھی تو چھوڑ دیں۔ یہ رسول اللہؐ کی سنت ہے، اس کی بے عزتی تو نہ کریں۔"

میں داڑھی، رسول اللہؐ کی سنت اور بے عزتی وغیرہ کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکا اور داڑھی سے برستور کھیلتا رہا۔ آخر جب بوڑھے نے یہ یقین کر لیا کہ اس کی داڑھی یوں نہیں چھٹے گی تو اس نے جواب دیا۔

"جناب میں ایک طبیب ہوں اور یہ جگہ شفاخانہ ہے یہاں مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے، جڑی بوٹیوں کے تجربے کئے جاتے ہیں!"

میں نے کہا۔ "بوڑھے! کیا تیرے پاس ہر مرض کا علاج موجود ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "موت کے سوا ہر مرض کی دوا موجود ہے اور موت کسی بھی مرض

کی شکل میں آ سکتی ہے!"

میں نے اس کی داڑھی چھوڑ دی اور اسے حکم دیا کہ وہ ہمیں پورا شفاخانہ گھما پھرا کر اچھی طرح دکھاتے!

یہ عمارت تقریباً پچیس چھبیس کمروں پر مشتمل تھی، اس کے بیشتر کمروں میں جڑی بوٹیوں اور دواؤں کا ذخیرہ تھا۔ جن کی ملی جلی بو اور خوشبو سے کمرے مہک رہے تھے، اس نے کئی ایسی دوائیں بھی دکھائیں جو تلوار یا تیر کے گھاؤ کے لئے تیز ہدف تھیں، ہمیں میں نے وہ آلے بھی دیکھے جن کے ذریعے دواؤں کا عرق کشید کیا جاتا تھا۔ مجھے انسان کی عقل مندی اور خوش تدبیری پر بڑا تعجب ہوا۔ ماریہ یہاں کی ایک ایک چیز نہایت غور سے دیکھ رہی تھی، بوڑھے نے ہماری ضیافت کرنا چاہی، جسے میں نے درستی سے مسترد کر دیا۔

ماریہ نے مجھ سے سوال کیا۔ "خان! بحیثیت مجموعی دنیا کو جتنے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ان میں دو نہایت خاص اور ممتاز ہیں، ایک وہ خانہ جس میں جنگجو رہتے ہیں، دوسرا وہ جس میں معالجین رہتے ہیں!"

میں نہیں سمجھ سکا کہ ماریہ کہنا کیا چاہتی ہے، میں اس غیر معمولی عاقلہ کی صورت دیکھنے لگا۔

اس نے سوال کیا۔ "وہ لوگ جو انسان کو قتل کر دیتے ہیں، اور موت کے فرشتے جن کے ہمرکاب رہتے ہیں، بہتر ہیں یا وہ لوگ جو مرنے والوں کو زندگیاں بخشتے ہیں اور انسانی مصائب اور دکھوں کا علاج کرتے ہیں، انسان کو دوبارہ زندگی بخشتے ہیں؟"

میں نے نادانی سے جواب دیا۔ "یہ تو کھلی بات ہے کہ زندگیاں چھیننے والوں سے بخشنے والے عظیم ہوتے ہیں!"

"یہی میں بھی کہتی ہوں!" ماریہ جلدی سے بولی۔ "یہ لوگ جو دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے ہمارا علاج کرتے ہیں تمہارے محسن ہیں! انہیں قتل کو کے تم محسن کشی کر رہے ہو؟"

میں نے ایک بار پھر اس کے بال پکڑ لئے اور ہلکا سا جھٹکا دے کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کو لیا اور پیار سے کہا۔ "شریر عورت! آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

ماریہ نے جواب دیا۔ "صرف یہ کہ میری اولاد میں قراقرم میں نہیں رہیں گی، شہروں میں رہیں گی، پڑھیں گی لکھیں گی اور انسانیت کی خدمتیں کریں گی!"

"لیکن میں خود قراقرم جاؤں گا!" میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے۔ "میں صحرا کے

ی شہروں میں کس طرح رہ سکتا ہوں"۔
ماریہ آبدیدہ ہو گئی، اداس آواز میں کہنے لگی۔ "لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی کیا
م میری خوشی کی خاطر قراقرم نہیں چھوڑ سکتے، میری خاطر، اپنی اولاد کی خاطر"۔
میں نے جواب دیا۔ "تو مجھے درغلا رہی ہے لیکن پھر بھی اگر میں تیری اور تیری
لاد کی خاطر شہر میں رہ پڑوں تو کیا تو کبھی بھی میرے ساتھ قراقرم آتی جاتی رہے گی"!
ماریہ نے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے لیکن میں شیطان زادی تاشی سے ڈرتی ہوں
و تمہیں ورغلا کر قراقرم واپس لے جائے گی"!
میں نے کہا۔ "یہ اگر فضول ہے آغاتی خان کے دل پر کسی کی بھی حکومت نہیں
ہ اپنے دل کا مالک ہے جو چاہے کرے۔ چاہے تو صحرا میں رہے اور چاہے تو شہر
میں رہے"!
اور اس کے بعد ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بغداد کی تسخیر کے بعد اپنے حصے
کا خزانہ اور مال و دولت لے کر ہم دونوں کسی دور دراز علاقے میں چلے جائیں گے، اور
باقاعدہ شہری زندگی اختیار کر لیں گے۔ معلوم نہیں کیوں یہ شہری لوگ مجھے واقعی محسن نظر آنے
لگے تھے۔ لیکن صحرائی سرشت مجھ میں تذبذب اور ہچکچاہٹ پیدا کر رہی تھی۔

ابن علقمی، وزیر خلافت عباسی اور طوسی کے درمیان، عرصے تک خط و کتابت
جاری رہی اور آخر کار ابن علقمی خلافت کی فوج میں تخفیف اور طوسی کی تجاویز پر عمل درآمد
کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ہلاکو خان بغداد پر حملہ آور ہونے کے لئے پوری طرح تیار
تھا۔ اس نے احتیاطاً موصل کے حکمران بدرالدین سے منجنیقیں اور ہتھیار طلب کئے۔ بدرالدین
کو جو سفارت بھیجی گئی تھی اس کا سردار میں تھا۔ میں سات آدمیوں کے ساتھ والیٔ موصل
بدرالدین کے دربار میں پہنچ گیا اور ہلاکو خان کا رقعہ اس کے حوالے کر دیا۔
میں نے زبانی عرض کیا۔ "موصل کے حکمران! ہم غیر معمولی لوگ ہیں، جاودانی
نیلے آسمان کی قوتیں ہمارے ساتھ ہیں، ہم تیرے ظالم اور غیر منصف خلیفہ مستعصم باللہ پر
قہر خداوندی بن کر نازل ہونے والے ہیں کیا مصلحت اندیشی اور پیش بندی کا یہ تقاضہ
نہیں ہے کہ تو منجنیقوں اور ہتھیاروں سے ہماری مدد کر، تیری خدمت کا صلہ ہم یوں دیں
گے کہ ہم تجھ سے کوئی تعرض نہ کریں گے اور تو موصل پر بدستور حکمرانی کرتا رہے گا"!
ابھی ہماری گفتگو کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی کہ لمبی لمبی عبا اور چغے والے دربار میں

داخل ہوتے، یہ محض اتفاق تھا کہ بغداد کے خلیفہ اور ہلاکو خان کے نمائندے اپنی اپنی ضرورتیں لے کر والی موصل کے دربار میں ایک وقت میں داخل ہوتے۔

والی موصل پریشان ہو گیا کہ وہ ہم دونوں کو کس طرح راضی رکھے۔ پھر بھی اس نے احتیاطاً خلیفہ کے وفد سے دریافت کیا۔ "آپ لوگ ہم سے کس قسم کی مدد کے طالب ہیں؟"

خلیفہ کے وفد کے سربراہ نے جواب دیا۔ "ہم آپ سے مدد نہیں چاہتے بلکہ امیر المومنین نے ہمیں آپ کے پاس بہترین مغنیاؤں، سازندوں اور رقاصاؤں کے لئے بھیجا ہے، امیر المومنین مطلعے کی کثرت سے غیر معمولی تکان محسوس کرتے ہیں"۔

بدر الدین نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے اور کہا۔ "اسلام اور مسلمانوں کا خدا حافظ!"

اس کے بعد بدر الدین نے خلیفہ کے لئے گانے والیوں، سازندوں اور رقاصاؤں کے طاقتے کا انتظام کیا اور ہمارے لئے منجنیقوں، اسلحہ جات اور دوسرے قلعہ شکن آلات کا انتظام کر دیا۔

ہلاکو خان نے کچھ عرصے بعد عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو چند سطری پیغام بھیجا دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ دنیا کی مختلف قوموں اور حکومتوں کا چنگیز خان کی مغل فوجوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوا، بغداد کے دروازے خوارزمیوں اور سلجوقیوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ تم ہمارا استقبال نہیں کرتے اور ہم پر بغداد کے دروازے بند کر دیے ہیں لیکن ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم بغداد میں داخل ہو کر رہیں گے کیونکہ ہم طاقتور ہیں، دیکھو تم پر جو چنگیزی کے مقابلے پر آنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا ورنہ تمہاری خیر نہیں، اپنی سپاہ کے ہتھیار ہمارے حوالے کر کے ہم سے معافی اور رحم کے خواستگار بنو!"

حالات سے ناواقف اور غافل خلیفہ نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا۔ "اگر مغل اپنے گھوڑوں کی نعلیں نکلوا دیں تو ہم بھی بغداد کے دروازے ان کے لئے کھول دیں گے اور ان کا شایان شان استقبال کریں گے!"

ہلاکو خان غصے میں کھڑا ہو گیا اور جوابِ غد خلیفہ کا یہ جواب لے کر آیا تھا

سے حقارت سے مخاطب کیا۔ کہا۔ "تم اپنے احمق خلیفہ سے کہہ دو کہ اب تمہاری خیر نہیں
ر فالتو نعلین تمہارے سروں میں ٹھونک دی جائیں گی!"

اس کے بعد بغداد کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ہماری ایک لاکھ سے زائد فوج کے مقابلے
ں خلافت کی بیس ہزار فوج صف آرا ہو گئی۔ اس دوران خلیفہ کا غدار وزیر ابن علقمی
ی بار ہلاکو خان سے ملنے آیا۔ چونکہ نصیر الدین طوسی اس کا ہم عقیدہ اور ہم مذہب تھا
س لئے وہ ہلاکو خان سے اپنے لئے امان نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دونوں
لافت عباسی کو ختم کر کے خلافت علویہ قائم کرنا چاہتے تھے۔

محاصرہ اور پھر پچیس پچاس دن تک جاری رہیں، اور جب ہماری افواج نے
لافت کی بیس ہزار فوج کو شکست دے کر منتشر کر دیا تو ایک دن ابن علقمی پھر
ملنے آیا۔ ہلاکو خان نے پوچھا۔ "کیا خلیفہ اب بھی جنگ جاری رکھنا چاہتا ہے؟"

ابن علقمی نے جواب دیا۔ "اس کے مشیر اسے گمراہ کر رہے ہیں!"

طوسی نے مشورہ دیا۔ "تم خلیفہ سے کہو کہ میں نے تمہارے لئے مغل فاتح سلطان
نامہ حاصل کر لیا ہے اور اگر تم مزید جنگ کئے بغیر مغل فاتح کے دربار میں پہنچ جاؤ تو وہ
تمہیں بدستور حکومت کرنے کی اجازت عطا کر دے گا!"

سادہ لوح خلیفہ اس باتوں میں آ گیا اور اپنے بیٹے کے ہاتھ ہلاکو خان کے
دربار میں حاضر ہو گیا۔

ہلاکو خان نے سرد مہری سے پذیرائی کی اور خلیفہ کو حکم دیا۔ "تم اپنے ارکان
سلطنت اور علمائے فقہا کو بھی یہیں بلا لو تاکہ سارے معاملات میں تمہیں ان کا تعاون
اور مشورہ حاصل رہے!"

خلیفہ نے ایک خط کے ذریعے ان سب کو طلب کر لیا۔ جب وہ آ گئے تو
انہیں حیوانوں کی طرح ذبح کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہلاکو خان نے خلیفہ سے کہا کہ۔
"تم اہل شہر کو یہ پیغام بھیج دو کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور اپنے شہر کے باہر آ جائیں۔"

خلیفہ نے اس حکم کی بھی تعمیل کر دی اور اپنے شہریوں کا جم غفیر بغداد سے
ابل پڑا، ہماری فوج نے انہیں محاصرے میں لے لیا اور قتل و خوں ریزی کا بازار گرم ہو
گیا۔ پھر جمعہ کے دن، جو مسلمانوں کا مقدس دن ہے ہلاکو خان، خلیفہ کو لے کر بغداد میں
داخل ہو گیا اور قصر خلافت میں قیام کیا، اس ہنگامہ دار و گیر میں ہلاکو خان کے سوا ساری
شخصیتیں دب گئی تھیں۔ ہلاکو خان نے دربار منعقد کیا۔ جس میں نصیر الدین طوسی، ابن

علقمی، خلیفہ اس کا لڑکا اور ہم سب شریک ہوتے، دو تو زقاتوں اور ماریہ نے خلافت کو سرنگوں اور شرمسار دیکھ کر بے پایاں خوشی کا اظہار کیا۔ پادری اسے اپنا نجات دہندہ قرار دینے لگے۔

ہلاکو خان نے خلیفہ کے ظلم و جور کی تفصیل بتاتے ہوئے دربار یوں سے پوچھا۔ "بتاؤ کہ ایک غیر عادل مسلمان حکمران کے مقابلے میں عادل غیر مسلم حکمران کیا درجہ رکھتا ہے؟" اس نے طوسی اور ابن علقمی سے بطور خاص کہا۔ "تم دربار میں موجود مسلمان علماء سے فتویٰ لاؤ اور مجھے اس فیصلے سے مطلع کرو!"

دربار میں موجود علماء نے تامل اختیار کیا لیکن نصیر الدین طوسی آگے بڑھا اور با آواز بلند کہا۔ "میں بھی ایک مسلمان عالم ہوں، اور مجھے معلوم ہے کہ غیر مسلم، عادل حکمران، غیر عادل مسلمان حکمران سے افضل ہے!"

اسی وقت ایک محضر نامہ تیار ہوا۔ جس میں دربار کے موجود علماء نے طوسی کے فتوے کی تائید میں اپنے اپنے دستخط کر دیے، خلیفہ خاموشی اور بے بسی سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔

ہلاکو خان نے خلیفہ سے کہا۔ "ہم تمہارے مہمان ہیں، ہمارے لئے کچھ حاضر کرو!"

خلیفہ پر اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ محل کی کنجیاں تلاش کرنے لگا لیکن وہ نہیں ملیں، مجبوراً تالے توڑ دیے گئے اور خلیفہ نے دو ہزار نفیس پوشاکیں، ہزاروں دینار اور سونے کے زیورات ہلاکو خان کی خدمت میں پیش کئے۔

ہلاکو خان نے تحقیر آمیز انداز میں ان چیزوں پر نظر ڈالی اور کہا۔ "یہ چیزیں اگر تم نہ دو تب بھی ہماری ہی ہیں، میں تو ان خزانوں کا پتہ پوچھ رہا ہوں جنہیں تم نے چھپ رکھا ہے۔"

ہلاکو خان نے خلیفہ کی پیش کردہ چیزیں میری طرف بڑھا دیں، کہا۔ "انہیں تقسیم کر لو!"

خلیفہ نے چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ بتا دیا جو زمین میں دفن تھے۔ انہیں اسی وقت کھود کر نکال لیا گیا۔

خلیفہ کو محل میں قید کر دیا گیا اور کئی دن تک پہرہ بٹھا رکھا گیا۔

میں دینار، پوشاکیں اور زیورات لے کر جب ماریہ کے پاس پہنچا تو وہ بہت

ہوئی، اس نے کہا۔ "ابھی تو اور بھی بہت کچھ ملے گا!" پھر پاگلوں کی طرح چیخی۔ "اس
تمہارا اور ہم دونوں کے بچوں کا شاندار مستقبل تعمیر ہوگا۔"
تاشی، ماریہ کا مفہوم نہ سمجھ سکی، کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں ہم دونوں کی
ن دیکھتی رہی۔

ہلاکو خان، خلیفہ کی سزا کے سلسلے میں بہت متامل تھا، اسے بعض مسلمانوں نے
رکھا تھا کہ خلیفہ مسلمانوں کی مقدس ہستی ہے اگر اس کا خون بہا تو قیامت برپا
ے گی۔ لیکن نصیر الدین طوسی اور ابن علقمی نے اس وہم کی تردید کر دی طوسی نے
خان کو یقین دلایا کہ "یہ خیال غلط ہے کیونکہ خلیفہ علیؓ سے بڑا آدمی نہیں ہے میں
ے خون نے قیامت برپا نہیں کی تو خلیفہ کی کیا حیثیت ہے؟"

ہلاکو خان نے پوچھا۔ "پھر ہمیں خلیفہ کو کس طرح ہلاک کرنا چاہیئے؟"

طوسی نے جواب دیا۔ "اسے تمدے میں لپیٹ کر محل کے ستون سے باندھ
جائے اور سپاہی لاتیں مار مار کر اسے ہلاک کر دیں، اس طرح خلیفہ کا خون بھی نہ
گا اور یہ اپنے انجام کو بھی پہنچ جائے گا!"

ہلاکو خان نے نحیف و نزار اور بھوک سے بے حال خلیفہ کو اپنے روبرو
ب کیا، خلیفہ نے نحیف آواز میں کہا۔ "میں بھوکا ہوں۔ کھانا، کھانا!"

ہلاکو خان نے چند آدمیوں کو مخصوص لب و لہجے میں حکم دیا۔ "خلیفہ کی
میدہ غذا فراہم کی جائے!"

ذرا سی دیر میں کئی سرپوش خوان خلیفہ کے سامنے رکھ دیئے گئے خلیفہ نے
پیٹ کر خوان پوش اٹھا کر ایک طرف پھینکے اور طشت میں ہاتھ ڈال دیا لیکن وہاں
انے کی جگہ ہیرے جواہرات رکھے ہوئے تھے۔

ہلاکو خان نے ظالمانہ انداز میں حکم دیا۔ "انہیں کھاؤ!"

خلیفہ نے بے بسی سے کہا۔ "انہیں میں کس طرح کھا سکتا ہوں!"

ہلاکو خان نے طنزاً کہا۔ "بے وقوف حکمران! جس شے کو تو کھا نہیں سکتا اس
ا ذخیرہ کیوں کیا۔ کیا تو اس سے ایک شاندار فوج نہیں تیار کر سکتا تھا جو تیری، بغداد کی
ور تمام مسلمانوں کی حفاظت کا کام انجام دیتی۔"

خلیفہ کے ہوش و حواس بجا نہ تھے، جواب دیا۔ "خدا کی مرضی ہی یہ تھی کہ
میں اس مال کو پہنچوں!"

ہلاکو خان نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "خدا کی مرضی کا بقیہ حصہ بھی ہم پہنچایا جائے"

مستعصم باللہ کو نمدے میں لپیٹ دیا گیا۔ بے بس اور بھوکے پیاسے خلیفہ معمولی سی مزاحمت کی، لیکن طاقتور آدمیوں نے اسے بے بس کر دیا وہ چیخ چلایا لیکن نمدے میں لپیٹ دیا گیا اور خلیفہ کا پورا جسم اس میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد ابن علقمی آگے بڑھا اور اپنی نگرانی میں اس نمدے کو ستون سے بندھوا دیا۔ نصیر الدین طوسی نے ابن علقمی سے کہا۔ "بسم اللہ، بڑھو اور لاتوں کی ضربات سے اس کا کام تمام کر دو"

ابن علقمی ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اچھل اچھل کر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔ خلیفہ کا بیٹا یہ عبرت ناک منظر کچھ دیر تو دیکھتا رہا پھر آنکھیں بند کر کے فرش پر بیٹھ گیا جب ابن علقمی تھک گیا تو چند سپاہیوں کو حکم ملا کہ وہ اپنی طاقتور ضربات سے خلیفہ کا کام تمام کر دیں، کئی کئی سپاہی باری باری آگے بڑھتے اور نمدے کو لاتوں کی ضربات پہ کر واپس آجاتے۔ جب ہلاکو خان کو یہ یقین ہو گیا کہ خلیفہ مر چکا ہو گا تو اس نے نمدے سے خلیفہ کی لاش باہر نکلوائی، اس وقت خلیفہ سسک رہا تھا۔

ہلاکو خان کے حکم پر ہمارے طاقتور اور فربہ اندام سپاہی آگے بڑھے اور سسکتے ہوئے خلیفہ کو پیروں سے روند ڈالا، خلیفہ کی شکل مسخ ہو گئی۔ اور دونوں رخسار دانتوں سے گزر کر آپس میں پیوست ہو گئے، دانت ٹوٹ کو الگ ہو گئے اور پسلیاں کئی کئی جگہ سے ٹوٹ کر گوشت میں اتر گئیں۔

بغداد کے گلی کوچوں میں قتل عام جاری تھا۔ میں سرا بقہ گیارہ عورتوں اور لڑکیوں کو خوب اچھی طرح تاڑ چکا تھا اس لئے اب ان کا رکھنا فضول تھا میں نے انہیں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا اور بغداد کی افراتفری سے دس نوخیز اور حسین لڑکیاں بچا بچا کر لایا۔ میں نے بغداد کی لوٹ مار میں کافی دولت کمائی۔ قتل ہونے والوں کی لاشیں دجلہ میں پھینک دی گئیں، جس سے دریا کا پانی سرخ ہو گیا۔ اس کے بعد ہلاکو خان خلافت کے کتب خانے کو بھی دریا برد کر دیا یہ اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ اس سے دریا کا رنگ بن گیا" اور کتابوں کی سیاہی سے دجلہ کا پانی کالا ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں بغداد کی غارت میں آٹھ لاکھ مسلمان قتل ہوئے تھے!

ماریہ عیسائی ہونے کے باوجود اس خون خرابے سے بہت بددل ہوئی، اس نے مجھے اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ میں کسی دور دراز علاقے میں نکل چلوں جہاں ام

شتی کی زندگی گزاری جاتے اور اولاد کو باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جاتے ہیں تھوڑا
ت تو پڑھ لکھ چکا تھا۔ ماریہ مزید پڑھانا چاہتی تھی، میرا دل ماریہ کی بات مانتے ہیں
زبذب تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے حصے کی دولت قبضے میں کی اور ماریہ کے بے
ر اصرار پر اس کے ساتھ بیت المقدس چلا گیا۔ وہاں میں ناصرہ کے بیت اللحم پہنچا، جہاں
سع پیدا ہوتے تھے اور مسیح کی ماں مریم اور مریم کے منگیتر یوسف نجار ان کی پرورش اور
گہداشت کرتے رہے تھے۔ پھر ہم لوگ گلگتا پہنچے جہاں مسیح کو تیس سال کی عمر میں مصلوب
یا گیا تھا۔ یہاں ماریہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

یہاں میں نے ماریہ کو ایک گرجے میں چھوڑ دیا اور بہت ساری دولت اس
کے حوالے کر دی۔ میں نے اس کا بچہ بھی اس کے پاس رہنے دیا۔ ایک دوسرا بچہ بھی
آنے والا تھا۔ میں نے ماریہ سے کہا۔ "اگر لڑکا ہوگا تو اسے سپاہی بنانا کیونکہ پہلے لڑکے
کی تعلیم و تربیت تیری مرضی کے مطابق ہوگی اور دوسرے کی میری مرضی کے مطابق۔ لیکن اگر
لڑکی ہو تو اس کی تو مالک ہوگی!"

ماریہ روتے لگی، بولی۔ "میں تو یہ سمجھتی تھی کہ تم ہمیشہ کے لئے میرے پاس رہو
گے لیکن تم پھر اسی صحرا میں واپس جا رہے ہو، جہاں انسان جانوروں کی طرح رہتے
ہیں!"

میں نے جبر سے کام لیا ورنہ عام حالات میں، میں اس کی ناک پر مکا رسید کر
دیتا۔ میں نے کہا۔ "ماریہ! اس وقت تو گرجے میں ہے اگر باہر ہوتی تو میں ایسی سزا دیتا کہ
تو زندگی بھر یاد رکھتی۔"

ماریہ نے کہا۔ "آغا علی خان! تم یہیں میرے پاس رک جاؤ اور اتنے ظالم
نہ بنو!"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "میں صحرا نہیں چھوڑ سکتا۔ تو یہیں رہ، میں پھر آؤں
گا۔ اپنی اولادوں سے ملنے اور یہ دیکھنے کہ وہ کیسی نکلتی ہیں اور دنیا میں کیا نام پیدا
کرتی ہیں!"

میں ماریہ کو چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ تاشی نے ماریہ کی بابت پوچھا تو میں نے یہی
جواب دیا کہ وہ جس ماحول کی تھی اسے وہیں پہنچا آیا!

تاش کے لئے یہ بڑی اچھی خبر تھی، بولی۔ "ان پڑھے لکھوں میں اپنی زندگی کس
طرح گزار سکتی تھی بھلا!!"

میں تاشی اور کئی لڑکیوں کو لے کر قراقرم واپس چلا گیا۔

قراقرم میں انتشار پھیل چکا تھا۔ خاقان اعظم منگو خان مر چکا تھا۔ ایرق بوقا اور قبلائی خان میں خاقانی کا جھگڑا چلا جس میں قبلائی خان نے فتح پائی اور قبلائی خان قراقرم کے بجائے چین میں رہنے لگا۔ اور وہیں سے حکومت کرنے لگا۔ شاید میں ایمان کی طرف ہلاکو خان کے پاس پھر واپس چلا جاتا کیونکہ اب قراقرم میں خاک اڑنے لگی تھی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ہلاکو خان قراقرم واپس لوٹتے ہوئے اپنے چچا کے بیٹے برقائی خان سے الجھ پڑا۔ برقائی خان قفقاز اور روس پر قابض تھا اور مسلمان ہو چکا تھا اس نے ہلاکو خان کے مسلمان دشمنی کے اعمال پر سخت نکتہ چینی کی تھی اور اس سے جواب طلب کیا تھا کہ وہ بغداد کی تباہی، مسلمانوں کے قتل عام اور مساجد اور قرآن پاک کی بے حرمتی جیسے افعال قبیحہ کا کیوں مرتکب ہوا۔ ہلاکو خان نے جھنجلا کر اس پر حملہ کر دیا اور برقائی خان کے ہاتھوں اسے شکست فاش اٹھانی پڑی اور شاید اسی غم میں وہ چل بسا۔ سننے میں آیا ہے کہ ہلاکو خان کے مرنے کے بعد کئی حسین لڑکیاں بھی اس کے ساتھ زندہ دفن کر دی گئیں۔

اب قراقرم میں خاک اڑنے لگی تھی۔ قبلائی خان خاقان بن کر چین کے شہر شیانگ چو سے حکومت کر رہا تھا۔ جن لڑکیوں کو میں بغداد سے لے کر آیا تھا ان میں کئی مر کھپ گئیں اور چند بھاگ گئیں، تاشی پوری وفاداری سے میرا ساتھ دے رہی تھی تشک اور بے کیف زندگی نے جیسا دوچار کر دیا تھا۔ تاشی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ میں نے جو کچھ پڑھا تھا اس نے میرے اندر ایک انقلاب برپا کر رکھا تھا۔ کئی بار ماریہ اور اس کی اولاد میں یاد آئیں لیکن سردست وہاں پہنچنا میرے بس میں نہ تھا۔

پھر مجھ پر مرغوں نے یلغار کی، ہم میں گٹھیا کا مرض عام تھا۔ میں بھی اس کا شکار ہو گیا۔ بڑا علاج کیا لیکن قراقرم میں کوئی حاذق طبیب نہ تھا۔ اس لئے صحیح علاج بھی نہ ہو سکا۔ پھر بخار نے آدبایا اور میں روز بہ روز کمزور ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ ماریہ سے جدا ہوتے پچیس سال گزر چکے تھے اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ زندہ بھی ہو گی یا مر چکی ہو گی، مجھے اپنے بچے یاد آتے، میں نے سوچا اگر وہ زندہ ہوں گے تو جوان ہو چکے ہوں گے۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور یہ جی چاہا کہ کسی طرح اڑ کر بیت المقدس پہنچ جاؤں اور ماریہ اور اپنے بچوں

بن زندگی گزارنے لگوں، لیکن بیماری نے مجھے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ میں اس کی طرف سے تقریباً مایوس ہو گیا تھا۔

اس صحرا میں تاشی کا میرے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ اس کا اداس چہرہ بتاتا تھا کہ وہ میری زندگی سے مایوس ہو گئی ہے۔ میں اسے تسلی دلاسے دیتا رہتا لیکن وہ بچہ نہ تھی میری کسی بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

گھٹیا کا درد اتنا پریشان کر رہا تھا کہ میری چیخیں نکل جاتیں، تاشی یہ سمجھی کہ میں مرنے والا ہوں، سوگوار میری بائیں جانب بیٹھ گئی اور رو کر دریافت کیا۔ "خان! تم مجھے کس کے رحم پر چھوڑ جاؤ گے؟"

میں اس وفادار عورت کو غور سے دیکھنے لگا اور کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے پھر پوچھا۔ "آغائی خان! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تمہارے بعد میں کہاں رہوں گی؟"

میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا تم میرے بغیر زندگی کو موت تصور کرو گی؟"

"ہاں خان! میری زندگی تم ہو اور تم نہیں تو کچھ بھی نہیں!"

میں نے اشارے سے اسے قریب بلایا۔ جب وہ قریب آ گئی تو میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم میرے بعد کسی اور کے رحم و کرم پر رہو، تم میرے ساتھ چلو!"

"کہاں؟"

میں نے نیلے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس جاودانی نیلے آسمان کے اوپر، اس پار، جہاں ہماری روحیں مستقل قیام کرتی ہیں!"

تاشی نے میری آنکھوں میں کچھ پڑھ لیا تھا اس نے پھرتی سے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن میں نے نہایت پھرتی سے سرہانے رکھا ہوا خنجر اٹھا کر اس کے پیٹ میں اتار دیا، وہ چیخ مار کر گر گئی۔ میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تو یہاں میرے بعد بے آسرا ہو کر رہے، میں جا رہا ہوں میرے ساتھ تو بھی چل!"

جسم کے جوڑوں میں اترا ہوا گھٹیا کا درد مجھے چلتے چلنے کی بھی اجازت نہیں دے رہا تھا لیکن میں پھر بھی گھسیل کر زخمی تاشی کے پاس پہنچا اور خنجر دو کے تین وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔

اور بستر پر گر کر اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔

دھڑکتے دل سے میں گرجے میں داخل ہوا اور ایک نوجوان پادری سے دریافت کیا۔ "بیٹے یہاں ماریہ نامی بزرگ عورت رہتی ہے؟"

اس نے مجھے سر سے پیر تک بغور دیکھا اور پوچھا۔ "ان سے کیا کام ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں بہت دور سے ان سے ملنے آیا ہوں، ان سے ملنے"

نوجوان مسکرانے لگا۔ اور مجھے لئے ہوئے خانقاہ کے ایک دہانتی حجرے میں لے گیا۔ وہاں ایک بڑھاپے کی حد دہن میں قدم رکھ دینے والی عورت کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول نظر آئی۔ نوجوان پادری نے کہا۔ "ماں دیکھنا تو یہ کون آیا ہے!"

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر دوڑ کر بے ساختہ مجھ سے چمٹ گئی۔

"تم آگئے۔ آخر تم آگئے، میں جانتی تھی کہ تم ضرور آؤ گے!"

میری آنکھیں بھیگ گئیں، پیر ادنی اندر سے نکلا پڑ رہا تھا۔ اور دماغ بھنبھنا رہا تھا۔ میں نے محبت سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ "ماریہ! اب میں ہمیشہ کے لئے تیرے پاس آگیا ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!"

ہم دونوں دیر تک آنسو بہاتے رہے، پھر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔ "میرا بچہ کہاں ہے؟"

"کون؟ یعقوب؟" پھر نوجوان پادری کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور پادری سے کہا۔ "بیٹے! یہ تمہارے باپ آغا فی خان ہیں!"

نوجوان پادری سر و مہری سے کھڑا رہا۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر نمودار ہوئی اور پلک جھپکتے میں غائب ہوگئی۔

میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لینا چاہا لیکن وہ وہاں سے چلا گیا۔ میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ میں نے کہا۔ "ماریہ! کیا تو نے اسے خوب اچھی طرح تعلیم تربیت دے دی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں خوب اچھی طرح، کیوں، کیا تمہیں اب بھی کسی قسم کا شبہ ہے؟"

میں نے دکھ سے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں، یعقوب میں جوش و خروش نہیں ہے، محبت کا جوش، خلوص کا جوش!" پھر پوچھا۔ "اور وہ دوسرا بچہ؟ وہ لڑکا تھا یا لڑکی؟"

ماریہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "وہ لڑکی تھی، جو چند مہینے زندہ رہ کر
ل بسی!"

میں چپ ہو رہا۔ اور کچھ دیر بعد ماریہ سے کہا۔ "ماریہ! میں بیمار ہوں، مجھے
ھٹیا نے ستا رکھا ہے!"

ماریہ نے کہا۔ "مت گھبراؤ، میں تمہارا علاج کراؤں گی، لیکن یہ تو بتاؤ کہ اب
م واپس تو نہیں جاؤ گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اب میں کہاں جاؤں گا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں
آ گیا ہوں!"

ماریہ نے جس طبیب سے میرا علاج کرایا وہ ایک نہایت خوش اخلاق نوجوان
طبیب تھا جس کے لئے، عرصے بعد یہ پتہ چلا کہ وہ میرا ہی بچہ تھا۔ وہ بچہ، جسے
ماریہ نے لڑکی کہہ کر فوت شدہ بتا دیا تھا۔ ماریہ یہ جھوٹ اس لئے بولی تھی کہ وہ
اسے میری ہدایت اور خواہش کے مطابق سپاہی نہیں بنا سکی تھی، اس میں یہ دروغ
گوئی کا عیب کتاب اور شہری زندگی نے پیدا کیا تھا۔

میرا بڑا لڑکا مجھ سے دور دور رہتا اس نے مجھے کئی بار عیسائی ہو جانے
پر مجبور کیا لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میں کسی ایک مذہب کو اختیار کر کے
دوسرے مذہب کے خداؤں کو ناراض نہیں کر سکتا۔"

وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خفا ہو گیا۔ ماریہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتی ہے،
گھٹیا کے موذی مرض نے مجھے چلنے پھرنے تک سے معذور کر دیا، ماریہ کی توجہ مجھ پر کم
اور اپنے لڑکوں پر زیادہ رہتی ہے، میں نے کئی بار سوچا کہ قزاقزم واپس چلا جاؤں لیکن اب
واپسی کی صحیح میں سکت ہی نہیں رہی، اب ماریہ کبھی کبھی یہ کہنے لگی ہے کہ "تم ہلاکو خان
قبلائی خان چینی تہذیب کے ہاتھوں مسخر ہو چکا۔ تم بھی بیت المقدس میں ہرمن
زندگی گزارنے پر مجبور ہو، ہم شہری لوگ بھیڑیے تو نہیں بن سکتے تھے لیکن تعلیم اور تہذیب
کے ذریعے ہم نے تمہیں بکری ضرور بنا دیا ہے، اب تم کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ یہیں رہو
اپنی اولادوں میں، لیکن ایک اجنبی کی طرح ان کی محبت سے محروم۔"

میں چاہتا ہوں کہ ماریہ کا گلا گھونٹ دوں مگر اس کی ناک توڑ دوں لیکن
یہ کیوں کر ممکن ہے کیونکہ میری انگلیوں کے جوڑ سوجے ہوئے ہیں اور میری کلائیوں میں اتنی طاقت بھی
نہیں رہی کہ انہیں اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ادھر ادھر گھما پھرا سکوں۔ ✱

آوارہ گرد بادشاہ

میں سخت الجھن میں ہوں کہ اپنی داستان کا آغاز کس طرح اور کہاں سے کروں
کہ جب میں کچھ کہنے کے لئے اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ دیکھ کر میری الجھنوں
ور اضافہ ہو جاتا ہے کہ مصائب و ابتلا، حوادث و سانحات اور نشیب و فراز کا ایک وسیع و
ن جنگل تھا جس سے گزر کر میں اپنی زندگی کے چالیسویں سال میں داخل ہوا۔ ان میں عشق و
ں کی رنگینیاں اور جوانی کی کیف آور گھڑیاں اس طرح آئیں جیسے گھنگھور رات میں کوندا
ں جاتے ہیں نے شاہی خاندان میں پرورش پائی ہے کہتے ہیں حضرت بادشاہ ہمایوں کے
نی مرزا کامران نے کچھ دن میری ماں کا دودھ پیا تھا اس نسبت سے میں مرزا کامران کا
دھ شریک بھائی تھا۔ میں نے اپنی زندگی مرزا کامران کے زیر سایہ گزاری لیکن بعد میں کچھ
ا انقلاب آیا کہ مجھے مجبوراً مرزا کامران سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔
میں مرزا کامران کو آکا مرزا کہتا تھا۔ اسے کابل کی حکومت تفویض ہوئی تھی۔ ایک
ا سہ پہر کو آکا مرزا نے مجھے خلاف معمول بلا بھیجا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا، اس وقت
ہ ایک بدخشی تاجر سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا، آکا مرزا نے
مجھے سرسری نظر سے دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے سلام کا جواب دے کر بدخشی تاجر
ے گفتگو جاری رکھی۔ وہ کہہ رہے تھے "اگر قسمت نے یاوری کی تو ہند کی حکومت بھی اپنے
یرنگیں آجائے گی، ہم اس وقت تجھے اتنا نوازیں گے کہ تو اس وقت اس کا اندازہ تک
ہیں لگا سکتا!"
پھر مجھ سے دریافت کیا۔ "علی مرزا! کیا تجھے حسین لڑکیوں کی صحبت میں
ہنے کا شوق نہیں ہے؟"
میں آکا مرزا کا ادب کرتا تھا لیکن دلچسپ اور پُرکیف سوال نے حوصلہ پیدا کر
دیا، جواب دیا۔ "ہے کیوں نہیں، لیکن جب میں اپنی حیثیت پر غور کرتا ہوں تو شرمندہ ہو

جاتا ہوں۔"

آکا مرزا ہنس دیتے، بولے۔"اچھا تو تو بھی کیا یاد کرے گا، ہم تیرا یہ شوق پورا کر دیں گے۔" پھر بدھشی تاجر سے پوچھا۔"اس وقت تم کتنی لڑکیاں لائے ہو؟"

تاجر نے جواب دیا۔"حضور والا! کل دس لڑکیاں لیکن یہ ساری کی ساری اتنی ہیں۔"

آکا مرزا نے کہا۔"اچھا تو کل انہیں لیتے آنا!"

"جیسا حضور والا کا حکم!"

آکا مرزا نے اسے کچھ نقد رقم دی۔ جب وہ چلا گیا تو آکا مرزا نے مجھ سے کہا "علی مرزا! سننے میں آیا ہے کہ آگرے میں حضرت بادشاہ (بابر) سخت علیل ہیں اور زندگی کے آثار نہیں پاتے جاتے ہم چاہتے ہیں کہ تو چند آدمیوں کے ساتھ آگرے جائے اور ہمیں صحیح صورت حال کی خبر دے!"

مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ میں آکا مرزا کی حکم عدولی کر سکتا۔ میں نے پوچھا "حضور والا! بطفیل خاطر اس خادم پر مظاہر فرمائیں تاکہ اس کے تکملے کی تگ و دو میں اپنی جان کھپا دوں!"

آکا مرزا نے نہایت شفقت سے کہا۔"ہم چاہتے ہیں کہ تو کابل اور ہند کے عظیم بادشاہ کا بھائی کہلائے۔ اس وقت ہند اور کابل کے تاج و تخت ہمارے منتظر ہیں۔ تو آگرے پہنچنے کی تیاری کر اور حضرت بادشاہ کی بیماری کی صحیح کیفیت سے ہمیں مطلع کر۔ ہم خبر کے مطابق اپنی کوشش کے قدم بڑھائیں گے!"

سچ بات تو یہ ہے کہ اس وقت اس خیال سے میں بے حد خوش ہوا تھا کہ اگر ہند اور کابل کے بادشاہ بن گئے تو میں ان کے وسیلے سے بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا۔

دوسرے دن طلوع آفتاب کی دو گھڑی بعد مجھے پھر طلب کیا گیا۔ اس وقت آکا مرزا اپنی بارہ دری میں سفید چاندنی پر نیلے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے۔ بارہ دری چونکہ شاہی محل کے اندر واقع تھی اس لئے یہاں دن کی روشنی پوری طرح نہیں پہنچتی تھی۔ بارہ دری کی چھت سے لٹکے ہوئے فانوس اس وقت بھی روشن تھے اور ان کی روشنی میں بارہ دری افسردہ افسردہ سی محسوس ہو رہی تھی۔ آکا مرزا کے سامنے دس حسین جمیل اور فتنہ ساماں لڑکیاں نازِ دلربا سے کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے اور آکا مرزا کے بائیں جانب امید و بیم کی کیفیت کا شکار کل والا بدھشی تاجر بھی لڑکیوں کو دیکھتا ا

مرزا کو دیکھنے لگتا۔ اس طرح وہ معاملے کے امید افزا یا حوصلہ شکن پہلو کو سمجھنے کی
رہا تھا۔

میں نے ان سراپا قیامت لڑکیوں کو دیکھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ آکا مرزا نے پوچھا۔
ھ میں کیا ہو گیا۔ کہیں تجھے آشوب چشم کی شکایت تو نہیں ؟"

میں نے کھسیا کر جواب دیا۔ "خدا نہ کرے، میں تو اچھا بھلا ہوں۔"

آکا مرزا نے ان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سب تیرے لیئے ہیں لیکن
ت تیرے ہونے کی سایتیں گی جب تو آگرے والے منصوبے پر ہوشیاری اور عقل مندی
ر آمد کر چکے گا۔"

اس کے بعد آکا مرزا مجھے تنہا چھوڑ کر اندر چلے گئے ہم لوگ ان کا بڑی دیر تک
تے رہے لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ بدھشی تاجر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے ایک
چاہ زنخداں والی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جناب! مجھے نہیں
ان لڑکیوں میں سے کون کون سی لڑکی آپ کے حصے میں آتے گی لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ
و اپنی پسند کی ایک لڑکی منتخب ہی کرنا پڑے تو اس چاہ زنخداں والی لڑکی کو ہرگز نہ
گا!"

میں نے کوئی جواب نہ دیا، خاموش رہا، غالباً بدھشی تاجر نے آنکھ کے اشارے سے
ی کو آگے بلایا۔ وہ سر پر ایک ٹوپی پہنے ہوئے تھی، یہ ٹوپی جسے طاق کہتے تھے، اس
علامت تھی کہ جس کے سر پر یہ ٹوپی ہوگی وہ کنواری ہوگی کیونکہ شادی کے بعد لڑکیاں
اندھنے لگتی نہیں۔ یہ ایک قسم کا بڑا رومال ہوتا ہے جس کے دونوں سرے موڑ کر
ناپ لیتے ہیں اور ٹھوڑی کے نیچے ایک گرہ لگا دیتے ہیں۔

بدھشی تاجر نے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "ذرا اس
تھ کو چھو کر تو دیکھو، کیسا نرم و نازک اور لچکیلا ہاتھ ہے۔" اس کے بعد اس نے میرا
بردستی لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا اور بولا۔ "جنہیں علم قیافہ آتا ہے، ایسے
ہاتھ اور لمبی انگلیوں والی لڑکیوں کی بابت یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعرانہ مزاج کی مالک ہوتی
ان میں جذبات حسن و عشق کی فراوانی ہوتی ہے۔ یہ اپنے عاشق سے نہایت گرم جوشی
یش آتی ہیں!"

میں نے اس لڑکی کا ہاتھ آہستہ سے دبایا لیکن گرم جوشی کا اظہار نہ کر سکا کیونکہ
ر تھا کہ کہیں کسی طرف سے آکا مرزا نہ آ جائیں۔ اس لڑکی نے اپنی بڑی بڑی باادام

جیسی آنکھیں اوپر اٹھائیں اس کی لمبی لمبی پلکیں تیروں کی طرح میرے چہر
تن گئیں۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس کا ہونٹوں پر کوئی اثر نہ تھا، اس کی آنکھوں پر
کی جاسکتی تھی۔ بدچشمی تاجر ہم دونوں کی قلبی کیفیات نہایت ہوشیاری سے سمجھنے
کر رہا تھا۔

اتنے میں اکامرزا آ گئے۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اکامرزا نے کہا "
کرتا ہے۔ یہ تیری ہی امانت ہے، جو بالآخر تیرے حوالے کر دی جائے گی!" پھر
سے کہا "ہم نے اپنے ترجمان سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمھیں ان لڑکیوں کی مجموعی قیمت
کر دے گا۔"

اکامرزا نے مجھے بارہ دری سے ملحقہ ایک کمرے میں لے گئے۔ میرے
تھ پھپھائی اور کہنے لگے ہم نے تیری ماں کا دودھ پیا ہے تو ہمزاد حقیقی بھا
اور یہ تیرا فرض ہے کہ اپنے اکامرنا کو ہند کی حکومت حاصل کرنے میں مدد دے۔
آگرے چلا جا اور ہمیں ہم خبریں بھیجتا رہ۔ اگر بابا جان نے ہمایوں کو تاج و تخ
بھی دیا تو ہم ان سے زبردستی حاصل کرنے کی تدبیر کریں گے۔ یہ حسین و جمیل لڑکی
روشن جبیں ہے، تیرا انعام ہے۔ ویسے یہ ساری لڑکیاں تجھے انعام میں بخش دی
لیکن ہم پہلے تیری صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں!"

اس کے بعد اکامرزا پھر چلے گئے اور شاید خود انھوں نے روشن جبیں
کمرے میں بھیج دیا۔ یہ فتنہ سامان اور سراپا قیامت میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔
آگے بڑھی اور مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا
وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر اس نے اور زیادہ جرأت سے کام لیا اور میرے
اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور ایک بار پھر دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہاں اکا
جھلک دکھائی دی۔ ان کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا اور اس خنجر کی نوک ہم دونوں کی طر
سہم گیا۔ میرا خیال تھا کہ روشن جبیں بھی ڈر کر مجھ سے کنارہ ہٹ جائے گی۔ لیکن اس کا آئند
توقع کے برعکس نکلا۔ وہ مجھ سے قریب ہو گئی، بہری طرح، پورے جوش اور سرگرمی
تاجر کے بقول، اس کی لمبی انگلیوں اور نرم و نازک ہاتھ کی خصوصیات اور صفات
میں میرے سامنے تھیں۔ اکامرزا کے خوف سے بے نیاز میرے دل میں سماتی چلی گئی۔
جذبات میں بہہ گیا اور روشن جبیں کی گداز اور لطیف حسن میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے
اور کیف اپنی لگ وپے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا جس کے لطف اور لذت کو لفظ

جاسکتا، جسم میں خون کی جگہ لطف و سرور کی لہریں دوڑ رہی تھیں انہی لہروں
ولی اور حقیر سی ڈر کی لہر بھی دوڑتی محسوس ہوئی آکا مرزا اور ان کے عریاں خنجر
لہر مار دیئے جانے یا زخمی کر دیئے جانے کی دہشت کی لہر لیکن روشن جبیں کی
ن و ناز کا سحر اس دہشت پر غالب آگیا

✱

دن بعد میں آگرے روانہ ہو گیا۔ مجھے حیرت تو اس بات کی تھی کہ آکا مرزا نے
ے سے ہم ملاقات والے واقعے کا اشارتاً بھی ذکر نہ کیا اور یہ بات ایک مدت بعد
آئی کہ اس روز جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ آکا مرزا کی خواہش اور حکم پر ہوا تھا۔
نے روشن جبیں کو بے تکلف ہو جانے کا حکم دیا تھا۔ اور اس حکم کی تعمیل کرانے
و بہ خنجر لئے دروازے پر موجود تھے اور شاید روشن اسی لئے گھوم گھوم کر
کی طرف دیکھتی بھی رہی تھی۔ شاید اس عجیب و غریب طریقہ کار سے ان کا یہ مقصد
ے کے حلق میں چند قطرے ٹپکا کر اس کی تشنگی کی آگ کو بری طرح بھڑکا دیا جائے۔
آگ سے مشتعل ہو جانے کے بعد میں بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتا تھا اس توقع
مہم جوئی میں کامیابی کے بعد میں روشن جبیں کا حق دار ٹھہروں گا اور میرے حوالے
ئے گی۔

چلتے وقت روشن جبیں نے ایک عجیب سی بات کہی تھی۔ اس نے دوپٹے کا آنچل
ہاتھ کی پہلی انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا تھا "علی مرزا! میں بدخشاں کی رہنے والی ہوں
حکومت، بادشاہ سلامت (بابر) نے ہمایوں کو عطا فرمائی ہے۔ تم حق اور انصاف سے
ہرگز نہ کرنا، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔"

میں نے اس سے حق اور انصاف پر چلنے کا عہد بھی کر لیا تھا لیکن جب راستے میں
یک ایک بات پر غور کیا اور اس کے معانی و مطالب نکالنے لگا تو روشن جبیں کی مبہم
ی سمجھ میں نہ آسکی کیونکہ جہاں تک حق و انصاف کا تعلق تھا اس کی رو سے مجھے
کا وفادار ہونا چاہیے تھا لیکن مجھ سے وفاداری کا مطالبہ آکا مرزا کر رہے تھے،
ے میں سخت الجھن میں پڑ گیا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے ان چکروں میں نہیں
ہیئے۔ آکا مرزا نے میرے سپرد جو کام کیا ہے اسے انجام دے کر روشن جبیں کو
لینا چاہیئے اور پھر انعام میں آکا مرزا سے کوئی جاگیر لے کر رخصت ہو جانا چاہیئے۔

اور پوری زندگی لطف و مسرت میں گزار دینا چاہیئے۔

میلوں دور سے آگرے کی بو محسوس ہونے لگی۔ جمنا کے مشرقی کنارے بادشاہ بابر نے تعمیر کردہ باغ گل افشاں کی سرخ پتھروں سے ترشی ہوئی عمارت بہ علامت پرداز تھے اور یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ جب مجھے ان کے حضور پہنچایا گیا کے گرد و پیش بڑے بڑے امرا جمع تھے۔ یہ امرا حضرت بادشاہ کی زندگی کے ہر موڑ پر وفادار ثابت ہوتے تھے۔ وہ شاہی تخت کے پیچھے ایک لمبے تخت جیسی کرسی پر اور ان کے قریب ہی شہزادہ ہمایوں دست بستہ کھڑا تھا۔ حضرت بادشاہ کو جب میرے ہوا تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے اپنے قریب بلایا شفقت سے میرا ہاتھ پکڑ یں لے لیا اور اسے سہلانے لگے۔ پہلے آپ نے مرزا (مرزا کامران) کی خیریت پوچھی۔ پھر مرز کی بابت متعدد سوالات کیے۔ انہوں نے ایک عظیم شہنشاہ کی شان سے کہا: "کا تمام اطلاعیں اس وقت نظروں کے سامنے ہوتیں لیکن کوئی حرج نہیں، سب کی مرضی پر غالب ہے!"

حضرت بادشاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہمایوں کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر امرا کو مخاطب کیا۔ "دوستو! یہ شہزادہ نصیر الدین ہمایوں ہمارا جانشین اور وارث تاج ہے۔ ہماری ذات سے وابستہ وفاداریاں اب تم سب اپنے نئے بادشاہ کی طر کر دو۔" پھر ہمایوں کو حکم دیا کہ وہ تخت پر بیٹھ جائے۔ ہمایوں ہچکچاتا ہوا تخت حضرت بادشاہ اور امرا نے ایک ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور قرآنی آیات چپکے چپکے دعائیں دینے لگے۔ حضرت بادشاہ نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ پھیر سے کہا۔ "ہمایوں! اب تم اس مملکت کے شہنشاہ ہو اور تمہارا یہ فرض ہے کہ پوری سے خدا کی اطاعت اور بندگان خدا کی خدمت کرو، انصاف اور سچائی کو کبھی بھی نہ جانے دو اور غریبوں اور بے آسرا لوگوں کو سہارا دو اور ہاں ایک اور خاص بات۔" یہ کہتے حضرت بادشاہ کچھ فکرمند ہو گئے۔ معلوم نہیں کیا سوچنے لگے۔ پھر کہا: "ہا اپنے بھائیوں کے ساتھ مہربانی اور محبت سے پیش آنا، ان کا جرم کتنا ہی سنگین ناقابل معافی کیوں نہ ہو انہیں معاف کر دینا، غصے میں آکر کبھی بھی ان کے خلاف قدم ہرگز نہ اٹھانا!"

اشکبار ہمایوں نے حضرت بادشاہ کی اس نصیحت پر سختی سے عمل پیرا گلوگرفتہ آواز میں عہد کیا۔ اس کے بعد حضرت بادشاہ سوتے خلد بریں تشریف

ں کے شرخ محل میں کہرام برپا ہوگیا۔ متغل امرا نے یہ مشورہ دیا کہ حضرت بادشاہ کی
د چھپایا جائے۔ چنانچہ کئی دن تک یہ خبر راز میں رہی لیکن ایک دن آگا کش نان نامی
ندی امیر نے ہمایوں سے بصیغہ رازداری ودفاداری مشورۃً عرض کیا کہ "حضرت بادشاہ
ی موت کی خبر چھپاتے رکھنا اچھی بات نہیں ہے کیونکہ ماض میں جب بھی ایسا کیا گیا
شبے نے جڑ پکڑی اور بازار میں لوٹ مار شروع ہوگئی!"
ہمایوں نے فکرمندی سے دریافت کیا "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"
آگا کش خان نے جواب دیا۔ "کسی شخص کو منادی کی خدمت سونپ کر شرخ
پہنایا جائے اور اسے ڈھول دے کر ہاتھی پر بٹھا دیا جائے۔ وہ شہر کے بازاروں
ں کوچوں میں ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کردے کہ اعلا حضرت بادشاہ نے گوشہ نشینی
ر کرلی ہے اور درویش بن کر بادشاہت ہمایوں کو سونپ دی ہے!"
ہمایوں نے اس تجویز پر عمل کیا اور لوگوں کے شکوک کو رفع دفع کردیا۔ حضرت
ناہ مرحوم کی لاش ایک تابوت میں امانتاً رکھ دی گئی کیونکہ مرحوم بادشاہ کی وصیت کے
بق اسے کابل میں دفن ہونا تھا۔
میں نے یہ ساری روداد بالتفصیل لکھ کہ آگا مرزا کو روانہ کردی۔ میرے ساتھ ہمایوں
لوک بہت اچھا تھا اور وہ آگا مرزا اور عسکری مرزا کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتا تھا۔
ے ہمایوں میں جیسی نیک نفسی اور شرافت نظر آئی اس کے پیش نظر میں نے آگا مرزا کو
ن دلایا کہ اگر وہ ذرا سی ہمت سے کام لے تو ہندوستان کا تخت وتاج اس کے قدموں
ں ہوگا۔
آگا مرزا نے مجھے لکھا کہ "تم ہمایوں کے آس پاس موجود رہو اور اس کی ہر بات
نظر رکھو اور مجھے آگرے پہنچا سمجھو!"
اسی دوران گجرات کے حکمران سلطان بہادر نے سرکشی اختیار کی اور ہمایوں اس کی
رکوبی کو آگرے سے باہر نکلا۔ میں نے آگا مرزا کو مئی صورت حال سے مطلع کیا اور مشورہ دیا
ہمایوں کی عدم موجودگی آگرہ سے فائدہ اٹھانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ "دشمن جبیں کی
ر آنکھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے لتاتی رہتی تھی اور اس نے مجھے یہاں تک خبایا کہ میں نے
ط کے آخر میں آگا مرزا سے درخواست کی کہ "دشمن جبیں اس ناچیز کی آپ کے پاس امانت
ہے۔ آپ کی عاید کردہ شرط کی تکمیل میں معلوم نہیں کتنا وقت لگے گا اس لئے کیا یہ بات
ائز اور مناسب نہیں ہے کہ دشمن جبیں کی ایک تصویر بھی ماہر مصور سے بنوا کر اس نابینر

کو روانہ کر دی جائے!"

آکامرزا نے میری درخواست پوری کر دی، روشن جبیں کی تصویر نے میرے اشتیاق اضطراب میں اور زیادہ آگ لگا دی۔ میں تنہائی میں اس تصویر کو سینے سے لگا کر دیوانوں جیسی باتیں کرتا رہتا۔ گو یہ ایک بیجان تصویر تھی لیکن مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مسکرا رہی ہمایوں نے سلطان بہادر کے تعاقب اور مقابلے میں سینکڑوں میل کا سفر کیا اور اسے شکست فاش دے کر گجرات کی حکومت مرزا عسکری کے حوالے کر دی۔ مرزا عسکری اور مرزا کامران ایک ساں کے پیٹ سے تھے۔ ہمایوں آگرے واپس آیا۔ آکامرزا ابھی تک حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر ہمایوں افغان باغی شیر خان سوری سے الجھ گیا کیونکہ شیر خان کے عزائم بہت ہی خطرناک محسوس ہو رہے تھے۔ اسی موقع پر میں نے آکامرزا کو زور دے کر لکھا کہ اب اس سے بہتر موقع شاید کبھی بھی نہ آئے ہمت کر کے آگے بڑھیں اور آگرے پر قبضہ کر کے ہمایوں کو جلاوطن کر دیجئے"

مجھے اسی بات کا ذرا بھی علم نہ تھا کہ چند حاسد اور چغل خور میرے کمرے اور افعال پر نگرانی کر رہے ہیں۔ چنانچہ اسی غفلت اور لاعلمی کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرا آخری خط پکڑا گیا مجھے خط سمیت ہمایوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

ہمایوں نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا یہ تیری تحریر ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہمایوں نے سختی سے پوچھا۔ "مرزا کامران کیا ہے؟"

میں نے سادہ لوحی سے جواب دیا۔ "اعلاحضرت کی قربت اور حضوری"

ہمایوں نے غصے میں کہا۔ "دہلی اور آگرے پر قبضے کی ترغیب دیتے ہوا جلاوطن کر دینے کا مشورہ دے رہے ہو اور جب تمہاری سازش پکڑی گئی تو یہ ہو کہ مرزا کامران ہماری قربت اور حضوری کا خواستگار ہے"

میں نے جواب دیا۔ "اعلاحضرت! اسی ناپسند نے وہی کچھ لکھا ہے جو حضور نے پڑھا ہے لیکن اسی کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جس کا بظاہر اظہار ہوتا ہے۔ حضور نہیں جانتے کہ آکامرزا کے مشیر کیسے ہیں ــــ وہ آکامرزا کو ہر وقت اس پر آمادہ رہتے ہیں کہ وہ آپ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائیں اور آپ کو آگرے اور دہلی سے باہر کریں۔ میری معترضہ عبارت میں درپردہ آکامرزا کے لئے یہ پیغام ہے کہ وہ دہلی آگرے کی طرف بڑھیں اور آپ سے مل کر حاسد اور خبثی امرا کو جلاوطن کر دیں

عایتوں کے درمیان اختلافات اور منافشات کی خلیج نہ حائل کر سکیں!"

ہمایوں میرے اس جواب سے کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔

اسی دوران یہ پتہ چلا کہ مرزا عسکری نے احمد آباد میں سرکشی اختیار کی اور اپنے نام پر خطبہ پڑھوانے کی فکر میں ہے۔ ہمایوں کو اس خبر سے بڑا دکھ پہنچا اور جواب دہی کے لئے عسکری مرزا کو طلب کیا۔ ادھر شیر خان کو بھائیوں کے اختلافات کی رتی رتی خبریں مل رہی تھیں اور وہ اس کوشش میں تھا کہ یہ اختلافات کم نہ ہوں، بڑھتے ہی رہیں۔ اس نے مرزا نے مجھے اپنے خط میں لکھا تھا کہ "شیر خان سے کسی بھی طرح خفیہ طور پر ملو اور اسے یہ جاری رکھنے کا مشورہ دو۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ ہمایوں کے ایک طاقت ور حریف کی ہمیں حمایت حاصل ہو جائے گی۔"

اتفاق کی بات کہ یہ خط بھی پکڑا گیا اور ہمایوں نے مجھ سے پھر جواب طلب کیا۔ میں نے بارہا بھی بات بنانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ہمایوں میری بات سے مطمئن نہ ہوا، بولا۔ "مرزا کامران ہمارا بھائی ہے اور تم اس کے دکھ درد میں شریک بھائی ہو۔ اس رشتے سے تم ہمارے بھائی بھی ٹھہرے، کیا تمہارا یہ فرض نہیں ہے کہ تم اگر ہم بھائیوں میں کسی کے اختلافات محسوس بھی کر رہے ہو تو انہیں اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور فکر و تدبیر سے دور کرو، چہ جائیکہ ہمیں آپس میں لڑانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

میں ہمایوں کی بات سے بہت متاثر ہوا اور تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ آکا مرزا کے لئے جاسوسی یا شریف النفس ہمایوں سے لئے آپس میں فساد و یگانگت کی کوشش؟ ابھی میں اسی فکر و تردد میں تھا کہ ہمایوں کی فوج میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ مرزا ہندال (ہمایوں کا ایک اور بھائی) ہمایوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر آگرے کا بادشاہ بن بیٹھا ہے اور خطبے میں اپنا نام پڑھوا کر دہلی کی طرف بڑھنے والا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی سننے میں آیا کہ آکا مرزا لشکر جرار کے ساتھ دہلی کی طرف چل پڑا ہے اور غالباً مرزا ہندال اور آکا مرزا میں جنگ و جدال برپا ہونے والی ہے۔"

مجھے آکا مرزا کی یلغار سے خوشی ہوئی اور بالکل ایسا محسوس ہوا کہ آکا مرزا نے آگرے اور دہلی پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے اور جمعے کی نمازوں کے خطبے میں آکا مرزا کا نام پڑھا جانے لگا ہے۔ اس خوش فہمی اور فضول احساس نے ذرا سی دیر کے لئے مجھے غافل اور لاپروا بنا دیا۔ میں اپنے خیمے میں چلا گیا اور روشن جبیں

کی تصویر سامنے رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے تصویر سے کہا۔ "روشن جبیں اب وہ دن دور نہیں کہ میں تمہیں حاصل کر چکا ہوں گا، تم نہیں جانتیں کہ تمہاری مفارقت نے مجھے نیم جان کر رکھا ہے۔"

عین اُس وقت جب میں تصویر کو بوسہ دے کر سینے سے لگائے ہوئے تھا ایک سپاہی نے میری چوری پکڑ لی اور نہایت بیدردی سے روشن جبیں کی تصویر مجھ سے چھین لی۔ اس کی اس حرکت پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے تصویر کی واپسی کے لئے اس پر بھرپور حملہ کر دیا۔ میں نے آچھل کر اپنی ٹانگوں سے اس کے سینے پر ایک مکہ لگائی لیکن اس نے وار خالی کر دیا اور میں اپنے زعم میں آپ ہی ڈھیر ہو گیا۔ میرے گرتے ہی وہ میرے سینے پر سوار ہو گیا اور چیخنے لگا۔ "لوگو! دوڑنا، میں نے اس کو ایک ایسی چوری پکڑی ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔"

ذرا سی دیر میں بہت سارے آدمی میرے خیمے میں داخل ہو گئے، مجھے چت اور اس سپاہی کو میرے سینے پر سوار جو دیکھا تو ہنسنے لگے، کسی نے پوچھا۔ "یہ شخص ہے نا جس نے مرزا کامران کے لئے جاسوسی کی خدمات انجام دی ہیں؟"

کسی نے جواب دیا۔ "ہاں یہ وہی ہے!"

کسی نے پوچھا۔ "کیا پھر کوئی محطہ پتر پکڑا گیا؟"

میں نے جواب دینا چاہا لیکن میرے حریف نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا! "تفصیل میں بتاؤں گا تو خاموش رہ!"

اتنے میں مغل دخل کی آواز سن کر ہمایوں بھی میرے خیمے میں داخل ہوا، میرے حریف نے مجھے چھوڑ دیا اور ایک طرف مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔

ہمایوں نے نرمی سے پوچھا۔ "کیا بات تھی؟ تم لوگ چیخ پکار کیوں کر رہے تھے۔؟"

میرے حریف نے ادب سے جھک کر عرض کیا۔ "حضورِ والا! یہ شخص ہمیں مسلمان نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تصویر پرست ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس تصویر پر اس شخص کو سجدہ کرتے دیکھا ہے!"

ہمایوں نہایت غور سے روشن جبیں کی تصویر دیکھتا رہا۔ پھر بے ولی سے پوچھا۔ "علی مرزا! تم پر جو الزام لگایا گیا کیا یہ درست ہے؟"

میں نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ "یہ اس ناچیز پر سراسر بہتان ہے، خاکہ

ان ہے اور ایک مسلمان تصویر پرستی کا کس طرح مرتکب ہو سکتا ہے ؟"
ہمایوں نے پوچھا۔ "یہ کس کی تصویر ہے ؟"
میں نے شرما کر جواب دیا۔ "ناچیز کی سنگیتر کی !"
ہمایوں نے طنزیہ کہا۔ "اسے سینے سے لگائے کیوں پھر رہے ہو ؟"
اس سوال کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔
ہمایوں نے تصویر میرے حریف کے حوالے کر دی اور اسے حکم دیا۔ "آگرے پہنچنے
یہ مقدمہ ہمارے سامنے پیش کیا جائے وہاں اگر یہ ثابت ہو گیا کہ تم تصویر پرستی کے
اہ کے مرتکب ہو چکے ہو تو تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی !"
میں سہم گیا، خوف کے ساتھ ہی یہ قلق مجھے اور زیادہ پریشان کرنے لگا
روشن جبیں کی تصویر مجھ سے چھن گئی تھی۔ اب میں یہ تصویر لڑ جھگڑ کر بھی واپس
لے سکتا تھا۔

بھائیوں کی سرکشی اور باغیانہ روش نے ہمایوں کو بددل اور فکر مند کر دیا تھا
اسی وجہ سے وہ زیادہ سپاہ رکھنے کے باوجود شیر خان کے مقابلے میں کمزور پڑ رہا
تھا۔ اس نازک موقع پر ہمایوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال شیر خان سے نہ الجھا جائے
اور اس سے صلح کر کے آگرے واپس جا کر پہلے بھائیوں کی سرکشی کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ
سوچ کر اس نے ملا محمد عزیز نامی ایک امیر کو طلب کیا۔ ملا عزیز کے شیر خان سے یارانہ
تعلقات رہ چکے تھے اس موقع پر معلوم نہیں کیوں ہمایوں کو میری یاد آ گئی اور اس نے
مجھے تخلیے میں طلب کیا۔ "علی مرزا ! شاید تو جاسوسی کے کام میں خاص مہارت رکھتا ہے
یہ بہترین موقع ہے کہ تو ملا عزیز کے ساتھ شیر خان کے پاس جائے اور ان
دونوں میں جو بات چیت ہر لفظاً لفظاً ہمارے گوش گزار کرے۔"
میں نے شکریے کے ساتھ بادشاہ کی خدمت قبول کی۔
اسی وقت بادشاہ نے میرے حریف کو طلب کیا اور خلاف توقع اسے حکم دیا کہ
روشن جبیں کی تصویر میرے حوالے کر دی جائے۔ میرا حریف حیرت زدگی اور ناگواری
کے آثار لئے واپس آ گیا۔ ہمایوں کے اس حکم نے مجھے خود بھی حیران کر دیا تھا۔ غالباً بادشاہ
نے میرے احساسات کا اندازہ لگا لیا کہنے لگے۔ "علی مرزا ! تم ایک ہوش مند نیکن

عاشق مزاج نوجوان ہو، ہمارا خیال ہے کہ تمھیں کامران مرزا نے حسین لڑکیوں کا لالچ دے کر اس ناپسندیدہ کام پر آمادہ کیا ہوگا، کیا تمھیں رسول اللہ ؐ کی اس حدیث کا علم نہیں جس میں آپ ؐ نے فرمایا تھا کہ دوسروں کی جستجو مت کرو۔"

شاید مجھے پہلی بار بادشاہ کی ذہانت اور فراست کا دل کی گہرائیوں سے قائل ہونا پڑا۔

اس گفتگو کے بعد ہمایوں نے نرمی سے کہا: "کل جب ہمیں تمھاری تصویر پرستی کا علم ہوا تھا تو ہم واقعی مشتعل ہو گئے تھے لیکن دیر بعد تنہائی میں جب اس مسئلہ پر پھر غور کیا تو شرمندہ ہو گئے۔ جوانی میں کون ہے جو عشق و محبت میں مبتلا نہیں ہوتا تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو تو ضرور کرو لیکن آئندہ اس کی تصویر کو سجدہ ہرگز نہ کرنا!"

میں نے جلدی جلدی عرض کیا: "اعلا حضرت کو غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اس بے جان چیز نے تصویر کو سجدہ کیا تھا۔ ایک مسلمان بت پرستی کا کس طرح مرتکب ہو سکتا ہے!"

اعلا حضرت نے مزید فرمایا: "ملی مرزا ہمیں افیون کھانے کی عادت ہے، کبھی کبھی اثر غالب آجاتا ہے۔"

بادشاہ کی صاف گوئی اس کی صدق دلی کی گواہی دے رہی تھی۔

میرے حریف نے روشن جبیں کی تصویر میرے حوالے کر دی۔ یہاں میں اپنے آن احسانات مسرت کا کس طرح اظہار کروں جو روشن جبیں کی تصویر پا کر مجھ پر طاری ہوئے تھے میں نے بادشاہ سے نظریں بچا کر نہایت احتیاط اور لاپروائی سے روشن جبیں کی تصویر پر شوق بھری نظر ڈالی اور اسے اپنی عبا میں چھپا لیا۔

جب میں ملا عزیز کے ساتھ شیر خاں کے لشکر میں داخل ہوا تو اس کے سپاہی ہمیں ایک کھدی ہوئی خندق کے پاس لے گئے۔ اس چلچلاتی دھوپ میں شیر خان اپنے بہت سارے سپاہیوں کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف تھا۔ اس کا چہرہ اور داڑھی مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ اس نے کدال فضا میں بلند کی اور زور سے کھدی ہوئی خندق کے کنارے پر ضرب لگائی۔ مٹی کا ایک بڑا ٹکڑا غبار اڑاتا ہوا خندق میں گر گیا۔ اسی عالم میں اسے ہماری اطلاع دی گئی وہ خندق سے باہر نکلا اور کدال ایک طرف رکھ کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہمارے لئے وہیں ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کیا جائے

ں حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور شیر خان پانی منگوا کر ہاتھ دھونے لگا۔
پھر ہم سب اس کے خیمے میں اکٹھے ہو کر بیٹھے اور ملا عزیز نے نہایت وقار سے
یر خان سے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ شیر خان بلا کا ذہین تھا وہ بات کی تہہ تک
پہنچ گیا۔ وہ ہمایوں کے بھائیوں کی سرکشی سے خوب واقف تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ ہمایوں
زم قیادت مغل فوج میں اتحاد اور جوش و خروش پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس
نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ "ملا عزیز! آپ ہماری طرف سے ہمایوں سے یہ عرض کر دیں
ہم دونوں بڑی مشکل میں پھنس گئے ہم خود بادشاہ سے نہیں لڑنا چاہتے لیکن ہمارا
شکر جنگ پر مصر ہے، اسی طرح ہمایوں خود ہم سے جنگ کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا
شکر جنگ پر آمادہ نہیں۔"
شیر خان کے جواب نے ہمیں صلح کی طرف سے مایوس کر دیا۔ اس وقت وہ
ہمیں بڑے تکلف سے بٹھا ہوا تھا اور شیر خان کی ہر ہر ادا اور جملہ طور طریق ہمیں
بتا رہے تھے کہ بھائیوں کی نا اتفاقی اور فوج کی بد دلی کا شکار ہمایوں اس کا مقابلہ نہیں
کر سکتا۔ ہم ہمایوں کے پاس واپس گئے اور شیر خاں کے جواب سے مطلع کر دیا۔
دوسرے دن صبح شیر خان کی فوج ہماری طرف بڑھی ان کا ایک جنگ مست ہاتھی
ہمایوں کے لشکر کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا ہمایوں نے عجلت میں طبل جنگ بجوایا اور خود
گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کے ہاتھی کے آگے بڑھا ہمایوں کا یہ جنگ جو میر بحکمہ
اور اس کے دونوں جانب پیٹے سامنے موجود تھے ہمایوں نے انھیں حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔
لیکن تینوں بے فرمی سے گردن جھکا کر کنارے ہٹ گئے ہمایوں نے میر بحکمہ کے ایک
بیٹے کے ہاتھ سے نیزہ چھین لیا اور دشمن کے ہاتھی کی پیشانی میں اتار دیا۔ دفعتہً
ہاتھی کی عماری سے ایک تیر آ کر ہمایوں کے ہاتھ میں پیوست ہو گیا۔ ہمایوں نے آف تک نہ
کی۔ اور پیوستہ تیر کی پرواہ کئے بغیر ہاتھی کی پیشانی سے نیزہ نکالنے کی کوشش کرتا رہا اور
جب انتہائی زور آزمائی کے باوجود نہ نکال سکا تو وہاں سے بھاگ کر اپنے لشکر میں آیا اور
چیخ چیخ کر حملے کا حکم دیا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ افغانی مغل لشکر کو زمین دوز کرنے میں مصروف تھے
اور مغل سپاہ چوہوں کی طرح بل کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگی پھر رہی تھی۔ خود میرا یہ حال
تھا کہ بدحواسی میں فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں گھر کر بادشاہ کے پاس پہنچا۔
اور یک بارگی میرے جی میں آئی کہ اس بے سر و سامانی میں تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ
ہمایوں کی گردن پر رسید کر دوں تاکہ آگرہ کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا دور ہو

جاتے لیکن معلوم نہیں وہ کون ساجذبہ تھا جس نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا لوگ کہتے ہیں بادشاہوں پر سات دلیوں کا سایہ ہوتا ہے ہوسکتا ہے اس خطرناک موقع پر کسی ولی کا سایہ محیط ہو جس سے وہ میرے حملے اور انتقام سے محفوظ رہا۔

میں نے آگے بڑھ کر بادشاہ کی عنان پکڑ لی اور خوشامدانہ عرض کیا: "اعلاحضرت آپ کیوں ٹھہرے ہیں مغل سپاہ زیر و زبر ہو چکی، یہ وقت ٹھہرنے کا نہیں، فرار ہو جانے کا ہے آپ یہاں کس توقع اور کس کے سہارے پر بنرد آزما ہیں؟"

ہمایوں نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور گھوڑے کو دوڑا کر دریا کے کنارے پہنچا وہاں بادشاہ کا گرد باز نامی ہاتھی پہلے سے موجود تھا۔ بادشاہ نے مہابت کو حکم دیا کہ ہاتھی اس کے قریب لایا جائے مگر مہابت نے کوئی پروا نہ کی اور بہروں کی طرح بادشاہ کی بات سنی ان سنی کر دی بادشاہ نے مجبوراً گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ بادشاہ کا گھوڑا اس کی ران سے نکل گیا اور بادشاہ ڈبکیاں کھانے لگا۔ اسی حالم میں، میں اس کی مدد کو بڑھا لیکن مجھ سے پہلے نظام نامی ایک سقہ مشک پھلا کر بادشاہ کی طرف بڑھا اور مشک کی مدد سے بادشاہ کو دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔

کنارے پہنچ کر بادشاہ نے سقے سے پوچھا: "تمھارا نام؟"

سقے نے جواب دیا: "نظام دین"

ہمایوں سر سے پیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر کہا: "تم ہمارے ساتھ آگرہ چلو، ہم اس عظیم خدمت کے صلے میں تمھیں دو دن ہندوستان پر حکومت کرنے کا موقع دیں گے۔"

بادشاہ میری وفاداری سے بہت متاثر تھا۔ راہ میں اس نے نظام سقہ کی بابت مجھ سے ایک عجیب منشیے کا اظہار کیا، اس نے مجھ سے کہا: "علی مرزا! کیا تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ نظام الدین واقعی ایک سقہ ہے؟"

میں نے تردد سے عرض کیا: اعلاحضرت مدشن ضمیر ہیں یہ ناچیز کیا عرض کر سکتا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "ہمارا خیال ہے یہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ تھے جو ہماری دستگیری فرمانے آئے تھے۔"

بے ہمایوں کی اس خوش عقیدگی پر میرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کیونکہ

ایوسیاں حد سے زیادہ غلبہ کرتی ہیں تو آدمی کو معجزات اور کرامات ہی سہارا دیتے ہیں۔
سفر میں مجھے ایک اور تجربہ بھی ہوا۔ بادشاہ جب کالپی سے گزرا تو وہاں کے حکمران
یا نذرانے لے کر حاضر ہوا۔ ان نذرانوں کی بابت بادشاہ کو یہ اطلاع ملی تھی کہ
انے تو بہت زیادہ تھے لیکن جب بادشاہ کی شکست کا اُسے علم ہوا تو اس نے نذرانوں کی
ار کم کر دی اور بادشاہ کی سرسری توقیر کی۔ بادشاہ کو اس خبر سے صدمہ پہنچا اُس نے
ڑے کے ساتھ نذرانے واپس کر دیئے اور آگرے روانہ ہو گیا۔

مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آگرے میں کامران مرزا بادشاہ بننے کی فکر میں
ست گزیں ہیں۔ میں نے تصور کی آنکھوں سے دونوں بھائیوں کو آپس میں دست بگریباں
کھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ کامران مرزا اور ہمایوں میں سے کسی ایک کا لاشہ زمین پر
ب رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ لاشہ بدقسمتی سے کامران مرزا کا نکلا تو میرا کیا حشر ہو گا۔
ش جیبی کو کس طرح حاصل کروں گا۔ درباری امرا جو میرے مخالف ہیں اور حاسد ہیں میرا کیا
شر کریں گے۔ یہ اندیشے مجھے پریشان کرنے لگے۔

ہمایوں نے آگرے پہنچنے سے پہلے مجھے ایک نصیحت کی۔ کہا: علی مرزا! تم
ب بات ہمیشہ یاد رکھنا جب دو بھائیوں میں رنجش ہو تو ان بھائیوں کے دوستوں اور
یتوں کو غیر جانبدار رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیوں کو ایسا نہ کرنے کی صورت میں ایک
بردست خطرہ موجود رہتا ہے۔"

میں بادشاہ سے آنکھ ملانے کی ہمت تو نہ رکھتا تھا لیکن جس طرح سکوت اختیار
یا اس میں بادشاہ کی بقیہ بات سننے کا اشتیاق پایا جاتا تھا۔ بادشاہ نے غالباً مجھ پر
ایک سرسری نظر ڈالی اور بات پوری کر دی۔ کہا: "دونا راض بھائی کسی وقت بھی ایک
ہو سکتے ہیں اور جب بھی ایک ہوں گے۔ نفاق پھیلانے والے دوستوں کی شامت
آجائے گی۔"

یہ بادشاہ کا اشارہ میری طرف تھا۔ بات قیمتی تھی میں نے گرہ میں باندھ لی اور
یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو آگرے پہنچ کر آکامرزا کی اس خطرناک خدمت سے سبکدوشی
حاصل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

آکامرزا باغ گلفشاں سے سرخ محل کے سہ پردے میں غافل بیٹھے تھے کہ

بادشاہ اپنے امرا کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، بادشاہ کے گھوڑے نے زور سے اپنے پاؤں پ
محل کے خدام بدحواسی میں بادشاہ کی طرف دوڑ پڑے اور بادشاہ کی رکاب پکڑی ابھی ہا
گھوڑے سے اترا بھی نہ تھا کہ میرا پردے سے آ کامرزا بدحواسی میں نکلا اور بادشاہ کے پا
چومنے لگا۔ ہمایوں گرتے گرتے بچا، گھوڑے سے اتر کر آ کامرزا کو سینے سے لگایا اور ا
پیشانی کو بوسہ دیا۔ میں ہمایوں کی پشت پر کھڑا تھا۔ آ کامرزا کا ہم آغوش ہمایوں کے کا
پر رکھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔

آ کامرزا اور ہندال مرزا نے جرم یکساں کیے تھے۔ لیکن ان دونوں میں فرق
تھا کہ ہندال مرزا بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر فرار ہو گیا تھا اور آ کامرزا نے حالات کا حوصلہ
مندی سے مقابلہ کیا تھا۔ اس موقع پر آ کامرزا نے جس غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا
نے مجھے چونکا دیا۔ آ کامرزا نے ہندال مرزا کی مغارتگری کے خود کو بچا لیا۔ کہا۔ "حضو
سلامت ہندالی مرزا نادان اور ناسمجھ ہے اس ناچیز کی خواہش ہے کہ حضور والا اسے معا
فرما دیں۔"

صاف دل ہمایوں نے جواب دیا۔ "ہم ہندال مرزا کی لغزش تمہاری وجہ سے
معاف کرتے ہیں اسے تنبیہ اور نصیحتیں کرو کہ آئندہ ان گستاخیوں کا مرتکب نہ ہو۔"

مشہور ماہرینِ نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب
احساسِ کمتری
اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ :-
● احساسِ کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔
● کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں
● کیا آپ واقعی احساسِ کمتری کا شکار ہیں یا صرف یہ آپ کا خیال ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صرف اس کتاب کے مطالعہ سے ہی آپ کا یہ احساس ختم ہو جائے
اسباب
تدارک
علاج
قیمت ۷۵ روپے
ڈاک خرچ ۱۶ روپے
مکتبہ نفسیات

اس کے بعد بادشاہ نے نظام سقہ کا آکا مرزا سے تعارف کرایا اور کہا کہ "ہم نے
سے وعدہ کیا ہے کہ اسے دو دن حکومت کرنے کی سعادت عطا کریں گے۔"
آکا مرزا نے ناگواری سے منہ بنایا' زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔
ہمایوں بہت تھکا ہوا تھا وہ آرام کرنے محل میں چلا گیا تو آکا مرزا مجھے محل کے
گوشے میں لے گیا۔
موتیا کی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ دوسرے پھولوں کی خوشبو بھی پھیلی ہوئی تھی
ن اس خوشبو میں ترشی، معلوم نہیں کیوں پائی جاتی تھی جس کمرے میں ہم دونوں بیٹھے
ے اس میں مرصع و منقش پائدی کا خطب (شمع دان) سر پر لٹکا ہوا یارہ شمعوں کی روشنی
سے رہا تھا۔
آکا مرزا نے پہلے تو مجھ سے شیر خان سے جنگ اور ناکامی کی تفصیلات سنیں، پھر
چھا: "کیا یہ درست ہے کہ اعلا حضرت ہمایوں نے ہمارے خطوط پکڑ لیتے تھے؟"
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
آکا مرزا بے چین ہو کر کھڑے ہو گئے، پھر پوچھا۔ "پھر؟ پھر کیا ہوا؟ حضرت
سلامت نے کیا فرمایا؟"
میں نے جواب دیا۔ "انہوں نے حیرت انگیز درگزر سے کام لیا!"
"افسوس!" آکا مرزا ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ تم اگر ذرا سی ہمت اور
ہوشیاری سے کام لیتے تو آج ہندوستان کے تخت و تاج پر ہمارا قبضہ ہوتا لیکن تم بزدلی
در بے وقوف نکلے!"
میرا خیال تھا آکا مرزا میری خدمات کو سراہیں گے لیکن جب وہ الٹی آنکھیں دکھانے
لگے تو مجھے بڑا غصہ آیا۔
آکا مرزا نے کہا۔ "کسی کو بڑا منصب یوں ہی نہیں ملتا، اس کے لیے بہت تدبر اور
بہادری کی ضرورت ہوتی ہے، اول تو تم نے نااہلی اور نالائقی سے خطوط پکڑوا دیے دوسرے
یہ کہ جب شکست کی افراتفری میں تمہیں اعلا حضرت کو قتل کر دینے کا موقع ملا تو تم نے کوتاہی
اور غفلت سے کام لیا جب حضرت سلامت دریا میں ڈبکیاں کھا رہے تھے اگر تم ذرا سی
ہوشمندی اور ہمت سے کام لیتے تو وہ کبھی بھی پانی کی سطح پر نمودار نہ ہوتے اور آج ہندوستان
کا تخت و تاج ہمارے قبضے میں ہوتا!"
میں نے تڑک کر جواب دیا۔ "اعلا حضرت حد درجہ شریف انسان ہیں پھر یہ

بھی سننے میں آیا ہے کہ بادشاہوں پر سات دلیوں کا سایہ ہوتا ہے اعلاحضرت بھی بادشاہ اور شاید انہیں بھی سات دلیوں کا سایہ حاصل ہے پھر میں انہیں کس طرح ہلاک سکتا تھا۔!"

آکامرزا نے غصے میں میرے رخسار پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔ طمانچے کی آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور اعلاحضرت خلاف توقع اندر داخل ہوئے۔ میں اپنا رخسار سہلانے آکامرزا گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

اعلاحضرت نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دریافت فرمایا۔ "یہ آواز کیسی آ تھی؟"

آکامرزا سے پہلے میں نے جواب دیا۔ "حضور والا! ایک مچھر دیر سے تنگ کر تھا، وہ بار بار میرے رخسار پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تنگ آ کر میں نے مچھر کو مارنے کے اپنے رخسار پر طمانچہ رسید کر لیا۔"

بادشاہ نے غور سے ہم دونوں کو یکے بعد دیگرے دیکھا اور ایک طویل ہ بھری۔

آکامرزا کی آنکھوں میں ممنونیت کا جذبہ سمٹ آیا۔

بادشاہ کے ہاتھ میں کاغذات کا پلندا دبا ہوا تھا۔ انہوں نے اچانک مجھ دریافت فرمایا۔ "علی مرتا! وہ لڑکی والی تصویر کہاں ہے؟"

میں شرم سے جواب نہ دے سکا۔

انہوں نے پھر سوال کیا۔ "تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

آکامرزا نے پوچھا۔ "اعلاحضرت کس تصویر کی بابت سوال فرما رہے ہیں

بادشاہ نے نہایت سادگی اور بھولپن سے پوری تفصیل بتا دی اور کہا۔ "کا مرزا! تمہارا یہ کہ (دودھ شریک) بڑا عاشق مزاج نوجوان ہے۔" پھر پوچھا۔ "کامران۔ وہ لڑکی تمہارے ساتھ آئی ہے؟"

آکامرزا نے فدویت سے جواب دیا۔ "کیوں؟ کیا اعلاحضرت کو یہ لڑکی پ ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "کون ہے جو اسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد پ نہیں کرے گا۔"

آکامرزا نے جواب دیا۔ "اعلاحضرت سیب آرام فرما کر اٹھیں گے روشن جبہ

یا قدس میں پیش کر دی جاتے گی ۔!"
میرے دل پر ایک گھونسا لگا اور مجھے بادشاہ سے زیادہ آکامرزا پر غصہ آیا
ہ سکتے تھے کہ روشن جبیں کسی کی امانت ہے اعلا حضرت اس کا خیال دل سے نکال
ن آکامرزا تو اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے پر آمادہ ہو گئے۔
بادشاہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رہے۔ اس کے بعد فرمایا۔
ن مرزا! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ شیر خان افغان ہم سب کے لئے خطرہ بن چکا ہے
م سب کے لئے اس وقت یہ ضروری ہے کہ آپس کی نااتفاقیاں ختم کر کے مل
رہیں!"
آکامرزا نے بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہا۔ "اعلا حضرت! یہ تو جانتے ہیں کہ
بعد ہم لوگ حضور والا کے نمک خوار اور پروردہ ہیں، جیسا حکم دیں گے اس پر عمل
یا جائے گا۔"
بادشاہ نے کہا۔ "کامران! ہم یہ چاہتے ہیں کہ پہلے شیر خان سے مقابلہ ہونا
ہیے!"
پھر مجھ سے کہا۔ "علی مرزا تیری وفاداری سے ہمارے دل پر بڑا اثر ہوا حالات اعتدال
جائیں پھر تجھے تیری خدمات کا خاطر خواہ انعام دیا جائے گا۔"
آکامرزا بادشاہ کی باتوں سے دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔
بادشاہ نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "کامران مرزا! کیا تم یہ عہد کرنے کو تیار ہو کہ تم
رہ سرکشی اور بغاوت نہیں کرو گے!"
آکامرزا نے جواب دیا۔ "اعلا حضرت کو کسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے ورنہ یہ خاکسار
ا بڑی جرأت کس طرح کر سکتا ہے!"
بادشاہ نے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات کا پلندا میز پر رکھ دیا اور واپس
تے ہوئے فرمایا۔ "ہم کل تمہیں باریابی کا شرف بخشیں گے اس وقت تم سے ہم بعض
م مشورے کریں گے!"
بادشاہ کے جاتے ہی آکامرزا نے اٹھا کاغذات پر قبضہ کر لیا اور انہیں کھول
کھول کر دیکھنا شروع کیا، اچانک آکامرزا کا چہرہ سفید پڑ گیا میں نے ان پُراسرار کاغذات
سرسری نظر سے دیکھا یہ آکامرزا کے وہ خطوط تھے جو انہوں نے مجھے اور بعض دوسرے
گوں کے نام لکھے تھے انہیں میں چند وہ خطوط بھی موجود تھے جن میں بادشاہ علامت

کو قتل کر دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ آکا مرزا لرز گئے وہ بادشاہ کی ایسا سمجھ چکے۔ ہمایوں نے اس طرح آکا مرزا کو یہ بات بتا دی تھی کہ وہ جو کچھ بھی اس کے خلا رہے ہیں بادشاہ اس سے باخبر ہیں۔

آکا مرزا کمرے سے نکل گئے لیکن پانچ منٹ بعد پھر واپس آ گئے بو مرزا! ہم یہ دیکھنے باہر گئے تھے کہ وہاں اعلا حضرت موجود تو نہیں، لیکن شاید وہ سو لیے خواب گاہ میں جا چکے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "بادشاہ کو ہماری مصروفیات کا پورا علم ہے اس بار آپ کا کیا خیال ہے کیا بادشاہ ہمیں ان باغیانہ خطوط کی سزا میں قتل نہیں کرا

آکا مرزا نے افسردگی سے جواب دیا۔ "کچھ پتہ نہیں کہ ہمارا کیا حشر ہوگا لیکن یہ نہیں کہ ہمارے لیے کوئی عبرت ناک سزا تجویز کی جائے۔"

میں نے کہا۔ "بادشاہ خواب گاہ میں آرام فرما رہے ہیں، کیا جوری سے ہمارا فرا مناسب نہیں ہے؟"

"بزدل کہیں کے۔" آکا مرزا نے غصے میں کہا۔ "ڈرتے کیوں ہو اگر ہمیں سزا ملی بھی سزا پاؤ گے۔"

میں نے دبے لفظوں میں پوچھا۔ "آکا مرزا! کیا بادشاہ سلامت روشن جبیں کو اپنے حرم میں ڈال لیں گے؟"

آکا مرزا نے جواب دیا۔ "کچھ بعید بھی نہیں۔"

میں نے معلوم نہیں کس طرح جوش میں عرض کیا۔ "آکا مرزا! اگر ایسا ہوا تو میں ہمیشہ کے لئے آپ لوگوں سے دستبرداری اختیار کر لوں گا۔"

آکا مرزا کے جی میں معلوم نہیں کیا آئی کہ انہوں نے نرمی سے کہا۔ "علی مرزا! بھی تم پر ظلم نہیں ہونے دیں گے اگر اعلا حضرت نے روشن جبیں کو قبول فرمانا چاہا تو اس سے پہلے ہی اس لڑکی کو تمہارے حوالے کر دیں گے پھر تم اسے جہاں بھی چاہو لے جا

جب میں آکا مرزا سے جدا ہونے لگا تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ "علی مرزا! ای سخت معرکے کے لئے تیار رہو، بس یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں کو آگرے کے تاج و تخت لئے اپنی اپنی جان کی آخری بازی لگا دینی ہے، اس کا نتیجہ جو کچھ بھی نکلے ہمیں ا کوئی پرواہ نہ ہونی چاہیئے۔ تخت یا تختۂ دار، جو بھی مقدر میں ہوگا مل کر رہے گا، تقا سے ڈرنا کیسا؟"

آکا مرزا میرے اس جھوٹ سے بہت خوش ہوئے تھے جو میں آکا مرزا کے طمانچے کی
شی کے سلسلے میں بول چکا تھا اور میرا پگھلتا ہوا اعتماد کسی حد تک پھر بحال ہو گیا تھا
ی نرمی اور درگزری نے اسے ذرا بھی ممنونِ احسان نہ کیا تھا۔ وہ اب بھی ہمایوں کی جگر اپنی
کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے مجھے پھر یہی ہدایت کی کہ میں کسی بھی طرح ہمایوں
سے ہٹانے کی کوشش سے غافل نہ رہوں۔"

بادشاہ نے نظام سقہ سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کا اعلان کیا۔ تمام امرا
ں کو حکم دیا گیا کہ وہ نظام سقہ کے حضور پیش ہوں اور آداب بادشاہی بجا لائیں۔ نظام
سر پر تاج رکھا اور تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو گیا، امرا اور شہزادے کورنش اور تسلیمات
ے۔ خود بادشاہ بھی ایک امیر کی حیثیت سے نظام سقہ کے روبرو دست بستہ کھڑا رہا۔
ی نظریں آکا مرزا کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں بادشاہ کا مقصد بھانپ گیا اور نزدیک خدمت
ذریعے بادشاہ کی قربت کا خواہاں ہوا۔ ہمایوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور پوچھا "کیا
ے کچھ کہنا چاہئے ہو؟"

میں نے آکا مرزا کا معذرت نامہ ہمایوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس چند سطری
ے میں تحریر تھا۔

"اعلاحضرت! ناچیز طبیعت کی خرابی کی وجہ سے حاضری دینے
سے قاصر ہے۔ اگر خاطر نازک پر گراں نہ گزرے اور اعلاحضرت ناچیز کو
اپنا ہمدرد اور بہی خواہ تصور فرماتے ہیں تو حقیر کی اس رائے سے ضرور
اتفاق فرمائیں گے کہ نظام سقہ جیسے مقرب شخص کو ردسری نشستیں
اور رعایتیں بھی دی جا سکتی تھیں اور یہ لازم نہ تھا کہ اسے تخت پر
بٹھایا جاتے اور خاص کر ایسی نازک گھڑی میں کہ شیر خان ہمارے
نزدیک آ چکا ہے، اعلاحضرت کی یہ حمایت حضرت اور نقصان کا سبب
بن سکتی ہے۔"

بادشاہ نے آکا مرزا کے اعتذار پر افسوس کیا، بولے "آخر ہمارے بھائیوں کو
ر گیا ہے کہ وہ ہمیشہ اختلاف کی روش اختیار کرتے ہیں۔!"

کئی دن تک آکا مرزا سے میری ملاقات نہ ہو سکی، میرا خیال تھا کہ وہ ضرور کسی
ش اور جوڑ توڑ میں مصروف ہوں گے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں اور بیماری
صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ میں نے آکا مرزا سے عاضری کی اجازت چاہی جو

باآسانی مل گئی۔ میں نے دیکھا منقش آہنی سی صہری پر آکامرزا داہنی کروٹ بیٹھے ہ
طبیب کو نبض دکھا رہے تھے۔ میں سامنے گیا اور نیازمندانہ آداب بجالایا۔ ہونٹوں پر
مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے عرض کیا۔ "آکامرزا! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی
سے بتاخیر مطلع ہوا۔"

آکامرزا نے افسوس سے کہا۔ "علی مرزا! ہم تو رآلا ہور واپس جانا چاہتے
تم اعلاحضرت سے بصد ادب ہماری طرف سے عرض کرو کہ وہ ہمیں آگرے سے نہ
نہ روکیں۔"

میں نے اپنی طرف سے بادشاہ کے خیال کی ترجمانی کی۔ میں نے کہا۔ "اعلا
کا خیال ہے کہ اس نازک موقع پر ہم سب کو اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت ہے۔"

آکامرزا نے زہریلی نظروں سے مجھے گھورا اور اپنے طبیب کو حکم دیا۔ "
بیان کیا جائے۔"

طبیب نے سر جھکا کر عرض کیا۔ "افسوس کہ حضور والا کو کھانے میں زہر د
ہے!"

آکامرزا نے کرخت آواز میں کہا۔ "ہمیں یہ زہر کون دے رہا ہے؟ اس کا ایک
جواب ہے۔ اعلاحضرت کی ایما پر محل سرا کی بیگمات کھانے میں زہر دے کر ہمیں ہلاک
دینا چاہتی ہیں!"

میرے جی میں آئی کہ میں بادشاہ کی نابینہ بیویوں اور آکامرزا کو بتا دوں
بادشاہ خطرناک باغیانہ اور سازشی خطوط کے پکڑے جانے پر عفو و درگزر سے کا
رہا ہو اسے کھانے میں زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں خاموش رہا کیوں کہ
تھا کہ شکی اور سازشی آکامرزا میرا کسی طرح بھی ہم خیال نہ بنے گا اور میں ایک بار پھ
اعتماد کھو دوں گا۔

آکامرزا نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "تم اعلاحضرت پر ہمارے خیالات کا
کرو اور ان سے کہو کہ ہم لاہور واپس جانا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی جتا دو کہ
اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔"

اس گفتگو کے دوران طبیب رخصت ہو گیا۔ میں بھی واپس آنا چاہتا تھا کہ
مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کا حکم دیا۔

ذرا دیر بعد آکامرزا کی بیگمات آنے لگیں۔ چونکہ میں آکامرزا سے ہمشیری

تھا اس لیے بیگمات مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں ان آنے والیوں میں وہ سرد
ر اور فتنہ سامان روشن جبیں بھی شامل تھی جس کی تصویر میں اپنے دل سے لگاتے
تھا اور جس کی وجہ سے میں تصویر پرستی کے الزام سے متہم ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی
عجیب حالت ہوگئی۔ میرا دل سینے میں یوں اچھلا جیسے وہ پسلیوں کا جنگلا توڑ کر باہر ہی
جائے گا۔

آکا مرزا میری حالت پر غور کر رہا تھا۔ شاید وہ مسکرایا بھی۔ روشن جبیں نے مجھ
ٹھنی سی نظر ڈالی اور آکا مرزا کی پائنتی جا کھڑی ہوئی۔ میں نے زیر لب چند اشعار پڑھے
کا مطلب تھا۔

"چند قدموں کا فاصلہ میرے حق میں ہزاروں میل کا فاصلہ
بن گیا ہے۔ خدا جب دل میں عشق کی آگ روشن کرتا ہے تو اس
نسبت سے دلداگی اور جنون میں بھی اضافہ ہونا چاہیئے کیونکہ جو
دل محبت کی تپش سے تر و تازہ گلزار ہو رہا ہو وہ جنوں اور دلداگی
کے بغیر ایسا ہے جیسے وہ گہرا سمندر جس کی موجوں میں اضطراب
اور تڑپ نہ ہو۔"

آکا مرزا نے مجھے اپنے قریب بلا کر دوبارہ اشعار پڑھنے کی خواہش کی۔ میں
سنا دیے۔ ان اشعار نے جادو کا کام کیا، اس نے روشن جبیں کو حکم دیا کہ وہ چند
لمحوں میرے ساتھ تخلیے میں گزار سکتی ہے۔ میں اسے اپنی قیام گاہ میں لے گیا۔ اس
وقت میں جتنا نوش تھا زندگی میں وہ خوشی دوبارہ میسر نہیں آئی۔ روشن جبیں نے
اپنے پر نیم تنا (واسکٹ) چست رکھا تھا سرخ نیم تنے کے کنارے سنہری تاروں سے زردوزی
کئے۔ اور سینے کے اوپر دونوں طرف روپہلے اور سنہری تاروں کی مدد سے گلاب کے
پھول بنائے گئے تھے۔

وہ مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ بدستور اداس رہی میں نے افسردگی کا سبب
پوچھا تو کہنے لگی "علی مرزا! تم اس وقت تک میرے دکھوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جب
تک تم خود میری جگہ نہ لے لو۔"

میں نے کہا "روشن جبیں! تم یقین کرو کہ میں تمہاری تصویر اپنے دل کے قریب
رکھتا ہوں ایک دن تنہائی میں، میں تمہاری تصویر سے ہم کلام تھا اور دلداگی میں بار
بار اس کے بوسے لے رہا تھا کہ کسی چغل خور نے اعلیٰحضرت سے شکایت کر دی کہ میں

مسلمان ہو کر بت پرستی کر رہا ہوں، بادشاہ نے تمہاری تصویر مجھ سے چھین کر اس چغل خ
کے حوالے کر دی اور اسے حکم دیا کہ یہ مقدمہ آگرے میں پیش کیا جائے یہ تو میری
خوش قسمتی تھی کہ شاید اعلا حضرت نے یہ حکم افیون کے نشے میں صادر فرمایا تھا کہ ہو
میں آتے ہی تمہاری تصویر مجھے واپس دلا دی اور اپنا حکم واپس لے لیا۔"

روشن جبیں نے بالکل غیر متعلق سی بات کی کہنے لگی "علی مرزا! میں کسی ایک
کی ہو جانا سپاہتی ہوں۔ مجھے اس بات سے بہت دکھ پہنچتا ہے کہ میں بظاہر تمہاری
قرار دی گئی ہوں لیکن تصرف میں تمہارے آقا مرزا کے رہتی ہوں اور اب یہ سننے میں آ
ہے کہ بادشاہ سلامت نے بھی مجھے یاد فرمایا ہے!"

روشن جبیں کی بات برے کی طرح دل میں لہرا گئی اور میری آنکھوں تلے
اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔ "روشن جبیں! تم نے جو کچھ کہا
کیا یہ سچ ہے؟"

روشن جبیں نے جواب دیا "کلام اللہ اٹھا لاؤ۔ میں یہی بات اسے ہاتھ میں
لے کر پھر سے دہرا دوں گی۔"

میں ایک دم اجالے سے تاریکی میں چلا گیا اور میرا دماغ بالکل اس لائق نہ رہا
ان حالات اور اس انکشاف کے بعد کیا کہنا یا کیا کرنا چاہیے؟

مجھے گم سم دیکھ کر روشن جبیں نے پوچھا۔ "تم کیا سوچنے لگے؟"

میں نے بے اختیاری اور مدہوشی میں جواب دیا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ
جبکہ تم میری نہیں رہیں، مجھے تمہارے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے؟"

روشن جبیں نے چیں بہ چیں ہو کر کہا۔ "عجیب انسان ہو تم بھی، کہاں تو مجھ
کا یہ دعوا کر رہے تھے کہ مجھے عورت سے خدا بنا دیا تھا اور کہاں یہ عالم ہے کہ مجھ
کنارہ کشی کی سوچ رہے ہو!"

میں نے پوچھا۔ "روشن جبیں! تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم سب سے زیادہ کسے
کرتی ہو؟"

اس نے کہا۔ "جو مجھے سب سے زیادہ چاہے گا اور عیش و آرام پہنچائے
میں اسی کو سب سے زیادہ چاہوں گی۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم ابھی تک کورے کاغذ کی طرح ہو جس پر کسی
تحریر کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔"

روشن جبیں نے جواب دیا۔ "ایسا ہی سمجھ لو۔"

میرا دل اچاٹ ہو گیا، میں نے اسے چلے جانے کا حکم دیا جس کی اس نے تعمیل کی اور مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ مجھے اس کی صحیح الدماغی ہونے لگا لیکن بعد میں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ محل حرم کے ماحول اور آقا مرزا کے ان نے اسے بگاڑ دیا ہے اور اب وہ اس لائق نہیں رہی کہ میں اس کی مالا جپتا رہوں اور گمان کی شکست نے مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا اور جی۔ میں آیا کہ میں سب کچھ کہیں بہت دور چلا جاؤں۔ مایوس انسان کی طرح یہ سوچ کر کہ اب کسے روشن جبیں تعلق رکھنا ہے جو بستر ہے اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے۔ میں دیر تک اپنا غم تا رہا۔ روشن جبیں نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ لیکن بالکل آخر میں جبکہ وہ جانے والی تھی کھلکھلا کر ہنس دی اور کہنے لگی۔ "علی مرزا! میں تمہیں عقلمند انسان تھی لیکن تم اس کے برعکس نکلے، اب تک میں نے جو کچھ کہا تھا۔ جھوٹ کہا تھا۔ میں آزما رہی تھی، یہ دیکھنے کے لئے کہ تم مجھے واقعی چاہتے ہو یا گپ مار رہے ہو۔ پتہ چلا ے سارے دعوے بس یوں ہی تھے۔"

میں پھر چکرا گیا اور افسردہ آواز میں کہا۔ "پتہ نہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے ہو ہے یہ بھی جھوٹ ہی ہو جسے تم سچ کی طرح باور کرا رہی ہو۔"

روشن جبیں ایک دم سنجیدہ ہو گئی، بولی۔ "تمہاری مرضی جو چاہو سمجھو۔ لیکن مجھے تم پسند ہو، اگر مجھے یہ اختیار دیا جائے کہ میں کسی ایک سے محبت کر کے اسے اپنا سکتی ہوں خص بے شک دشمن تم ہو گے۔"

میں نے اسے فرطِ محبت سے آغوش میں لے لیا۔ وہ بے زاری سے پیچھا چھڑانے دکھا۔ "تم نے مجھے مایوس کیا ہے علی مرزا! مجھے تمہارے یہ چونچلے اب اچھے نہیں

اسی طرح ہم دونوں کتنی گھنٹے تک یک جا رہے یہ بھی وہ روٹھتی میں مناتا کبھی میں لیتا اور وہ منا لے لگتی اور اس میں ہم دونوں نے اتنا مزہ اور لطف حاصل کیا کہ دو شاید محبت کی میٹھی سادی گفتگو میں نہ میسر آتا۔

بادشاہ کو آقا مرزا کے شبہات اور شاہی طبیب کی تشخیص کا پہلے ہی علم ہوا میرے آقا مرزا کے پاس پہنچے اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ "مرزا کامران! تم ان اندیشوں کو سے نکال دو اور تو اس کا اپنے دل میں خیال تک نہیں لا سکتے۔!"

آکامرزا خاموش رہے اور اعلاحضرت کی شکل دیکھتے رہے۔
اس دوران میں یہ خبر ملی کہ شیر خان قنوج تک آچکا ہے۔ بادشاہ نے آگرے کی حکومت آکامرزا کے حوالے کی اور خود اخواص لے کر شیر خان کے مقابلے پر پہنچ گئے۔ آکامرزا جیسے ہی یہ خبر ملی کہ بادشاہ نے کشتیوں کے پل کے ذریعے گنگا کو عبور کر لیا ہے، فوراً آگرہ چھوڑا اور اپنی سپاہ کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ عین میدانِ جنگ میں مجھے آکامرزا کا یہ خفیہ پیغام ملا کہ
"گزشتہ کوتاہیوں کو مت دہرانا۔ لاہور یا کابل میں روشن جبیں تمہارا انتظار کرے گی۔"
میں سمجھ گیا کہ اس طرح آکامرزا بادشاہ کو اکسا سے ہٹانے اور اس کے صلے میں روشن جبیں کے حاصل کرنے کا پیغام دے رہے تھے۔ دریائے گنگا کے کنارے بڑا زور کا رن پڑا جس میں بادشاہ کو شکست ہوگئی اور وہ بدقت تمام آگرے واپس پہنچے وہاں کے امرانے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ لاہور کا رخ کریں کیونکہ قنوج کے بعد شیر خان دوسرا قدم آگرے ہی میں ہوگا۔
بادشاہ فوراً لاہور روانہ ہوگئے اور شیر خان بھی موت کے سائے کی طرح اُن کے تعاقب میں لگا رہا۔ آکامرزا بادشاہ کی آمد سے پریشان ہوگیا اور اس کوشش میں لگ گیا کہ کسی طرح بادشاہ کو لاہور سے نکال باہر کریں۔ بادشاہ کامران مرزا کے باغ دل آویز میں ٹھہر گئے تھے۔ یہ باغ کامران مرزا نے دریائے راوی کے کنارے لگایا تھا۔ بادشاہ یہاں چین سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پتہ چلا شیر خان سرہند تک پہنچ چکا ہے۔
بادشاہ نے مشاورت کے حالم میں مجھے طلب کیا اور کہا۔ "علی مرزا! تم ایک بار بھی شیر خان کے پاس جا چکے ہو۔"
میں نے عرض کیا۔ "بے شک۔ کوئی نیا حکم؟"
بادشاہ نے کہا۔ "نیا حکم کرنے کو نہیں ہے بے سروسامانی کے حالم میں حکم کسے ہوش ہے!"
میں نے عرض کیا۔ "یہ ناچیز اعلاحضرت کا تابعدار ہے حکم فرمائیں یہ سر دے کر تعمیل بجالائے گا۔"
بادشاہ نے اسی وقت مظفر بیگ اور قاضی عبداللہ کو طلب کیا۔ یہ دونوں معزز امرا میں گنے جاتے تھے۔ بادشاہ نے شیر خان کو ایک خط لکھا۔

"شیر خان! تم کبھی دربار مغلیہ کے نمک خوار تھے اور اب ہمیں اپنا نمک خوار بنانے کی فکر میں ہو، شیر خان! خدا سے ڈرو، آخر تم اتنا ظلم کیوں کر رہے ہو؟ ہم نے تمہارے لئے پورا ہندوستان چھوڑ دیا ہے تم لاہور ہمارے لئے چھوڑ دو اور اس وقت سرہند میں جہاں تم ٹھیرے ہوتے ہو اسے ہمارے اور اپنے درمیان حد قرار دے لو!"

یہ خط بادشاہ نے ہمارے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اسی وقت شیر خان سے مل کر اس کا جواب لاؤ۔

ہم جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ آکا مرزا نے خفیہ طور پر مجھے ایک خط شیر خان کے نام دیا۔ اس میں آکا مرزا نے لکھا تھا کہ "شیر خان! تم نے ہم سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ صلح کر لو گے، بھائی ہمایوں ہندوستان سے رخصت ہونے دلے ہیں کیا تم اپنا وعدہ پورا کرنے میں تجاہل سے کام لے رہے ہو، یا کوئی اور مصلحت ہے؟"

میں نے آکا مرزا سے پوچھا۔ "آپ کی شیر خان سے بات چیت کب سے چل رہی ہے؟"

آکا مرزا نے سنسنی خیز انکشاف کیا۔ "جب ہم آگرے میں تھے، شیر خان نے ہمیں یہ یقین دلایا تھا کہ اگر ہم اعلا حضرت کا ساتھ نہ دیں اور اپنی فوج لے کر لاہور چلے جائیں تو شیر خان اس نرم رویے کے صلے میں ہمیں لاہور میں حکومت کرنے دے گا اور ہم سے مقابلہ نہیں کرے گا۔"

میں آکا مرزا اور بادشاہ کا پیغام لے کر سرہند پہنچ گیا۔ مظفر بیگ اور قاضی عبداللہ شیر خان کے روبرو پہنچ کر بہت زیادہ مرعوب ہو گئے۔ میں نے بدقت تمام اپنے بادشاہ کا پیغام شیر خان کو پہنچایا اور چپکے سے آکا مرزا کا پیغام بھی دے دیا۔ شیر خان نے اس کا فوراً جواب نہیں دیا، بلکہ یہ کہا کہ تم لوگ لاہور واپس جاؤ ہمارا آدمی جوابات لے کر خود ہی حاضر ہو جائے گا۔"

ہم لوگ واپس چلے آئے اور آکا مرزا اور بادشاہ بے چینی سے شیر خان کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور بادلوں کے مستانے شکرے اپنے پیٹ پھلاتے اڑتے پھر رہے تھے۔ بادشاہ باغ دل آویز کی بارہ دری میں موسم کا مزہ لے رہے تھے کہ خدام شاہی نے مطلع کیا۔ "شیر خانی خاصہ جوابات لے کر حاضر ہو گیا ہے!"

بادشاہ لفظ "جوابات" پر چونک پڑے انہوں نے اسی وقت یہ فرمان جاری کیا کہ شیر خانی جوابات کو سننے اور اس پر غور و خوض کرنے کے لئے فوراً ایک مجلس منعقد کی جائے جس میں سات سال سے لے کر ستر سال تک کے مرد شرکت کریں۔"

وہیں بارہ دری میں ہم سب جمع ہو گئے، شیر خانی قاصد ہمارے سامنے بلایا گیا اور اس نے وہ خط بادشاہ کے حوالے کر دیے۔ آکامرزا نہایت ہوشیاری سے فرار ہو کر اپنے "نو لکھا باغ" میں روپوش ہو گیا۔

بادشاہ کے خط کا جواب شیر خان نے دیا تھا۔ "تم سرہند کو حد فاصل بنانا چاہتے ہو، ہم تمہاری درخواست سترد تو نہیں کرنا چاہتے لیکن ہم نے تمہارے لئے کابل چھوڑ دیا ہے تم لاہور سے کابل چلے جاؤ!"

بادشاہ کو اس مختصر اور پر رعونت جواب پر غصہ تو بہت آیا لیکن قہر درویش بر جان درویش، کر بھی کیا سکتے تھے۔ فون کے گھونٹ اور صبر کا تلخ پھل حلق کے نیچے اتار لیا۔ اس کے بعد آکامرزا کے خط کا جواب پڑھا گیا شیر خان نے آکامرزا کو لکھا تھا:

"کامران مرزا! جب تک ہم نے آگرہ فتح نہیں کیا تھا حالات کچھ اور تھے اب حالات کچھ اور ہیں، چند دنوں کی بات ہے کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں میں گرے ہوگا ہمارا یہ مشورہ ہے کہ تم ہم سے جنگ آزما ہو کر بلاوجہ اپنی فوجی قوت کو نقصان نہ پہنچاؤ تم کابل چلے جاؤ، ہم وہاں نہیں آئیں گے!"

آکامرزا کی سازش کا بھانڈا پھوٹا تھا کہ مجلس کے جملہ ارکان "شرم شرم" کی آوازیں بلند کرنے لگے اور کسی قطعی رائے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجلس برخاست ہو گئی۔ بادشاہ نے شیر خانی قاصد کو، یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ ہم سب خدائی احکام کے پابند ہیں، اگر وہ یہی چاہتا ہے کہ ہم کابل چلے جائیں تو ضرور چلے جائیں گے لیکن چونکہ ہمیں ابھی خدا کے آخری فیصلے کا کوئی علم نہیں ہے اس لئے پوری قوت سے ہاتھ پیر مار کر یہاں رہنے کی کوشش کریں گے۔

بادشاہ دل برداشتہ ہو کر حرم میں چلے گئے۔ ایک دن اچانک بادشاہ نے مجھے یاد فرمایا جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں مجلس مشاورت جمی ہوئی ہے۔ بادشاہ کے بھائی مرزا ہندال بھی وہیں جو جود تھے اور ان کے چہرے کا کھنچا کھنچا پن بتاتا تھا کہ وہ کسی بات پر سخت برہم ہیں بادشاہ کے چہرے پر ملال کے اثرات تو ضرور تھے لیکن غصہ نہیں پایا جاتا

تھا۔

بادشاہ نے مجھے دیکھتے ہی اپنے قریب بلایا اور نہایت ملائمت سے سوال کیا "علی مرزا! دیکھو، مرزا کامران کے مقابلے میں ہم تم سے کہیں زیادہ وفاداری کا حق رکھتے ہیں، سچ سچ بتاؤ یہ مرزا کامران آخر چاہتا کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ "اعلاحضرت! یہ ناچیز بس اتنا ہی عرض کر سکتا ہے کہ جو سودا شیر خان کے دماغ میں سمایا ہوا ہے وہی آکامرزا بھی چاہتے ہیں اور جو ہوس حاصل ہے اس سے زیادہ کی ہوس انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے!"

مرزا ہندال نے طیش میں کہا۔ "اعلاحضرت! جب تک مرزا کامران کو عبرت ناک سزا نہیں دی جائے گی، شاہی افواج میں اتحاد اور یک جہتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور انہیں ہر محاذ پر شکست کا سامنا ہوگا!"

چند دوسرے شہزادوں نے بھی مرزا ہندال کے خیال کی تائید کی اور سر جھکاتے، فکر مند بادشاہ کے انداز سے یہ تشبہ گزرنے لگا کہ شاید آج مرزا کامران کے خلاف کوئی خطرناک فرمان صادر ہو کر رہے گا۔

مرزا ہندال نے مزید کہا۔ "شاید حضور والا کو اس بات کا علم نہیں کہ ہم سے جو لغزشیں یا گستاخیاں سرزد ہو چکی ہیں ان میں مرزا کامران کا ہاتھ ضرور موجود تھا، وہ نہیں چاہتا کہ اعلا حضرت بادشاہ کہلائیں، وہ اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے!" اور ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔ "اور خدا نے ہمیں یہ صریح حکم دے رکھا ہے کہ موذی کو ایذا پہنچانے سے پہلے قتل کر دو!"

ہمایوں نے بے چین ہو کر سر اٹھایا اور صاف اور صریح لہجے میں جواب دیا۔ "مرزا ہندال! باوا جان نے ہمیں یہ نصیحت کی تھی کہ بھائیوں کا خیال رکھنا اور ان کی بڑی سے بڑی غلطی سے درگزر کرنا۔ پھر ہم دو دن کی زندگی کو مرزا کامران کے خون سے داغ دار کیوں کر لیں۔ ہم مرزا کامران کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

بادشاہ کے اس دو ٹوک فیصلے نے ہم سب کو بہت متاثر کیا اور اس کی عظمت کا ہمیں دل و جان سے قائل ہونا پڑا۔

مرزا کامران کو خطرہ ہوا کہ بادشاہ سلامت کہیں کابل کا رخ نہ کر لیں اس نے بادشاہ کو اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی اور بالآخر بادشاہ کو بتائے بغیر اپنی فوج کے ساتھ کابل

روانہ ہو گیا اور دل میں یہ ارادہ کر کے گیا کہ اگر ہمایوں نے کابل کا رخ کیا تو انہیں بزورِ قوت روک دیا جائے گا۔

بادشاہ نے مایوس ہو کر واقعی کابل کا رخ کیا، ابھی وہ ہزارہ تک پہنچے تھے کہ مخبروں نے خبر دی، مرزا کامران مزاحمت اور مقابلے کی نیت سے واپس آ رہا ہے۔ بادشاہ کے ہمراہی پریشان ہو گئے اور انہوں نے دریافت کیا "کیا ہم سب بھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر مرزا کامران کا انتظار کریں؟"

ہمایوں نے جواب دیا "اس کی کوئی ضرورت نہیں، جب ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی تو خود ہی اس کے احکام صادر فرما دیں گے!"

بادشاہ کی نرمی سے لوگ دل برداشتہ اور مایوس ہونے لگے۔ بادشاہ زرہ بکتر پہنے ہوئے ہم حسب کے ساتھ نمودار ہوتے اور یہ سنسنی خیز خبر سنائی کہ "مرزا کامران آ چکا ہے اور اس نے بادشاہ کے قدم بوسی کی اجازت مانگی ہے!"

لوگ کچھ ہونے کے دھڑکے میں کسی اہم اعلان کی امید کرنے لگے۔

اس وقت میں بادشاہ کے قریب ہی تھا۔ آکا مرزا ایک طرف سے اچانک نمودار ہوا۔ اور بڑھ کر بادشاہ کے قدموں میں جھک گئے اور پنڈلیاں پکڑ کر آنسو بہانے لگے۔ بادشاہ نے اس کی پشت تھپتھپائی اور کہا "کامران مرزا! میرے بازو میری قوت، رونے کیوں ہو؟ آنکھ والے مردوں کی طرح آنسو پونچھ کر ہمارے روبرو کھڑے ہو جاؤ!"

سب ہاتھ پکڑ کر آکا مرزا کو اٹھایا گیا تو وہ ہچکیاں لے رہے تھے۔

بادشاہ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے اور پوچھا "کامران مرزا تم کیوں رو رہے ہو؟"

آکا مرزا نے تقریباً ہچکیوں میں جواب دیا "اعلا حضرت! ہندوستان کی آب و ہوا نے ہماری صحت بگاڑ دی ہے ایک تو صحت خراب ہے اس پر مسلسل جنگیں، ان پریشانیوں نے ہمیں عاجز کر رکھا ہے!"

بادشاہ نے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

آکا مرزا نے کہا "اعلا حضرت ہمیں کابل چلے جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں!"

بادشاہ نے جواب دیا "تم کابل جا سکتے ہو، اور کچھ؟"

آکا مرزا نے عرض کیا "حضرت فردوس مکانی (بابر) نے اپنی زندگی ہی میں کابل ہمارے والدہ کو دے دیا تھا اگر اسے جنگ و جدال سے محفوظ رکھا جاتے تو بڑا کرم ہوگا!"

بادشاہ کو آکامرزا کی اس درخواست نے پریشان کر دیا کہا "کامران مرزا! یہ بھی تو سوچو ہندوستان چھوڑنے کے بعد ہم سر کہاں چھپائیں گے؟"

بے حس اور خود غرض، کامرزا نے جواب دیا "اعلاحضرت کی فکر فلک گیر بس پناہ گاہیں لاش کر سکتی ہے، ایک کابل ہی پر کیا توقوف ہے!"

ہمایوں نے کہا۔ "کامران مرزا! کابل تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا، ہم تو ذرا دم لینے تیں گے اور لیں!"

لیکن آکامرزا کسی طرح بھی اس پر تیار نہ ہوتے کہ بادشاہ کابل جائیں، آخر کار بادشاہ نے کامران مرزا سے وعدہ کیا کہ وہ کابل نہیں جائیں گے اور وہ ہزارہ سے واپس ہو کو سندھ کی طرف چل پڑے۔ آکامرزا کابل چلے گئے۔ اور یہیں سے شاہی خاندان کے بعض دوسرے افراد کے ساتھ مرزا ہندال نے بھی بادشاہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مرزا ہندال گجرات چلے گئے۔ آکامرزا نے کابل کی راہ لی، ظاہر ہے روشن جبیں بھی ان کے ساتھ ہی ہو گی، یں بادشاہ کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب یں حالات کے ایک ایسے موڑ پر آچکا تھا جہاں مستقبل کا تعین کرنا بہت دشوار تھا، میرے سامنے یا تو اتھاہ تاریکیاں تھیں یا سنگلاخ، ویران میدان۔ بے برگ و گیاہ صحرا۔ بادشاہ نے مجھ سے کہا۔ "علی مرزا! اگر تم چاہو تو کامران مرزا کے پاس چلے جاؤ!"

یں نے جواب دیا۔ "اعلاحضرت! کابل کا گوشہ سکون و انبساط اپنے دامن یں ویسی عظمت نہیں رکھتا، جیسی مجھے آپ کی بے سروسامانی ہم رکابی یں حاصل رہے گی۔"

بادشاہ نے جیسی نظروں سے مجھے دیکھا، یں یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان یں میرے لیے شکر اور امتنان، احسان و اطمینان کا بے پایاں جذبہ موجود تھا۔

ہمایوں کی یہ داستان جو آپ پڑھ رہے ہیں، اس یں بڑی عبرتیں ہیں، اس یں انسان کی عظمت و رفعت پہلو بہ پہلو نمودار ہے۔ یں علی مرزا ہوں اس داستان کا راوی ہوں، پھول پر کانٹا ہوں، شروع سے آخر تک یں یہی چاہوں گا کہ دیانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور مجھے جو جیسا نظر آیا، اس کو اسی طرح پیش کر دیا جائے۔

جب بادشاہ بھکر یں داخل ہوا تو پتہ چلا، ہندال مرزا واپس آگیا ہے۔ شاہی خاندان نے شہزادے کی واپسی کی مژدہ یں اعلاحضرت کی خدمت یں حاضری دی، جو رقت

میں حمیدہ بانو بیگم بھی تھیں۔ یہ مرزا ہندال کی سسرالی عزیز تھیں۔ بادشاہ کو حمیدہ بانو بیگم بہت پسند آئیں، تاہم انہیں دیکھتے رہے پھر پوچھا۔ "ان کی تعریف؟"

کسی نے عرض کیا۔ "یہ میر بابا دوست کی صاحبزادی حمیدہ بانو بیگم ہیں!"

بادشاہ نے کہا۔ "میر بابا دوست ہمارے رشتہ دار ہوتے ہیں!" پھر بیگمات سے فرمایا۔ "ہمیں حمیدہ بانو بیگم پسند آگئی ہیں۔ ان کے بزرگوں سے کہو، انہیں ہمارے نکاح دے دیں!"

مرزا ہندال بگڑ گئے۔ تیور لوں پر بل ڈال کر بولے۔ "اعلاحضرت! اس لڑکی کو ہم اپنی بہن یا بیٹی تصور کرتے ہیں، آپ غریب الوطن بادشاہ ہیں ان حالات میں اگر لڑکی کو اچھی طرح نہ رکھ سکے تو کیا ہوگا؟"

بادشاہ کو میں نے پہلی بار ناراض اور خفا ہوتے دیکھا، وہ غصے میں اٹھے اور ایک طرف چلے گئے۔

مرزا ہندال کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، بادشاہ کو جاتے ہوئے اطمینان سے دیکھتے رہے۔

مرزا ہندال کی ماں نے بیٹے کو ڈانٹا کہ بادشاہ کو ناراض نہیں کرنا چاہیئے۔ انہوں نے بادشاہ کو نہایت تسلی آمیز خط لکھا اور اعلاحضرت کو یقین دلایا کہ وہ حمیدہ بانو بیگم کو بادشاہ سے شادی کر لینے پر آمادہ کر رہی ہیں لیکن حمیدہ بانو تیار نہیں ہو رہی ہیں۔ ایک دن بادشاہ سلامت نے تمام بیگمات کو اپنے گرد جمع کیا، شان دار محفل جمی لیکن اس محفل میں حمیدہ بانو نہیں پہنچیں، بادشاہ نے کسی بیگم کو حکم دیا کہ وہ حمیدہ بانو کو بھی بلا لائیں۔ جب انہیں بلایا گیا تو انہوں نے کہلوا بھیجا۔

"اعلاحضرت سے کہو کہ اگر اس ناچیز کی طلبی کو رسم و تسلیمات بجالانے کی غرض سے ہو رہی ہے تو لگے رہو میں یہ عزت حاصل کر چکی ہوں!"

اس بار بادشاہ نے مرزا ہندال کو حکم دیا۔ "مرزا ہندال! حمیدہ بانو تمہاری عزیزہ ہیں تم انہیں ہمارے دولت سرا لاؤ!"

مرزا ہندال تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور عرض کیا۔ "اعلاحضرت! حمیدہ بانو کہتی ہیں کہ بادشاہوں کو ایک بار دیکھ لینا تو جائز ہے لیکن بار بار دیکھنا جائز نہیں کیونکہ بادشاہ بھی نامحرموں میں آتے ہیں!"

بادشاہ نے ہنس کر جواب دیا۔ "اس شریف لڑکی سے کہو کہ اگر ہم نامحرم ہیں تو

یب محرم بھی بن جائیں گے وہ سامنے تو آتے۔"

یہ بالکل فطری بات ہے کہ بادشاہ کی طرف سے حمیدہ بانو کے لئے جتنا اشتیاق
رہا تھا مجھے اپنی روشن جبیں شدت سے یاد آرہی تھی۔ اپنی ناکامی اور مجبوری نے چولا
اور حاسدانہ روش اختیار کی۔ اس وقت میری سب سے بڑی یہ خواہش تھی کہ اسے کاش
اہ حمیدہ بانو کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

میں نے سنا، ہندال مرتا کی ماں چالیس دن تک حمیدہ بانو کے پیچھے پڑی رہیں
نہوں نے حمیدہ بانو سے کہا۔" بیٹی! یہ بات تو نہیں ہے کہ تم شادی ہی نہ کرو آخر کار
نہ کسی سے تو شادی کرو گی ہی، پھر بادشاہ سے بہتر کون آدمی ہوگا؟"

حمیدہ بانو برستور انکار کر رہی تھیں، بولیں۔" یقیناً میں کسی نہ کسی سے شادی ضرور
ں گی لیکن وہ ایک ایسا شخص ہوگا جس کا گریبان میرے ہاتھوں کی دسترس میں ہوگا
رے بادشاہ سلامت تو ان کا گریبان تو گریبان، دامن تک ہاتھ نہ پہنچیں گے!"

پھر معلوم نہیں کس طرح حمیدہ بانو شادی پر آمادہ ہو گئیں۔ بادشاہ نے اصطر
ہاتھ میں لے کر مبارک گھڑی کا انتخاب فرمایا اور میر ابوالبقا نامی ایک بزرگ کے ذریعے
ح پڑھوایا اور میر ابوالبقا کو دو لاکھ روپے بطور حق نکاحانہ عطا فرمائے۔ نکاح کے تین
بعد بھکر روانہ ہو گئے۔

بادشاہ اور حمیدہ بانو کا ملاپ میرے دل پر کوہ گراں بن کر گرا اور میری طبیعت
شاہ کی طرف سے اچاٹ ہو گئی۔ میں جلد از جلد آگرہ کے پاس چلا جانا چاہتا تھا لیکن
بادشاہ کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا اور وہ سندھ کے ریگستان میں بھٹکتے پھر رہے
جیسلمیر کے ہندو راجہ نے تو یہاں تک کوشش کی کہ بادشاہ کو اپنی اطاعت و احترام
قین دلا کر بلانا چاہا، اس کا ارادہ یہ تھا کہ جب بادشاہ اس کے قابو میں پھنس جائیں گے
وہ انہیں مرتضیٰ کر کے شیر شاہ کی خدمت میں روانہ کر دے گا اور اس طرح شیر شاہ کا
خاتمہ واصل کرے گا لیکن کسی طرح بادشاہ کو اس کے ارادوں کا علم ہو گیا اور وہ جیسلمیر
نے کے بجائے عمر کوٹ روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ بادشاہ کے آدمی
آدمیوں کو پکڑ لائے اور کہا۔" یہ دونوں جیسلمیر کے راجا کے جاسوس ہیں!"

ان دونوں کے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ بادشاہ سلامت نے اق
ے باز پرس شروع کی، ابھی سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ دونوں قیدیوں نے ہاتھ
جھٹکا دے کر خود کو رسیوں سے آزاد کر لیا اور بادشاہ کے آدمیوں کی کمروں سے تلواریں

کھینچ کر مار کاٹ شروع کر دی بادشاہ گھبرا کر پیچھے ہٹے لیکن اس کوشش میں ان کا گھوڑا مارا گیا۔ بادشاہ کے آدمیوں نے ان پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور ان دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ ابھی اس ناگہانی افتاد کا اثر کم بھی نہ ہوا تھا کہ شور اٹھا جیسلمیر کا راجا مال بادشاہ کو گرفتار کرنے آن پہنچا ہے۔ بادشاہ کا گھوڑا کام آچکا تھا۔ ایک گھوڑا حمیدہ کی سواری میں تھا، بادشاہ کے آدمیوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ بادشاہ نے تردی بیگ نامی ایک امیر سے درخواست کی کہ "ہمیں سواری کے لئے ایک گھوڑا دو۔"

لیکن تردی بیگ نے انکار کر دیا۔ بادشاہ پیشانی پر ناگواری کی شکن لائے بغیر ایک اونٹ کی طرف بڑھے اور حمیدہ بانو کو گھوڑے پر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ندیم بیگ نامی دوسرا امیر آگے بڑھا اور اپنا گھوڑا بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا اور پھر یہ آوارہ گرد درویشوں کا غافلہ عمرکوٹ کی طرف روانہ ہو گیا، راستے میں مالدیو کے آدمیوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ کے کسی تیر انداز کے تیر نے اتفاقیہ طور پر مالدیو کی سپاہ کے سردار کو زخمی کر کے گھوڑے سے گرا دیا جس سے اس کی سپاہ ڈر کر بھاگ گئی اور بادشاہ کا قافلہ عمرکوٹ پہنچ گیا۔

عمرکوٹ کا رانا بادشاہ کے استقبال کے لئے خود آیا اور نہایت عزت و احترام سے اپنے قلعے میں لے گیا اور بادشاہ کے آدمیوں کو قلعے کے باہر ہی رکھا۔

جیسا کہ میں پیچھے لکھ آیا ہوں کہ اب میں بادشاہ سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا مجھے بادشاہ کے ردِ شن مستقبل پر ذرا بھی یقین نہ رہا تھا میرا خیال تھا کہ اس دورِ غربت و مسافرت میں کسی جگہ بھی بادشاہ مارا جا سکتا تھا۔ جب میں نے بادشاہ سے رخصت کی اجازت چاہی تو انہوں نے دریافت کیا۔ "اب کہاں جاؤ گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں کابل جانا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ کچھ دیر متفکر رہے، پھر فرمایا۔ "اچھا، اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو ضرور ہمارے حالات بھی بڑے غیر یقینی ہیں اور پتہ نہیں کسی وقت کیا ہو جاتے؟" پھر بولے "ہم تم سے چند سوال کرنا چاہتے ہیں کیا تم ان کے جوابات خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ دو گے؟"

میں نے فدویانہ عرض کیا۔ "حضرت سلامت نے اب تک اس ناچیز پر جو کرم فرمائی ہے وہ مجھے، اگر چاہوں بھی تو جھوٹ نہ بولنے دے گی۔"

دشاہ خوش ہوگیا اور کہا۔" کامران ہمارا بھائی ہے اور ہم تمہارے بادشاہ ہیں تم
کر (دودھ شریک) ہو۔ اب ہمیں یہ بتاؤ کہ اگر کوئی دقت پڑے تو تم کس کا ساتھ
ان کا یا ہمارا؟"

یں پریشان ہوگیا، جواب کے ایک طرف کنواں تھا تو دوسری طرف کھائی۔ اگر میں
حق میں جواب دیتا جو میرا کو کہ تھا تو بادشاہ کی ناراضی کا خطرہ تھا اور اگر حقوق
شاہ کی حمایت میں جواب دیتا تو شریف النفس بادشاہ شاید یہ سوچنے لگتا کہ جو اپنے
وا وہ کسی اور کا کس طرح ہوگا۔ اچانک دھیان کی روشنی عقل کی گمراہی پر غالب
ں نے جواب دیا۔" اعلاحضرت! رسول اللہؐ کی حدیث ہے کہ مسلمان تم اپنے
مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم اور جب کسی نے یہ پوچھا تھا کہ ظالم کی مدد
ج کی جاتے ؟ تو آپ نے جواب دیا تھا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک
ے!"

بادشاہ میرے جواب سے بہت خوش ہوئے اور مجھے واپسی کی اجازت دیتے
یا۔" ہماری پھوپی کو اپنے ساتھ لے جاؤ، وہ کامران کو راہ راست پر لانے کی
کریں گی۔"

یں بادشاہ کی پھوپی شاہزادہ بیگم کو لے کر کابل روانہ ہوگیا۔ اس وقت جہاں
شاہ کی ہم نشینی چھوٹنے کا غم تھا وہیں یہ خوشی بھی تھی کہ میں حمیدہ بانو اور بادشاہ
رت ملاپ کی تلخی سے محفوظ ہوگیا تھا۔

مجھے ملتے ہی میں اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ آکا مرزا حیدر مرزا ہندال کے علاقے
ر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ قندھار کے حکمران قراچہ خاں نے از راہ نوازش
شاہ نوازی اپنے ایک مکتوب کے ذریعے قندھار کی حکومت مرزا ہندال کو
دی تھی لیکن آکا مرزا اس فکر میں تھے کہ قندھار بھی اپنے قبضے میں کر لیا جائے۔

حضرت بادشاہ کی پھوپی شاہزادہ بیگم نے مجھے حکم دیا کہ" کابل کے بجائے قندھار
یں وہیں کامران مرزا کو بلا کر دونوں بھائیوں (آکا مرزا اور مرزا ہندال) میں اتحاد کرا
ی۔"

ہم بدقت تمام قندھار پہنچ گئے۔ عسکری مرزا، آکا مرزا کے حکم پر اس کا محاصرہ
ہوئے تھا۔ ہمیں قندھار میں داخلے کی اجازت نہیں ملی باہر ہی روک لیا گیا۔ عسکری مرزا
پھوپی کی خدمت میں آداب بجا لایا، شاہزادہ بیگم (پھوپی) نے عسکری مرزا کو حکم دیا کہ

"کامران مرزا کو ذرا بُلاؤ، میں اُس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

چوتھے دن آکامرزا بھی حاضر ہو گئے۔ وہ خانزادہ بیگم سے ادب و احترام سے ملے لیکن مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ خانزادہ بیگم انہیں خلوت میں لے گئیں اور کم تک سمجھاتی رہیں جس کا تفصیلی علم نہ ہو سکا بعد میں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ آکامرزا کو اخلاص کی تلقین کرتی رہیں اور آکامرزا اس پر مصر رہے کہ کابل کی طرح قندھار میں بھی نام کا خطبہ پڑھا جائے۔

پھر آکامرزا اور خانزادہ بیگم میں زور زور سے باتیں ہونے لگیں۔ خانزادہ رہی تھیں۔ "کامران! اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو میں یہی کہوں گی کہ ہمایوں کی بادشاہ فیصلہ خود فردوس مکانی (بابر) فرما گئے ہیں اور ایک عرصے تک تم خود بھی اسی کے نا پڑھتے رہے ہو، تمہیں اب بھی ہمایوں کو اپنا بڑا سمجھنا چاہیئے، اس کی فرماں برداری کر اسی میں ہم سب کی نجات ہے۔"

آکامرزا اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ بولے "آپ کا ارشاد بجا لیکن ا یہاں سے بہت دور ہیں سردست ہمارے ہی نام کا خطبہ پڑھ دیا جائے پھر جب آجائیں گے تو ان کے نام کا خطبہ شروع کرا دیا جائے گا۔"

شاید دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ آکامرزا منہ بناتے ہوئے اور مجھے ایک بار پھر خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھے اپنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے ایک دوسرے خیمے میں لے گئے۔ اُن کے تیور ہی سے میں نے اپنا کا فیصلہ پڑھ لیا تھا۔

وہ خود تو بیٹھ گئے لیکن مجھے کھڑا رکھا۔ بولے "ہم نے تو یہی چاہا تھا کہ تجھے اعلا منصب پر فائز کر دیں لیکن تو کوتاہ اندیش، کم ہمت اور بزدل ہے، تو نے اپنی عم بہترین حصہ بلاوجہ ضائع کر دیا، اگر ہم تجھ سے یہ سوال کریں کہ تو نے اپنے منصوبے کو کس تک پایۂ تکمیل کو پہنچایا تو تو اس کا کیا جواب دے گا؟"

میں نے جواب دیا "آکامرزا! عملاً بادشاہ کا کام تمام ہو چکا ہے اور جسے ذلیل کر چکا ہو اسے انسان کیوں ذلیل کرے؟"

آکامرزا نے شاہانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ اُن کے اطوار اور باتوں سے کم شخص بھی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ آکامرزا میں ایک بادشاہ کا سزاج جلوہ گر ہے، اُن درشت اور شاہانہ تھا۔ انہوں نے مجھے برا بھلا کہنا شروع اور صاف صاف جتا

اس وقت تو دنیا کا بدقسمت ترین انسان ہے کیونکہ تو نہ تو آوارہ گرد ہمایوں کا
ل کر سکا اور نہ ہی ہماری نظر میں معتمد رہا۔ ہم تجھے شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور
آزاد رہنا ہمارے لیے خطرے کا موجب ہے۔"
اس کے بعد انہوں نے تانی بجائی اور مجھے چند سپاہیوں کے حوالے کرتے ہوئے
لے کابل کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔"
اس خلاف توقع حکم نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ اسی وقت ان سپاہیوں نے
ا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

آہ، میں ان اذیتوں کو کن لفظوں میں بیان کروں جو مجھے آگرہ کی طرف سے
گئیں۔ وہ تمام قدرتی نعمتیں، جنہیں انسان کوئی قیمت ادا کیے بغیر حاصل کر لیتا
ے ان سے محروم کر دیا گیا۔ روشنی۔ میں ایک عرصے تک اس سے محروم رہا، ہوا۔
ریک کوٹھری کی گھٹن میں، میں ایک ایک جھونکے کو ترس گیا۔ ہم جنسوں کی آوازیں
پتہ نہ تھا کہ میں اب بھی انسانوں کی دنیا میں ہوں یا گوشۂ قبر میں نکیرین کا منتظر
انی۔ نیم گرم پانی نے میرے معدے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ کھانا۔ جو بھی ملتا اس
لذت ہوتی اور نہ مقدار میں اتنا ہوتا کہ میں پیٹ بھر سکتا۔ ایک مدھم سی شمع یوں
ہتی جیسے تاریک ترین رات میں آسمان پر منجمد اور کمزور سا ایک تنہا ستارہ۔ مجھے
نیا کا کچھ پتہ نہ تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ شب و روز کا تصور تک ختم ہو چکا تھا،
ری اس کمرے کی مانند تھی جہاں ہمیشہ رات رہتی ہو۔ اس ماحول نے میرے جملہ
کو متاثر کیا، ماضی کی یادیں اور ان کا تصور میرے حق میں کتاب کی طرح تھا جسے
ہیں دل بہلانے کی کوشش کرتا رہتا۔ نا معلوم لیکن تاریک خیالی مستقبل قبر کی طرح
ے سامنے کھڑا تھا اور میں چیونٹی کی چال سے زندگی کا سفر طے کرتا اس کی طرف
لا جا رہا تھا۔
ایک دن خلاف معمول آگرہ کی آواز سنائی دی، وہ ایک سایے کی طرح سامنے
مجھ سے مخاطب تھے۔
"علی مرزا کیا تیرے ہوش و حواس اب بھی کام کر رہے ہیں؟"
میرا دل اس حد تک بجھ چکا تھا کہ اس آواز نے نہ تو مجھے خوش کیا نہ مشتعل۔

آکا مرزا نے کہا۔ "کیا تو یہاں سے نکلنا پسند کرے گا؟"
میں نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "میں موت کا منتظر ہوں آکا مرزا! آپ جائیں اور مجھے مرجانے دیں۔"
وہ ہنسے اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ مجھ سے کہتے رہے۔ سورج کی روشنی میں میری آنکھیں کام نہیں کر رہی تھیں اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری بصارت بہت زیادہ زائل ہو چکی ہے۔ میرے قدم لڑکھڑا کر چلنے کی عادت بھلا چکے تھے۔ کئی جگہ میں گرتے گرتے بچا۔
آکا مرزا مجھے ایک نہایت پُرتکلف کمرے میں لے گئے، مجھے وہاں دھندلی دھندلی نظر آئی تھی، اور تو یہ ہے کہ روشن جبیں دیر تک وہاں موجود ہیں اسے پہچاننے تک سے قاصر رہا۔ آکا مرزا نے لذیذ ترین کھانے میرے سامنے لیکن میری اشتہا تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ جب میں نے کھانے سے بھی منہ موڑ لیا آکا مرزا کو پہلی بار اپنے ظلم و جور کا احساس ہوا اور شاید اپنی اس زیادتی پر پشیمان ہوتے، بولے "علی مرزا! غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں، تم پر جو کچھ بیتی اس میں مرضی ہرگز شامل نہ تھی۔ ہم تو ادھر اُدھر مہمات میں اُلجھے رہے اور تم قید تنہائی میں لیکن ہم جیسے ہی واپس آئے پہلے تمہارے پاس پہنچے۔" پھر روشن جبیں کو آواز دی "روشن جبیں! کیا تم نے بھی علی مرزا کو نہیں پہچانا؟ اِدھر آؤ آنکھ کے قریب۔ بینائی کو شاید تاریکی کھا گئی ہے۔"
روشن جبیں دبے بالکل میرے قریب آگئی تو میں نے بھی اسے پہچانا۔ کی مغائرت اور اجنبیت کی روشنی سے مجھے یہ احساس گزرا کہ شاید وہ بھی اس کر نہ پہچاننے ہی میں بہتری محسوس کر رہی ہے۔
آکا مرزا نے کہا۔ "علی مرزا! اگر تم چاہو تو روشن جبیں کے ساتھ کچھ گزار لو۔"
میں نے افسردگی سے جواب دیا۔ "نہیں اب میں اس کی ضرورت محسوس کرتا۔"
آکا مرزا نے بھی مزید اصرار نہیں کیا اور سر کے اشارے سے روشن جبیں جانے کا حکم دیا۔
تنہائی میں آکا مرزا دیر تک تسلی دلاسے دیتے رہے، انہوں نے

کہ میرے جو اعضا بھی متاثر ہوتے ہیں وہ شاہی طبیب سے اُن کی پچھلی توانائی بحال کرا
گئے۔ وہ کئی دن بعد حرفِ مطلب زبان پر لاتے بولے۔ "علی مرزا! تم ہمارے دودھ
ب ہو اور یہ دودھ ہی کا اثر ہے کہ ہم تمہیں اس کال کوٹھڑی سے باہر نکال لائے۔ کہ کہ
یثیت سے تم پر ایک فرض حائد ہوتا ہے کیا تم اسے پورا کرنے پر آمادہ ہو؟"
میں نے زبان کے بجائے آنکھوں سے پوچھا۔ "وہ کیا؟"
آکا مرزا چبا چبا کر بولے۔ "ہمایوں ایران پہنچ چکا ہے اور طہماسپ صفوی سے
د کا طالب ہے، حالانکہ تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے خود ہی ہم سے یہ کہا تھا کہ عملاً ہمایوں کا
م تمام ہو چکا ہے اب اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن وہ تو
ت ہی سخت جان نکلا علی مرزا۔ ہمیں ڈر ہے کہ صفوی بادشاہ اسے مدد دے کر پھر سے
دشاہ نہ بنا دے، اب ہمیں ایک جنگ لڑنی ہے جو ہتھیاروں سے نہیں باتوں سے لڑی
ائے گی!"
آکا مرزا اپنی باتوں کا تاثر جانچنے کے لیے رکے اور تیز نظروں سے میرا چہرہ
یکھنے لگے لیکن اس وقت میرا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ انہوں نے پوچھا۔
علی مرزا! کیا تم ہماری باتیں سن رہے ہو؟ کیا تمہاری قوتِ سماعت صحیح کام کر رہی
ہے؟"
میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "ابھی میں بہرا نہیں ہوا!"
آکا مرزا نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم بہرے نہیں ہوئے، ہاں تو ہم یہ کہہ رہے
تھے کہ تم ایران چلے جاؤ، ہمایوں سے ملو اور اسے ہمارے جبر و ظلم کی داستان سنا کر اپنے
اعتماد میں لے لو، یہاں تک پہنچ جاؤ تب تم نہایت ہوشیاری سے کسی بھی طرح صفوی
حکمران کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنا کہ ہمایوں ایک نااہل انسان ہے اسے کسی قسم کی
بھی مدد دینا، اپنی دولت اور آدمیوں کا نقصان کرنا ہے صفوی بادشاہ کو ہر قیمت پر ہمایوں
کی دستگیری سے روکنا ہے۔"
میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گم سم پاگل کی طرح اُن کی صورت دیکھتا رہا۔
دھندلی دھندلی سی نظر آتی صورت۔
آکا مرزا نے پھر سوال کیا۔ "علی مرزا! تمہارے ہوش و حواس صحیح کام کر رہے
ہیں؟"
میں نے پھر جواب دیا کہ "ہاں ابھی میں پاگل نہیں ہوا۔"

آکا مرزا نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم پاگل نہیں ہوئے۔ تب پھر تم کب تک ایران چلے جاؤ گے۔ جب تم اپنے منصوبے میں کامیاب ہو کر واپس لوٹو گے تو قندھار حکومت تمہیں خوش آمدید کہے گی۔ اور روشن جبیں، اپنی دس حسین دوشیزاؤں کے ہاتھ اپنی مسکراہٹ سے تمہارا استقبال کرے گی!"

شاید پہلی بار میں مسکرایا اور اس گونگے کی طرح زبان کھولی، جو بولتے بولتے ایک دم، مدتِ مدید کے لئے خاموش ہو گیا ہو، اور سالہا سال کے بعد وہ پھر بولنے مجبور کر دیا گیا ہو۔ میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "آکا مرزا! گو کہ مجھ پر بڑے ظلم ڈھائے لیکن تم میرے دودھ شریک بھائی ہو۔ میں اب بھی تمہارا وفادار ہوں، مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تمہارے دل میں میرے لیے جو شکوک اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں دور ہو گئیں۔"

"اوہ ہمارے بھائی علی مرزا!" یہ کہہ کر آکا مرزا مجھ سے لپٹ گئے اور وہ تک میری پیشانی اور رخساروں کے بوسے لیتے رہے، میں نے بھی گرم جوشی سے یہی عمل دہرایا۔

اب میرے دل سے آکا مرزا کا احترام نکل چکا تھا اب وہ میری نظر میں ایک بدترین خلائق انسان تھا۔

آکا مرزا نے میری طرح کی اور آدمی بھی اس منصوبے پر کام کرنے کے لیے ایران بھیج دیے تھے۔ جب مجھے بادشاہ ہمایوں کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ کچھ دیر تک مجھے پہچان ہی نہ سکے۔ جب میں نے آکا مرزا کے ظلم و جور کی داستان سنا کر بادشاہ سے اپنا تعارف کرایا تو انہیں بڑا افسوس ہوا۔ بولے۔ "کامران کو یہ ہو کیا گیا ہے، ہمیں یقین ہے کہ ظلم کی ناؤ، جس میں وہ سفر کر رہا ہے، ایک نہ ایک دن اسے ضرور لے ڈوبے گی اب میں واقعی بادشاہ کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا، میں نے اپنی آمد کی غرض غایت بتا کر بادشاہ سے عرض کیا۔

"اعلا حضرت! اب بہت زیادہ ہوشیاری کی ضرورت ہے، آکا مرزا کے کئی آدمی اسی مقصد سے ایران آتے ہیں کہ شاہ صفوی کو حتی الامکان آپ کی امداد و اعانت سے باز رکھیں۔"

بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوپہر کے کھانے پر بادشاہ کے ساتھ مجھے بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا شاہ طہماسپ صفوی ہمارا میزبان تھا۔ ایرانی امرا

صف میں موقب ہمارے روبرو کھڑے تھے۔

صفوی بادشاہ نے ہمارے بادشاہ سے اچانک سوال کیا: "ہم حیران ہیں کہ آپ
اعظیم حکمراں کس طرح اپنے کمزور دشمن سے شکست کھا گیا؟ شیر خان ایک معمولی امیر
یہ سلطنت پر آخر کس طرح غالب آگیا؟"

ہمارے بادشاہ نے آزردگی سے جواب دیا: "بھائیوں کا نفاق شیر خان کی مدد پر
جس سے وہ جیت گیا۔"

صفوی حکمراں نے چونکا دینے والا سوال کیا: "کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کا اپنے
یوں کے ساتھ سلوک اچھا نہ رہا ہو اور یہ کہ اب تک آپ ان کے ساتھ جس طرح پیش
تے رہے ہیں وہ ناپسندیدہ ہو؟"

ہمارے بادشاہ نے جواب دیا: "ہاں یہ ہماری نرمی اور مروت ہی تو تھی جس نے
یں سر اٹھانے کا موقع دیا اگر ہم انہیں بھائی کی جگہ سرکش اور باغی سمجھتے اور ان سے
ا ہی سلوک روا رکھتے تو شاید آج ہمیں یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔"

صفوی بادشاہ نے اپنے رو برو کھڑے ہوئے چھوٹے بھائی بہرام میرزا کو
رے سے حکم دیا کہ وہ آگے بڑھے اور طشت لے کر آگے بڑھے اور بادشاہ کے ہاتھ
ھلائے۔

شہزاد بہرام میرزا ادبی غلام کی طرح آگے بڑھا اور بادشاہ کے ہاتھ دھلانے لگا
وی بادشاہ نے آنکھ کے اشارے سے بہرام میرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے
شاہ سے کہا۔ "بھائیوں کو اس طرح رکھنا چاہیئے!"

بہرام میرزا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ شاہ بدر سے اس بات سے بہت دکھ پہنچا
آکا مرزا کے شاط بھی کسی طرح اس واقعے سے آگاہ ہو گئے اور انہوں نے بہرام میرزا
س بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی بھی طرح طہماسپ صفوی کو ہرایوں سے دست کشی پر
وہ کر لے۔ چنانچہ تنہائی میں یہ آیا کہ بہرام میرزا نے کئی بار اپنے بڑے بھائی کو یہ یقین دلانے
وشش کی کہ "ہندوستان جیسے پڑوسی ملک پر امیر تیمور کی اولاد کی مضبوط حکومت ایران
یئے ہمیشہ خطرے کا باعث رہے گی۔"

لیکن شاہ طہماسپ نے کسی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔ اس نے ہمارے بادشاہ کو ایک
ارہ دعوت دی، سات دن تک اس ضیافت کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ چھ سو شاہیانے نصب
ئے گئے اور بارہ مقامات پر شادیانے اور نقارے آٹھوں پہر بجتے رہے۔ شاہیانوں کے

نیچے نہایت قیمتی شاہی دریاں بچھائی گئیں۔ پہلے دن تو محض کھانے پینے تک ہی گرم
محفل رہی، دوسرے دن شاہانہ خلعت، مرصع شمشیر اور مرصع خنجر عطا ہوتے اور صفوی
حکمران نے ہمارے بادشاہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اس تقریب میں جو اشیاء بھی مو
تھیں، ہمارے بادشاہ کو عطا کر دی گئیں۔ خیمے، چادر، قالین، گھوڑے، اونٹ اور خچر
بلند مقام پر جمع کر دیے گئے سلطنت اور لازمہ سلطنت میں جو چیزیں بھی آتی ہیں
سب ہمارے بادشاہ کو عطا ہوئیں۔ شاہ صفوی نے اپنے بیٹے سمیت بارہ ہزار سواروں کی فو
مرحمت فرمائی اور کہا کہ اور سامان بھی مزاہم کیا جائے گا۔

پھر صفوی بادشاہ کھڑا ہو گیا۔ ہمارا بادشاہ بھی احتراماً کھڑا ہوا۔ صفوی بادشاہ
اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور ہمارے بادشاہ سے کہا۔ "ہمایوں بادشاہ! آپ کے لئے یہاں
کوئی کمی نہیں۔"

ادھر سے فارغ ہو کر بادشاہ قندھار پر حملہ آور ہوا۔ اور اسے فتح کر کے کابل
روانہ ہو گیا۔ عمر کوٹ میں حمیدہ بانو سے بادشاہ کا ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا بادشاہ
جلال الدین اکبر نام رکھا تھا۔ ان دنوں یہ شہزادہ آکامرزا کے قبضے میں تھا اس نے شہزادے
قلعے کی فصیل پر عین اسی جگہ بٹھا دیا جہاں گولہ باری ہو رہی تھی لیکن جسے اللہ رکھے
اسے کون چکھے۔ مستقبل کے بادشاہ ہر حملات دشمنوں کا سایہ بنا رہا۔ بادشاہ نے کا
بھی فتح کر لیا۔ آکامرزا اپنے کئے کے حاتھ بچ نکلا۔

بادشاہ آکامرزا کا تعاقب کرتا رہا۔ آخر تنگ آکر اس نے بادشاہ سے رحم کی
درخواست کی۔ بادشاہ نے اسے پھر معاف کر دیا اور اپنے روبرو حاضر ہونے کا حکم د
ان دنوں بادشاہ جلال آباد کے شمال میں تالیقان کے قلعے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میر خان
کاصد بادشاہ کی خدمت میں عرض پرداز ہوا کہ "مرزا کامران حاضری کا خواستگار
ہے۔"

بادشاہ نے بے چینی سے جواب دیا۔ "حاضر کرو۔"

قاصد کے جاتے ہی بادشاہ نے ایک دربان جاری کیا کہ "مرزا کامران آ رہا ہے
دندا اور اتمرا اس کے استقبال کو آگے بڑھیں اور خوشی کے نقارے بجائے جائیں۔"
نقاروں اور فلاریانوں کی آوازوں میں آکامرزا سمودار ہوا تو زراغ اور اتمرا
کے آس پاس اس کے استقبال کو کھڑے تھے جب وہ ان کے بیچ سے گزر کر اس جگہ
پہنچا جہاں مرزا ہندال بیٹھا تھا تو آکامرزا نے وہیں بیٹھ جانا چاہا لیکن بادشاہ نے

حکم دیا۔ "وہاں نہیں، تم ہمارے قریب آؤ۔"
آکامرزا نے ایک امیر کی کمر سے رومال کھول لیا اور اسے اپنی گردن میں ڈال کر لگا لی۔ اس طرح وہ خود کو بادشاہ کا قیدی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔
جب وہ بادشاہ کے قریب پہنچا تو بادشاہ نے رومال کو کھول کر پھینک دیا اور کہا۔ مران مرزا، تم ہمارے بھائی ہو، قیدی نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں!"
اس کے بعد آکامرزا کو گلے سے لگا لیا۔ پھر مٹرتبت طلب کیا اور نصف پی کر بقیہ مرزا کو پلا دیا۔
بادشاہ نے اس موقع پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ آکامرزا کی مضطرب نظریں شاید ے تلاش کر رہی تھیں اور جب انہوں نے مجھے پا لیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ آکامرزا اب راہ راست پر نہیں آیا۔
کئی دن بعد بادشاہ نے کامران مرزا کو کولاب کا قلعہ مرحمت فرمایا۔ آکامرزا بادشاہ سے رخصت ہو کر کولاب چلا گیا اور ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اطلاع آئی کہ آکامرزا ے بادشاہ کے علاقوں پر تاخت و تاراج شروع کر رکھی ہے۔ بادشاہ نے پریشان ہو کر امرزا سے کہلایا کہ۔ "اب تم یہ کیا کر رہے ہو! اگر تم اور علاقہ چاہتے ہو تو ہم وہ بھی دے ں گے!"
آکامرزا نے اسکا یہ جواب دیا کہ "اعلاحضرت! غلام نے فقیری اختیار کر لی ہے، ے اب سلطنت سے کوئی سروکار نہیں۔" لیکن اطلاعیں برابر یہی آتی رہیں کہ تارک الدنیا کامرزا لوٹ مار کا ایک بازار گرم کیے ہوئے ہے۔
اور ایک بار پھر جنگ و جدال کا سلسلہ چل نکلا۔ اس جنگ و جدال میں آکامرزا کے اتھوں مرزا ہندال کو شہادت نصیب ہوئی۔ آکامرزا شکستیں اٹھاتا ہوا ہندوستان میں اخل ہو گیا اور دریائے سندھ کے پار آدم گکھر کے پاس پناہ لی۔ آدم گکھر نے آکامرزا کو یدکر کے بادشاہ کو مطلع کر دیا۔ بادشاہ دیوانہ وار آدم گکھر کے پاس پہنچے۔ آدم نے نہایت حترام اور آداب کے ساتھ بادشاہ کا استقبال کیا۔ بادشاہ نے آکامرزا سے ملاقات کی۔ اس موقع پر ایک رکابی میں ترنبوز کی قاشیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ بادشاہ نے نصف خود کھائیں اور نصف قاشیں آکامرزا کو بخش دیں۔
آکامرزا کو قید میں پڑے ہوئے چار دن گزر گئے۔ اس دوران امرا، کزراء اور لفتیان دین میں بڑی گرم گرم بحثیں ہوتی رہیں۔ وہ سب بادشاہ کو یہ مشورہ دے رہے

تھے کہ اب آکا مرزا کو معاف نہ کیا جائے!

بادشاہ نے ایک رات مجھے طلب کیا اور مجھ سے دریافت کیا۔ "علی مرزا! کیا تم جانتے ہے کہ ہم تجھے کہاں بھیج رہے ہیں؟"

میں نے عرض کیا۔ "بندہ منشاءِ سلطانی سے لاعلم ہے!"

بادشاہ نے آکا مرزا کے خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اس خیمے کی اندرونی خدمت تیرے سپرد ہے، اب نیند تیرے لئے حرام ہے۔"

اس حکم کے بعد میں خیمے میں داخل ہوگیا۔ آکا مرزا نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ عشاء کی نماز پڑھ کر آکا مرزا نے مجھ سے پوچھا۔ "علی مرزا! کیا بادشاہ ہمیں قتل کرا دیں گے؟"

میں نے طنزاً جواب دیا۔ "بادشاہ کے مزاج سے بادشاہ ہی واقف ہوگا۔"

پھر آکا مرزا نے مایوسی سے کہا۔ "بہرحال جو کچھ بھی ہو، علی مرزا! احسان ہمارا چھ روز سے قضا ہو گئے تھے کہ تم انہیں ہمارے عوض ادا کر دو گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں رکھ تو سکتا ہوں لیکن یہ قضا جناب خود ہی ادا فرمائیں تو مناسب ہوگا۔"

اس کے دوسرے دن مفتیانِ دین اور امرا نے مل جل کر ایک محضر نامہ تیار کیا جس کی ابتدا اس مصرعے سے کی گئی تھی۔

(درخنہ گیرِ ملک سرافگندہ بہ درخنہ گیر۔ ملک کا سر قطع کر دیا جائے۔)

بادشاہ نے بدرجۂ مجبوری حکم دیا۔ "افسوس کہ ہم قتل کا حکم نہیں دے سکتے پھر فرمایا۔" کامران کو اندھا کر دیا جائے۔"

اس حکم کے بعد بادشاہ وہاں سے ہٹ گئے۔ کئی طاقت ور اور توانا آدمی آکا مرزا کے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے غلام علی نامی بھاری تن و توش کا مالک آگے بڑھا اور بڑے سے رومال کو لپیٹ کر گیند بنائی پھر اسے زبردستی آکا مرزا کے منہ ٹھونس دیا۔ آکا مرزا نے بے اختیار اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ دو آدمیوں نے ہاتھوں کو پیچھے باندھ دیا اور خیمے سے باہر لے آئے، وہاں کچھ لوگوں نے آکا مرزا کو زمین پر گرا اور اس کے جسم اور ٹانگوں کو پوری طرح قابو میں کر کے آنکھوں میں نشتر چبھونے لگے جب پانچ نشتر چبھوتے جا چکے تو آکا مرزا نے اپنی ٹانگوں پر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا "تو ہماری ٹانگوں پر کیوں بیٹھا ہے؟ انہیں تو چھوڑ دے!"

لیکن کسی نے بھی اس کی باتوں پر توجہ نہ دی اور کم و بیش پچاس نشتر دونوں آنکھوں میں چبھوتے گئے۔ اس کے بعد ایک شخص نمک دان لے کر آگے بڑھا اور پتلیوں سے لپا ہوا نمک نشتر زدہ آنکھوں میں بھر دیا۔ درد کی شدت میں آکا مرزا "اللہ اللہ" کرتے رہے۔

مجھ سے آکا مرزا کی یہ حالت نہیں دیکھی گئی، میں بھاگ کر بادشاہ کے خیمے کے در پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بادشاہ نے مجھے اندر طلب فرمایا اور پوچھا۔ "کیا ہمارے حکم پر عمل کر دیا گیا؟"

میں نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اعلاحضرت! حرف بہ حرف۔ آکا مرزا اندھے کر دیئے گئے!"

بادشاہ نے حکم دیا۔ "ہمارے غسل کے لئے پانی مہیا کیا جائے۔"

* * *

نابینا آکا مرزا نے بادشاہ سے مدینہ منورہ جانے کی اجازت طلب کی جو دے دی گئی، میں ان سے ملنے گیا۔ قدموں کی آہٹ سن کر دریافت کیا۔ "کمرن ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "علی مرزا!"

پوچھا۔ "اب کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "کچھ لینے نہیں دینے آیا ہوں۔"

دریافت کیا۔ "وہ کیا؟"

میں نے کہا۔ "ایک نصیحت۔ تم نے جو مظالم ڈھائے تھے اور جس جس طرح لوگوں کو ستایا تھا، تمہیں اس کا بدلہ اسی دنیا میں مل گیا!"

آکا مرزا کی اکڑ اب بھی وہی تھی۔ بولا۔ "ہم نصیحتیں نہیں سننا چاہتے۔"

میں نے کہا۔ "نہ سنو، لیکن یہ تو بتا دو کہ رد من جبیں کہاں ہے؟"

آکا مرزا نے جواب دیا۔ "جو خود ہی اندھا ہو اسے کیا پتہ کہ کون کہاں ہے۔"

میں نے غصے میں کہا۔ "او ظالم انسان، تو نے تو میری بینائی کو نقصان ہی پہنچایا تھا لیکن خدا نے تیری بینائی ایک سر سے چھین لی۔"

آکا مرزا خاموش رہا۔ اس کے بعد وہ مدینہ منورہ چلا گیا اور وہیں اس کا

انتقال ہوگیا۔

بادشاہ نے ہندوستان فتح کرلیا اور مجھے اس کے طفیل بڑا عزت و آرام میسر
روشن جبیں کا کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں چلی گئی ہاں افواہ یہ سننے میں آیا ہے کہ آگا مرزا کے د
افراتفری اور ہنگامہ فرار و انتشار میں خود اس سے بھی کئی کنیزیں چھین گئیں اور اسے خود
یہ معلوم نہ ہوسکا کہ روشن جبیں کس کے قبضے میں چلی گئی۔

دھندلی بینائی اور غبار آلود نظروں کے سامنے جب بھی کوئی عورت اچانک
آتی ہے تو میں غلطی اور خوش فہمی سے یہ سمجھ بیٹھتا ہوں کہ شاید روشن جبیں میری محبت
ہاتھوں بے قرار ہوکر ڈھونڈتی تلاش کرتی میرے پاس آگئی ہے لیکن اے بسا آرزو کہ
خاک شدی۔

※ ※ ※

صادق از دوستی

مشرقی ہندوستان میں انگلستان کی تجارت کرنے والی مختلف سوسائٹیوں۔ آپس میں اتحاد کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل اختیار کر لی تھی، پہلے اس کمپنی۔ اپنے ایجنٹوں کے لئے فیکٹریاں اور اپنے مال کے لئے گودام تیار کئے پھر ان کی حفاظ کے لئے قلعوں کی ضرورت پیش آئی۔ جب قلعے تعمیر ہوتے تو ان کے لئے سپاہی ضرور سمجھے گئے اور جب سپاہیوں کی صورت میں افواج وجود میں آگئیں تو ان کے لئے علا کی تسخیر کا کام فراہم کیا گیا۔ چونکہ سات سمندر پار سے آنے والی اس تاجر قوم کے۔ ہندوستان کی ہر شے اجنبی تھی اور ہندوستانیوں کے مقابلے میں وہ تعداد ی ا سے بھی کمزور تھے، اس لئے بندوق اور تلوار کے ساتھ ساتھ انہوں نے سیاست عیاری سے بھی کام لیا وہ جس قلعے یا علاقے کو فتح کرنا چاہتے، پہلے وہاں سازشوں ہرادلی وستے بھیج دیتے جب یہ سازشی سورما اپنے شکار کو زخمی کر چکتے تو آخری فیصلہ کن ضرب ان تاجروں کی افواج لگا دیتیں۔

بنگال، اودھ، مدراس اور حیدرآباد کو زیر اثر لا چکنے کے بعد ان کی نظ سرنگاپٹم کی مملکتِ خداداد پر جم گئیں۔ یہاں نواب حیدر علی کے بعد اس کا بڑا بیٹ فتح علی ٹیپو، سلطان کا لقب اختیار کر چکا تھا اور دہلی میں کرم خوردہ، زنگ اور گھنی ہوئی سلطنت مغلیہ کی موجودگی میں، انگریزوں کی ایما کے بغیر ٹیپو کا سلط بن جانا بڑی جرأت کی بات تھی، آس پاس کی خود مختار ریاستیں سلطان ٹیپو کو حسد کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں، سرنگاپٹم کے شمالی مغرب میں پیشوائے پونا اس نومولود مسلم قوت کو فکر و تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ انگریز ہندوستانی ریاس اور معاصر حاشیوں کی رگِ رقابت پر انگلیاں رکھ کر اس جان لیوا مرض کی خوب اچھ تشخیص کر چکا تھا۔

ٹیپو ان تاجروں کے عزائم کا اندازہ لگا چکا تھا وہ ان کے مقابل سید ہو گیا، یورپ میں فرانس اور انگلستان آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ ٹیپو بھی ان کی آویزش سے پوری طرح باخبر تھا۔ اس نے انگریزوں پر فرانسیسیوں کو ترجیح د نے ویسی ریاستوں سے خط و کتابت کی اور نہایت دور اندیشانہ انداز میں انہیں دلایا کہ اگر اس مرحلے پر بھی ہندوستانی طاقتیں متحد اور متفق نہ ہو سکیں، تو وہ دن زیادہ دور نہیں کہ پورا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں چلا جائے۔ ا وطن کی خود غرضی، موقع پرستی اور سرد مہری کی ہمت شکن فضا سے بھی وہ مایو

اور اس نے اپنی ہمعصر دوسری اسلامی حکومتوں سے خط و کتابت شروع کر دی ایران، افغانستان اور ترکی کو سفارتیں بھیج کر انہیں امداد و اعانت پر آمادہ کرنے کی کوششیں ایران اور ترکی کے سوا سبھی نے امید افزا جوابات دیے۔

افغانستان کا زمان شاہ، جو احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا۔ وہ شمال مغربی سرحدوں سے فوج لے کر ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ لیکن شاطر انگریز نے زمان شاہ کا مقابلہ اپنی افواج سے نہیں کیا۔ مراد آباد سے ایک شیعہ عالم ایران روانہ کر دیا گیا۔ جس نے عباس صفوی کو یہ یقین دلا دیا کہ افغانستان میں اس کے ہم مذہبوں پر سخت مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، عباس صفوی نے افغانستان پر حملہ کر دیا اور ہندوستان کی سرحدوں پر انگریزوں کے خلاف صف آرا زمان شاہ اس حملے کی خبر سن کر افغانستان واپس چلا گیا۔ ٹیپو پھر تنہا رہ گیا۔

ٹیپو ہی کی طرح دھوندو جی واگھیہ نامی ایک آوارہ گرد ہندو سردار بھی انگریزوں کے عزائم بھانپ چکا تھا اور اسے ٹیپو سے عقیدت ہو گئی تھی لیکن اس کے پاس نہ تو کوئی علاقہ تھا نہ کوئی قلعہ، اس نے اپنے اس پاس کچھ آدمی جمع کر لئے تھے اور ان کی مدد سے انگریزوں اور ان کے حلیفوں پر چھاپے مارنے لگا تھا۔ ٹیپو بھی اس کے کارنامے بہت شوق سے سنتا رہتا تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ دھوندو جی واگھیہ اسلام پر مائل ہے تو اس کے دل میں ملاقات کی خواہش پیدا ہو گئی۔

واگھیہ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتا ہوا دریائے شری وتی کے کنارے پہنچ گیا سامنے راجا آبشار آٹھ سو تیس فٹ کی بلندی سے گر رہا تھا۔ واگھیہ اپنے ساتھیوں سمیت اس حسین اور پرلطف منظر میں کھو گیا۔ یہ لوگ چوکنا انداز میں گھوڑوں سے نیچے اتر پڑے۔ دھواں اڑاتا آبشار سب کے دلوں میں کھبا جا رہا تھا۔ اگر انگریزوں کا خوف دامنگیر نہ ہوتا تو واگھیہ یہیں دریائے شری وتی کے آبشار "راجا" کے قریب جوار میں رہ پڑتا کیونکہ یہ امن زندگی کے لئے اس سے بہتر جگہ ملنی مشکل تھی۔

دھوتی کے پلو سے اس نے اپنا منہ پونچھا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر بندوق سامنے رکھ لی۔ اس کے پچاس پچپن چوکنا اور مستعد ساتھی بھی فطرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے لگے کچھ دیر بعد انہوں نے مغرب میں بھاگتے ہوئے ایک ہرن دیکھا، ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہیں ہرن کی دہشت زدہ رفتار کو دیکھ کر یہ یقین ہو چکا تھا کہ اسی کے پیچھے یا تو کوئی مست خونخوار درندہ ہے یا پھر انسان اس کا پیچھا کر رہے ہیں، ان میں ایک

شخص زمین پر واپس کروٹ لیٹ گیا اور کان زمین سے لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر
لگا۔ بقیہ لوگ اس سمت منہ کر کے بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے جدھر سے ہرن بھ
کر آیا تھا۔ واگیہ نہایت اطمینان سے اپنے ساتھیوں پر نظریں جمائے کسی بات کا انتظ
رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لیٹا ہوا شخص پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور واگیہ کی طر
بھاگتا ہوا چیخا "واگیہ جی! دشمن، تقریباً سو سوا سو دشمن!"

واگیہ چیتے جیسی چستی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے اٹھتے بندوق ہاتھ میں لے
پوچھا "کتنی دیر ہیں یہ لوگ؟"

اس شخص نے جواب دیا "تقریباً ایک میل دور!"

واگیہ کی تحکمانہ آواز گونجی "کدھر جا رہے ہیں یہ لوگ؟"

"اسی طرف آ رہے ہیں واگیہ جی!"

واگیہ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے گھوڑوں کو شمال کے جنگل میں چھپا د
اپنے ساتھیوں کو راہ گزر کے متوازی دور تک پتھریلی پٹانوں کے پیچھے بٹھا دیا ا
یہ طے پایا کہ جب غنیم سامنے آجائیں تو واگیہ جی کے حکم کے مطابق اس کو بندوقوں کی
پر رکھ دیا جائے۔ ان کا جوان حس سماعت رکھنے والا آہٹ شناس واگیہ کے قر
زمین پر کان لگائے آنے والوں کے دم بدم قریب آنے کی خبر سنا رہا تھا۔ تقریباً گ
سوا گھنٹہ بعد آہٹ شناس کی اطلاع کے بموجب سو سوا سو مردوں اور عورتوں پر مشت
قافلہ ان کے سامنے سے گزرنے لگا۔ ان کے ٹھوکریں کھا کھا کر قدم اٹھتے حوصلہ پر
تھے کہ وہ کسی ابتلا و مصائب کے سمندر سے گزر کر آ رہے ہیں، گھوڑوں کے جسم خون
ہوتے تھے، اور مردوں کے چہرے اور کپڑے خون کی لکیروں اور دھبوں سے گلنار ہو
تھے کئی گھوڑوں پر دو دو آدمی سوار تھے، ان میں ایک زخموں سے چور، اپنا سر ایک ط
کا ندھے پر جھکائے نیم مدہوش اپنے ساتھی کے سہارے سفر کر رہا تھا۔ عورتیں خوفز
سوگوار، گردنیں جھکائے مردوں کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑے بڑھا رہی تھیں، واگیہ
انہیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہ خیبر ملکی لوگ ہیں، ان کے سرخ و سفید چہرے، س
بال اور نیلگوں آنکھیں ان کے غیر ملکی ہونے کی شہادت دے رہی تھیں، واگیہ کو ان
سے نفرت تھی۔ اس نے ان افسردہ حال و مضمحل پا لوگوں کی مجموعی کیفیت سے یہ ا
لگایا تھا کہ اب ان میں مقابلے کا دم نہیں رہا۔ واگیہ نے اپنی حلق سے ایک عجیب د
ناک آواز نکالی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے ساتھیوں سمیت نیم وا تمرے میں،

ے نمودار ہوا اور ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی بندوقوں کی نالیں اہل قافلہ کی
ں تھیں، واگیہ نے تلگو میں حکم دیا "اپنے ہتھیار زمین پر گرا دو!"

چند سفید فام اس کا مطلب سمجھ گئے اور اپنے ہتھیار زمین پر گرا دیے۔
ں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی زبان میں واگیہ کا حکم سنا دیا اور اس کے فوراً بعد سبھی نے
اپنے ہتھیار زمین پر ڈھیر کر دیے۔

واگیہ گردن اکڑاتے اپنے پانچ ساتھیوں کو آس پاس لئے ان کے سروں پر پہنچ
عورتیں ہراساں اور بدحواس نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں، واگیہ نے تلگو میں
ال کیا: "تم لوگ انگریز ہو؟"

"نہیں!" ایک ادھیڑ عمر نے جواب دیا "ہم فرانسیسی ہیں!"

"اچھا!" واگیہ کو یاد آ گیا کہ فرانسیسی ٹیپو کے حلیف ہیں، اس نے پوچھا "تمہارا
حال کیونکر ہوا؟"

ادھیڑ عمر فرانسیسی نے جواب دیا "ہم سرنگاپٹم سلطان ٹیپو کے پاس جا رہے
ے کہ راہ میں انگریزوں سے مڈبھیڑ ہو گئی وہ تعداد میں ہم سے زیادہ تھے، ہمارے بیشتر
تھی مقابلے میں مارے گئے ہم جان بچا کر کسی نہ کسی طرح یہاں تک آ گئے!" اتنا کہہ
ر اس نے واگیہ کو حکم طلب نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "اب تم جو حکم دو
ے اس پر عمل ہو گا!"

واگیہ نے اپنے ساتھیوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، ایک منچلے نوجوان
ے واگیہ کو اپنی رائے سے بلا پس و پیش مطلع کر دیا۔ فرانسیسی عورتوں پر نظریں
ا ہوئے کہا "واگیہ جی! مردوں کو جانے دو، عورتوں کو روک لو! ان کو ہمیں بھی
وان کی ضرورت ہے!"

پھر کئی طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ "ہم سب کی بھی یہی رائے ہے ہم سب
ی بھی یہی رائے ہے!"

واگیہ نے مردوں کو ایک طرف کر دیا اور عورتوں کو دوسری طرف، اور خود ان
دونوں کے درمیان اپنے ساتھیوں سمیت حائل ہو گیا۔ پھر معمر فرانسیسی کے گھوڑے
کے پیٹ پر ایک زوردار لات رسید کر دی اور چیخ کر حکم دیا "بھاگ جاؤ۔ فوراً بھاگ
جاؤ۔ ورنہ ہمارے ساتھی تمہیں قتل کر دیں گے!"

جان بچی لاکھوں پائے کے مصداق مردوں نے اپنے گھوڑوں کو فوراً آگے

بڑھادیا۔ عورتوں نے ان کا ساتھ دینا چاہا لیکن واگیہ کے ساتھیوں نے انہیں قدم بھی نہ ہلنے دیا۔

فرانسیسی اپنی عورتوں کو واگیہ کے رحم وکرم پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے انہیں مڑ مڑ کر اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک بلند و بالا پیچیدہ پہاڑ ان کے درمیان حائل نہ ہوگئیں۔

زار و قطار روتی اور آنسو بہاتی ہوئی فرانسیسی خواتین رحم اور التجا نظروں سے واگیہ کو دیکھنے لگیں، واگیہ کے ساتھی گاہ واگیہ کو اور گاہ فرانسیسی عورتوں کو دیکھنے لگتے۔

واگیہ اپنے ساتھیوں کو جنگل سے گھوڑے واپس لانے کا حکم دے کر فرانسیسی عورتوں کے حسن و جمال کا جائزہ لینے لگا۔

پہلے اس نے ان کی گنتی کی، یہ کل چھیاسٹھ تھیں، ان میں سات بوڑھی بقیہ انسٹھ سولہ اور تیس سال کے درمیانی عمر کی تھیں، تھوڑی دیر بعد جب گھوڑے لے کر اس کے ساتھی واپس آگئے تو وہ فرانسیسی عورتوں کو مویشیوں کی طرح ہنکا کر سب سے بلند پہاڑی چوٹی کی طرف لے گیا جسے وہاں کے مقامی لوگ کدرے (گھوڑے کا منہ) کہتے تھے۔ کدرے کے جنوب میں ایک چھوٹی سی وادی چھوٹے سرسبز درختوں سے ڈھنپی ہوئی تھی، یہاں پہنچ کر اس نے فرانسیسی خواتین کو قطار میں کھڑا کر دیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا "میں جانتا ہوں کہ ان غیر ملکی عورتوں اپنے قبضے میں دیکھ کر تم سب کے کیا احساسات ہوں گے تم نے میری خاطر اپنا وطن گھر چھوڑا اور کہساروں اور میدانوں میں خاک اڑاتے پھر رہے ہو سخت ناانصافی گی اگر میں تمہیں ان عورتوں سے دور رکھوں، بھگوان نے تمہاری قربانیوں کے پیش انہیں ہمارے پاس بھیجا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ کون عورت کس کے حوالے کی دشوار ہے!"

واگیہ کی اس مختصر تقریر سے اس کے ساتھیوں کے چہروں پر تازگی آ واگیہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا "تم جب ان عورتوں کی پشت پر ا کے متوازی قطار میں کھڑے ہو جاؤ"

حکم کی فوراً تعمیل کر دی گئی اور اس کے چون ساتھی۔ فرانسیسی خوا پشت پر ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔

واگیہ نے بوڑھی عورتوں کو قطار سے نکال دیا۔ چونکہ عورتوں کی پشت پر چونکہ مقابل قطار میں کھڑے ہوتے تھے پانچ عورتوں کی پشتیں خالی تھیں، جب قطاریں، ایک دوسرے کی پشت پر کھڑی ہو گئیں تو واگیہ نے ان دونوں قطاروں دیا۔ "ایک دوسرے کی طرف مڑ کر اپنے چہرے آمنے سامنے کر لو۔"

مرد تو ایک دم گھوم گئے لیکن واگیہ کے اس حکم کی تعمیل تمام عورتیں ایک نہ کر سکیں جو تلگو زبان سے واقف تھیں وہ گھوم گئیں اور جو نہیں جانتی تھیں ستور کھڑی رہیں۔

واگیہ نے تلگو جاننے والی عورتوں کو حکم دیا۔ "تم تلگو نہ جاننے والی عورتوں کو بتاؤ نے انہیں کیا حکم دیا ہے!"

اس حکم کے ذرا دیر بعد تمام عورتیں واگیہ کے سپاہیوں کے روبرو دکھر ہی تھیں۔

واگیہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "جو عورت جس مرد کے مقابل ہے اپنے ہیں کیے ادا سے اپنے تصرف میں لاتے!"

کچھ دیر کے لئے واگیہ کا یہ حکم اس کے ساتھیوں کے لئے ناقابل فہم رہا۔ لیکن نے اپنے اس نرالے حکم کی وضاحت کر دی، اس نے کہا۔ "ساتھیو! تم میرے اس کے حکم پر تعجب نہ کرو، میں چاہتا تو ان عورتوں کو اپنی مرضی سے تم میں تقسیم کر دیتا ن اس صورت میں تم میں پسند اور ناپسند کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا لیکن اس طریقہ تقسیم جو میں نے اختیار کیا ہے تم سب کو مطمئن ضرور کر دیا ہو گا کہ جو عورت جس کے مقدر تھی اسے مل گئی۔"

لوگوں نے جوش مسرت سے تالیاں بجائیں اور واگیہ جی کی جے کا نعرہ بلند کیا۔

ادھر سے فارغ ہو کر واگیہ بقیہ پانچ عورتوں کی طرف بڑھا۔ یہ کسی کے بھی حصے نہیں آئی تھیں، واگیہ نے ان کے روبرو پہنچ کر انہیں بادی بادی بغور دیکھا پھر نے ساتھیوں سے سوال کیا۔ "ساتھیو! ان پانچ عورتوں کے لئے تم کیا کہتے ہو؟"

واگیہ کے ایک پرستار نے جواب دیا۔ "واگیہ جی! تم ہمارے سردار ہو اور سردار حق کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، ان پانچوں کے تنہا مستحق ہو!"

تائید میں سبھی نے کچھ ایسا جوش و خروش دکھایا کہ تھوڑی دیر کان پڑی کو آواز تک نہ سنائی دی۔ جب شور کم ہوا تو واگیہ نے اپنے حصے میں آئی ہوئی خواتین کو جانچنے کی نظر سے دیکھا۔ یوں تو وہ پانچوں ہی حسین تھیں لیکن ان میں ایک غیر معمولی

خوبصورت تھی، واگیہ اس کے روبرو پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کی عمر مشکل انیس بیس سال رہی ہوگی۔ اس کے شانوں پر سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے اور دوپٹے سے بے نیاز جسم، ایک ایسی فراک میں پھنسا ہوا تھا جس کے کلے میں بطور خاص جنوبیٹیں پیدا کی گئی تھیں

واگیہ کو گھورتے ہوئے دیکھ کر لڑکی نے شرم و حیا سے نظریں جھکا لیں۔ واگیہ نے ہنستے ہوئے لڑکی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "ادھر آؤ، میرے قریب!"

لڑکی ڈری سہمی اس کے قریب چلی گئی اور خوفزدہ نظروں سے لمحے بھر واگیہ کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

واگیہ کا ہاتھ اب بھی اس کے کاندھے پر رکھا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

لڑکی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "روزی ڈینیل!"

واگیہ نے ترشی سے پوچھا۔ "تم روئیں کیوں رہی ہو؟"

اچانک نظریں اٹھیں جیسے بجلی کوند گئی ہو، لڑکی نے دلیری سے جواب دیا۔ "میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔ پھر بھی تمہارے قبضے میں آ گئی ہوں اگر تم خود میری جگہ ہوتے تو کیا خوش ہوتے؟"

واگیہ نے طیش میں آ کر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ بولا۔ "تم سفید فام تاجروں نے آخر ہندوستان میں کیا لینے آتے ہو؟ کیا تمہارے مردوں نے ہندوستان کی ناموس ہاتھ نہیں ڈالا؟"

"ڈالا ہوگا!" لڑکی نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "لیکن میں فرانسیسی میری قوم سفید فام ہونے کے باوجود انگریزوں کے خلاف تمہارا ساتھ دے رہی ہے"

واگیہ نے جواب دیا۔ "بکواس بند کرو، مسز نگار تم کا پیشوا تم پر اعتبار کرتا ہے کرے لیکن میں نہ تم فرانسیسیوں پر اعتماد کر سکتا ہوں نہ انگریزوں پر تم دونوں ایک کے بھائی گرہ کٹ ہو!"

لڑکی نے منطق کا سہارا لیا۔ "لیکن ہم فرانسیسی یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان

زوں کا غلام ہو جاتے، سردار! اگر تم سے یہ سوال کیا جاتے کہ تم انگریز کو زیادہ پسند
تے ہو یا فرانسیسی کو تو تم کیا جواب دو گے! اس وقت تم یقیناً فرانسیسی کو ترجیح
گے؟"

داگیہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

دلی لڑکی! تم نے کیسا مہمل سوال کیا ہے یہ تو ایسا سوال ہے جیسے پوچھا جاتے کہ داگیہ
بندوق کی گولی سے مرنا پسند کرو گے یا برچھی کے پھندے سے!"

داگیہ کی بات سے اس کے سارے ہی ساتھی کھلکھلا کر ہنس دیے۔

داگیہ نے روزی کے علاوہ چار دیں عورتوں کو گھوڑوں پر سوار کرا کے اپنے نرغے
لے لیا اور روزی کو اپنے گھوڑے پر آگے بٹھا لیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے
ار کی روش اختیار کی اور اپنے حصے میں آئی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے آگے
ا کر ان کے خال گھوڑوں کو درمیان میں لے لیا۔

داگیہ نے روزی کی سنہری لٹوں کو لہرا دیا اور الٹے ہاتھ سے لگام کھینچ کر
صیلی چھوڑ دی اور سیدھے ہاتھ کو ہوا میں لہرا کر اپنے ساتھیوں کو کوچ کا اشارہ
یا۔ ایک ساتھ بہت سارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کدرے مکھ کی وادی گونج اٹھی۔

یہ لوگ اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوتے نیل گری کی حدود میں داخل ہو گئے اور اس
سب سے بلند چوٹی ڈوڈا بٹا (بڑی پہاڑی) کے دامن میں پہنچ کر دم لیا۔ یہاں انہوں
نے کچھ دن رہنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو لوٹ کی کمائی کا سبز باغ
دکھا کے ہم نوا اور ہم خیال بنا کے اپنے ساتھیوں میں شامل کر لیا۔ داگیہ نے انہیں ہن
در پگوڈے (سونے کے سکے) دے کر رام کر لیا۔ مقامی خود تو ساتیس اور خدمت گار بن
گئے اور اپنے مہمان آقاؤں کو عیش کرنے کے لئے اپنی رہائش گاہیں دے دیں۔ یہاں داد
عیش دینے کے دوران کئی عورتیں ہلاک کر دی گئیں کیونکہ وہ اپنے ضمیر اور مرضی کے خلاف
ان رہزنوں کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھیں، ان کی جگہ بقیہ چار مردوں میں کام آئیں مخلص اور
ایماندار سردار داگیہ نے اپنے لئے روزی کو مخصوص رکھا۔

جب وہ روزی کی خلوت گاہ میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ اس
کے ہاتھ میں تقریباً اچھا خاصا چھرا چمک رہا ہے وہ ٹھٹک کر دروازے پر ہی رک گیا اور روزی
کو حکم دیا۔ "لڑکی! اسے پھینک دو!"

روزی نے چھرے کی دھار پر انگلی پھیری اور اطمینان سے جواب دیا۔ "مجھ سے دور رہو اگر تمہیں نہ مار سکی تو خود کو ضرور ہلاک کر لوں گی!"

اس نے پوچھا۔ "تمہیں یہ چھرا ملا کہاں سے؟"

روزی نے جواب دیا۔ "اسی کوٹھری سے، یہیں اس طاق میں رکھا تھا!"

واگیہ سمجھتا تو نہایت آسانی سے اس سرکش لڑکی کو دور ہی سے چھرا پھینک کر ہلاک کر دیتا لیکن اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ لڑکی اپنی موت سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں وہ بخوشی مرنے پر تیار تھی جو خود مرنے پر آمادہ ہو اسے مارنا کوئی آسان کام نہیں ہے اسے روزی کی یہ ادائیں، اس کی صورت شکل سے زیادہ اچھی لگیں، مسکرا کر پوچھا۔ "آ تم مرنا کیوں چاہتی ہو؟"

"صرف اس لئے کہ میں تمہاری خواہشات نہیں پوری کر سکتی!"

واگیہ طنز سے ہنس دیا۔ بولا۔ "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اگر میں چاہوں تو تم مجھ سے محفوظ رہ سکتی ہو؟"

"ہاں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ تم تو کیا دنیا کی کوئی طاقت، کوئی شخص مجھے میری مرضی کے خلاف نہیں استعمال کر سکتا!"

"اچھا!" واگیہ کو روزی کی یہ ناتجربہ کارانہ بھولی بھالی باتیں اس کے نازو انداز سے زیادہ اچھی لگیں، روزی کے غصے پر اسے پیار آ رہا تھا نہایت نرم لہجے میں بولا "بھولی لڑکی! تم نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟"

روزی نے جواب دیا۔ "روزی ڈینیل!"

"خوب روزی ڈینیل! اپنا یہ چھرا تو پھینک دو، تمہیں اگر اپنے نازو انداز، سحر اور بھولی بھالی باتوں کے زہر کا علم ہو جاتے تو پھر کبھی بھی اس حقیر چھرے کا سہارا لینا پسند نہ کرو۔ میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ کوئی کام بھی تمہاری مرضی کے خلاف نہ ہو اب اس عہد کے بعد تو اپنا چھرا پھینک دو!"

لیکن روزی نے چھرا پھینکنے سے انکار کر دیا۔

واگیہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ روزی یہ سمجھی کہ واگیہ جست لگا کر اس پر حملہ آور ہو والا ہے لیکن واگیہ نے ہاتھ میں چھپی ہوئی رسی کو کمند کی طرح اس کے چھرے والے ہ کی طرف پھینکا اور جھٹکا دے کر چھرے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ چھرا ہوا میں لہراتا ہوا اور کے سامنے آ گرا۔ واگیہ نے جھک کر اٹھا لیا۔ اور بے ساختہ قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔ "اسی چ

بانہ تھا تمہیں، ہم لوگ مردوں کے شکاری بھلا عورتوں کو کیا نظر میں لائیں گے!"
اس کے بعد وہ دوزی کی طرف بڑھا۔ دوزی پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر
دیکھنے لگی۔
واگیہ نے کہا۔ "دوزی! تم پریشان مت ہو، میں اب بھی یہی کہوں گا کہ تم میرے
ر پر یقین کرو، میں سردار ہوں اور کسی سردار کے لئے عہد شکنی نہایت بری بات ہے!"
دوزی نے دوکر پر چھا۔ "پھر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟"
تمہاری قربت، تم سے باتیں کرنا، تمہارا حال سننا، کوئی ایک خواہش تھوڑی ہے۔"
دوزی اس عجیب و غریب شخص سے قدرے لطف اندوز ہونے لگی۔ "میں
اری باتوں پر یقین تو کر لوں لیکن مجھے تم سے خوف آتا ہے۔"
واگیہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "اب اگر میں چاہوں تو تم اپنے تحفظ
ں کس حد تک مدافعت کر سکتی ہو؟"
دوزی نے کوئی جواب نہ دیا تو واگیہ نے کہا۔ "اس دنیا کا نظام اعتماد اور اعتبار
ہی چل رہا ہے!"
وہ دوزی کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ دوزی بھی سمٹ کر کنارے پر
و گئی۔
واگیہ اس سے دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور اس نے اپنی کسی بات سے
ی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ دوزی سے غیر معمولی محبت کرنے لگا ہے!
اسی ملاقات میں دوزی نے اپنی بابت یہ بتایا کہ وہ اپنے چچا کے لڑکے کرنل
امر سے محبت کرتی ہے اور اسی سے بچپن سے منسوب ہے!"
واگیہ نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"
دوزی نے جواب دیا۔ "سرنگاپٹم میں ہوگا کیونکہ سلطان نے اسے بلایا تھا!"
واگیہ نے پوچھا۔ "کیا تمہارا کرنل پامران لوگوں میں موجود تھا جنہیں میں نے حکم
ے کر چلتا کر دیا تھا؟"
"ہاں ان میں وہ بھی موجود تھا وہ زخمی تھا اگر وہ زخمی نہ ہوتا تو میری مدد
کو ضرور بڑھتا!"
واگیہ ہنسا، کہنے لگا۔ "اچھا ہی ہوا کہ وہ ہمارے مقابلے پر نہیں آیا اگر غلطی
اور نادانی سے آ جاتا تو یقیناً قتل کر دیا جاتا۔" پھر پوچھا۔ "کیا پامر بھی تم سے محبت

کرتا ہے؟"

روزی نے گردن جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔ "ہاں وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے!"

داگیہ ایک دم گرم ہو گیا۔ چیخ کر بولا۔ "تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی ہو اگر پامر کو تم سے محبت ہوتی تو تمہیں میرے حوالے کر کے ہرگز نہ جاتا!"

روزی نے پامر کی وکالت کی، بولی۔ "اس نے ایسا مجبوری کی حالت میں کیا تھا!"

"عاشق اور مجبوری دو متضاد چیزیں ہیں جو عاشق ہو، وہ مجبور نہیں ہوتا!"

داگیہ کی دلربا باتوں نے روزی کو چونکا دیا۔ وہ تو اسے اب تک سیدھا سادا ہرن سمجھ رہی تھی سفاک انسان، جو دلائل اور منطق کی جگہ بھی اپنے ہتھیاروں سے کام لیتا ہے!

روزی چپ ہو رہی لیکن داگیہ نے جلے دل سے متنبہ کیا۔ بولا۔ "اگر تم اب بھی پامر سے محبت کرنی ہو تو شوق سے کرتی رہو۔ لیکن میری ایک بات ضرور یاد رکھو، مرد پامر تمہاری جیسی دلیر اور مردانہ حوصلے کی لڑکی کی محبت کا اہل نہیں ہے!"

روزی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

نیل گری کی وادی میں رہتے ہوتے تقریباً بارہ دن گزر چکے تھے داگیہ کی ناکامی اور روزی کی کامیابی کا علم سبھی کو ہو چکا تھا انہیں حیرت تھی کہ ان کے سخت دل سردار داگیہ جی کو آخر ہو کیا گیا ہے، داگیہ کے تمام ساتھی خوب خوب داد عیش دے چکے تھے اور اب انہیں کمائی کی فکر دامنگیر تھی، ان کے نئے ساتھی بھی داگیہ جی کے فرمان کوچ کے منتظر تھے۔

داگیہ نے وادی کو چھوڑنے سے پہلے اپنے آہٹ شناس کو چند آدمیوں کے ساتھ نیل گری کی شمالی حدود کے اس پار بھیج دیا کہ پہلے وہ اس بات کا اطمینان کر آئے کہ مطلع صاف بھی ہے یا نہیں، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ فرانسیسی کسی نہ کسی بڑی طاقت کا سہارا لے اس کو تلاش ضرور کر رہے ہوں گے!

دوسرے دن ہی اس کا آہٹ شناس واپس آ گیا۔ اور اس نے یہ تشویشناک خبر سنا کہ اس نے میسور کی حدود سے نکل کر نیل گری کی حدود میں داخل ہوتے ایک سلطانی دستہ کو دیکھا ہے، ان کے ساتھ چند سفید فام بھی ہیں جو یقیناً فرانسیسی ہوں گے، اس دستہ میں تقریباً ڈھائی تین سو آدمی ہوں گے!

داگیہ نے پوچھا۔ "تو انہیں کہاں چھوڑ آیا؟"

آہٹ شناس نے جواب دیا۔ "وہ کہیں قریب ہی بھٹک رہے ہوں گے!"

داگیہ نے اس ہنگامی مسئلے پر اپنے ساتھیوں سے راستے طلب کی تقریباً ہر ایک نے
مشورہ دیا کہ چھپ کر ان پر شب خون مارا جائے لیکن داگیہ نے اس سے اختلاف کیا۔ بولا
ں ٹیپو کی بہادری، تدبر، فراست اور حب الوطنی کا دل سے قائل ہوں، ہم دونوں کے
اصد بھی ایک ہیں پھر ہم آپس میں لڑ کر اپنی طاقت خواہ مخواہ کیوں ضائع کریں!"
ساتھیوں نے داگیہ کا ٹیپو کی طرف جھکاؤ محسوس کر کے، خود کو اس کی مرضی کا
یع کر دیا اور اسی مجلس مشاورت میں داگیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کسی بھی طرح سلطان
ے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرے گا!
سلطانی دستے کی آمد کی خبر فرانسیسی خواتین نے بھی سنی اور انہیں یہ سوچ کر
وشی ہوئی کہ جلد یا بدیر ان کے جبری آقا کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے لیکن روزی کی
وچ ان سے مختلف تھی، اسے عاگیہ میں ایک بڑے آدمی کی خصوصیات دکھائی دے رہی
تھیں، ایک ہوشیار، صاحب فراست باکردار انسان کی خصوصیات، اسے خوب اندازہ تھا کہ
داگیہ سلطانی دستے کے قابو میں آسانی نہیں آئے گا!
اس دن شام ہی کو داگیہ اپنے دو جن پھر دلیروں کو لے کر ادھر روانہ ہو گیا جدھر
سے سلطانی دستہ ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا، آہٹ سنتا س اس کے ساتھ تھا جو بار بار
زمین پر لیٹ کر اپنے کان زمین سے لگا کر غنیم کی آہٹ اور فاصلے کا اندازہ لگاتا رہتا۔ وہ
غنیم کی سمت تک کا تعین کرتا جا رہا تھا۔
دلبودار کے جنگل میں پہنچ کر وہ رک گیا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شی شی کرتا
ہوا بولا۔ "داگیہ جی! غنیم ہم سے اب زیادہ دور نہیں ہے!"
داگیہ نے پوچھا۔ "کیا وہ ہماری طرف آ رہے ہیں؟"
"بالکل بالکل۔"
داگیہ نے اپنے ساتھیوں کو ادھر ادھر چھپاتے ہوئے حکم دیا۔ "سب میں گولی چلاؤں
اسی وقت تم سب بھی گولیاں چلا دینا!"
لوگوں نے داگیہ کی بات گرہ میں باندھ لی۔
شاید نصف گھنٹے بعد یہ دستہ نمودار ہوا۔ ان کے ساتھ پانچ چھ فرانسی بھی تھے
داگیہ نے پوچھا۔ "ہم میں کوئی ایسا بہادر بھی ہے جو کسی نہ کسی طرح غنیم کے
لشکر میں چلا جائے اور اسے میرا ایک رقعہ پہنچا دے!"
ایک پچیس چھبیس سال کا نوجوان آگے بڑھا۔ بولا "اس کام کو میں انجام

دوں گا!"

داگیہ بولا "دھنیہ ہے تیری سودامائی پر، خوب!"

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سلطانی دستہ ہاتھوں میں مشعلیں لئے بڑھا چلا آرہا تھا۔ یکایک کسی طرف سے بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ بس پھر کیا تھا۔ داگیہ کے ساتھیوں نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے، پوری وادی میں بندوقوں کی آواز اور چیخ پکار سے میدان حشر جیسا سماں بندھ گیا تھا۔

سلطانی دستے کو یہ شبہ گزرا کہ ان کے حریف بھی تعداد میں شاید بہت زیادہ ہیں وہ موقع کی تلاش میں ادھر ادھر چھپنے لگے۔ داگیہ نے بھی ان کا تعاقب نہیں کیا کیونکہ وہ ان سے چند معاملے کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ان کی پوری رات نگرانی اور چوکسی میں گزر گئی۔ سلطانی دستے نے اپنی مشعلیں بھی بجھا دی تھیں۔

صبح جب فجر کے بعد اپنے آہٹ شناس کی اطلاع پر داگیہ ذرا آگے بڑھا تو راستے میں اسے کئی لاشیں پڑی دکھائی دیں، داگیہ چھپتا چھپاتا درختوں اور چٹانوں کی آڑ لیتا چلتے سپالا کی اور عقاب جیسی تیز نگاہوں کے سہارے ایک چشمے تک پہنچ گیا وہاں اس نے منہ ہاتھ دھوئے اور چند گھونٹ پانی پیا بھی، یکایک پہاڑی کے نشیب سے کسی نے بندوق چلائی لوگ لیٹ گئے۔ گولی ایک سیاہ چٹان سے ٹکرا کر سنگریزے اڑاتی غائب ہو گئی۔ داگیہ نے لیٹ کر ادھر دیکھا، جدھر سے گولی کی آواز آئی تھی۔ تھریا پچھترا سی گز نیچے دو بھاری پتھروں کے درمیان بندوق کی متحرک نال پر اس کی نظر پڑ گئی۔ داگیہ دیر تک ساکت و پرنال پر نظریں جمائے رہا۔ بیس پچیس منٹ بعد پتھروں کے درمیان سے ایک مرد نمودار ہوا اور پھر اگلے درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ داگیہ کی بندوق کی نال اس شخص کی حرکات کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگی اور پھر ایک زوردار کڑک کے ساتھ بندوق کی نال سے شعلہ نکلا اور داگیہ کا شکار ڈھیر ہو گیا۔ داگیہ اپنے ساتھیوں کو لے کر نہایت ہوشیاری سے نیچے اترا اور گرد و پیش کا جائزہ لیتا اپنے شکار تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی غیر ملکی نوجوان تھا جو اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ گولی اس کے داہنے شانے کو چھید گئی تھی اور پتھر پر گرنے کی وجہ سے اس کا سر بھی پھٹ گیا تھا۔ اس کی بندوق اور اس کے جسم کے نیچے تھی اور آدھی باہر، داگیہ نے اس کے نتھنوں پر ہتھیلی رکھ دی۔ ابھی سانس آجا رہی تھی داگیہ کے جی میں آئی کہ اس کے سفید خام کے سینے میں خنجر اتار دے۔ لیکن دیر بعد اسے ہوش آگیا۔ اس نے سکڑی ہوئی بھنوؤں سے آنکھیں کھولیں، اور داگیہ کو خشم آلود نظروں سے گھورا۔ اس نے داگیہ کو پہچان لیا تھا۔ لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا "تم نے

دنا جس نے ہم سے ہماری عورتیں چھین کر ہمیں بھگا دیا تھا؟"

"ہاں؟" داگیہ نے جواب دیا۔ اسے اس نوجوان پر کسی بات کا شک ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تمہارا نام پامر ہے؟"

زخمی نوجوان داگیہ کی زبان سے اپنا نام سن کر ذرا حیران ہو گیا۔ پوچھا۔ "تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟"

داگیہ نے جواب دیا۔ "مودزی کے ذریعے، اس نے تمہارا ذکر کیا تھا!"

پامر نے کروٹ بدلنی چاہی لیکن طاقت جواب دے گئی۔ لڑکھڑاتی آواز میں سوال کیا۔ "وہ کہاں ہے؟"

داگیہ نے جواب دیا۔ "میرے پاس!"

پامر نے "اف" کو کے آنکھیں بند کر لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہہ نکلے۔

داگیہ اسے سسکتا چھوڑ کر واپس چلا جانا چاہتا تھا کہ پامر نے پھر آنکھیں کھول دیں اور اپنی کمر میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ داگیہ نے کہا۔ "پامر! مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں، کیونکہ جب تم سفید فام تاجروں کا ہم پر زور چلتا ہے تو تم بھی پتھر ہو جاتے ہو۔ میں تمہیں سسکتا چھوڑ کر واپس جانا چاہتا ہوں۔" پھر پامر کی بے بسی اور اذیت سے لطف اندوز ہو کر مسکرانے لگا۔ پوچھا۔ "مودزی کے نام کوئی پیغام؟"

"کوئی پیغام نہیں!" یہ کہتے ہوئے اس نے کمر کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالا اس میں خنجر تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھا اور پامر نے یہ کہتے ہوئے اسے اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔ "مودزی سے کہہ دینا پامر مر گیا۔ تیرا عاشق اس جہان سے کوچ کر گیا!"

پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹ نکلا اور ذرا دیر بعد پامر کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

داگیہ یہ یقین کئے بغیر کہ پامر مرا یا زندہ ہے، وہاں سے ہٹ گیا۔

ابھی یہ لوگ آئندہ کے اقدام کا کوئی فیصلہ بھی نہ کر سکے تھے کہ سامنے کی چھوٹی سی خم دار سڑک پر ایک گھڑ سوار سفید پھریرا اڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ صلح کی علامت تھی، داگیہ نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے اس شخص کے سامنے آ گیا اور اسے پہچان لیا کہ یہ اسی کا اپنا ہی آدمی ہے وہ شخص جو سلطانی دستے میں داگیہ کا پیغام لے کر گیا تھا۔ داگیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا اور بے چینی سے پوچھا۔ "کیا خبر لائے؟"

اس نے جواب دیا۔ "خوش خبری، بہت بڑی خوش خبری!"

داگیہ کے تمام ساتھی ادھر اُدھر سے نکل کر وہاں جمع ہونے لگے۔

داگیہ نے اپنے قاصد سے سوال کیا۔ "کیسی خوش خبری، صاف صاف بتاؤ!"

قاصد نے جواب دیا۔ "میں سلطانی دستے کے امیر کے پاس سے چلا آرہا ہوں، اس کے پاس داگیہ جی کے لئے کوئی خاص پیغام ہے جسے وہاں چل کر آپ خود وصول کر سکتے ہیں!"

داگیہ نے پوچھا۔ "کس قسم کا پیغام؟"

قاصد نے جواب دیا۔ "سلطان چاہتا ہے کہ داگیہ جی اپنے ساتھیوں کو لے کر سرنگا پٹم پہنچ جائیں وہاں انہیں سامان جنگ سپاہی اور قلعے مل جائیں گے داگیہ جی وہاں اپنی صلاحیتوں کو اچھی طرح آزما سکیں گے!"

داگیہ اپنے آدمیوں کے ساتھ قاصد کی رہنمائی میں، سلطانی دستے میں پہنچ گیا دستے کے امیر نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور مصافحہ کر کے بغل گیر ہو گیا۔

داگیہ نے تکلفی سے پوچھا۔ "تم میرے لئے سلطان کا کیا پیغام لائے ہو؟"

سلطانی امیر نے، سلطان کا وقعہ داگیہ کی طرف بڑھا دیا۔ داگیہ نے احتراماً عقیدت سے اس کاغذ کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔ پھر کھول کر پڑھنے لگا۔ سلطان نے داگیہ سے خواہش کی تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر سرنگا پٹم آجائے وہاں اسے ہر قسم کی سہولت دی جائے گی اور سلطان اس سے شایانِ شان سلوک کرے گا؟"

داگیہ نے سلطانی امیر سے کہا۔ "دوست! تم یہیں ٹھہرو میں ڈیڑھ بجے کے دامن سے اپنے ساتھیوں کو بلا لاؤں!"

سلطانی دستہ وہیں ٹھہر گیا۔ داگیہ چلتے چلتے پامر کی لاش پر گیا اور سرہانے کھڑے ہو کر کہا۔ "بدنصیب، پردیسی! تو نے مر کر میرے لئے بڑی الجھن پیدا کر دی ہے اور بدقسمتی سے موت سے پہلے میری جی آتری گولی تیرے نشانے کو چھید کر اپنا کام کر گئی اگر تو خود کشی نہ کرتا تب بھی مر جاتا!"

اس کے بعد اس نے پامر کے چہرے [illegible] کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کی داہنی پنڈلی بھی زخمی تھی اور یہ زخم پرانا تھا یا [illegible] کے نیچے کسی گہری چوٹ کا چکنا نشان تھا اور ہاتھ کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں خاصی گرہ دار تھیں، جس سے پامر کے حقائق پسند اور عملی ہونے کا ثبوت بہم پہنچتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی چھنگلیا کی برابر والی انگلی میں صوبے کی انگوٹھی تھی جس پر آر کھدا ہوا تھا۔ جس سے داگیہ نے روزی کے پہلے حرف کا اندازہ لگایا۔ داگیہ نے انگوٹھی اتار کر دھوتی کے پھینٹے میں رکھ لی اور واپسی کے لئے مڑا۔ بولا۔ "اچھا دوست! رخصت!

تم معلوم نہیں کب تک یہاں پڑے رہو گے اور روزی بھگوان جانے کب تک تمہارا انتظار کرے گی۔ شاید زندگی بھر کیونکہ یہ بات میں اسے کس طرح بتا سکتا ہوں کہ میں نے تمہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کے بعد تم نے خودکشی کر لی۔"

واگیہ کے پیچھے آنے والے ساتھی اسے تلاش کرتے ہوئے پامر کی لاش تک پہنچ گئے۔

کسی ایک نے پوچھا: "واگیہ جی! اس کے پاس سے کوئی کام کی چیز نکلی؟"

واگیہ نے اپنی دھوتی کے پھینٹے میں سے چند پگوڈے نکال کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیے

واگیہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نیل گری کی وادی میں چلا گیا اور سب کو تیاری اور روانگی کا حکم سنایا۔ ذرا سی دیر میں سلطانی پیش کش اور طلبی کا سبھی کو علم ہو گیا۔ دو سو مقامی لوگ بھی اس کے ساتھ جانے کی تیاری کرنے لگے۔

فرانسیسی خواتین خوش تھیں کہ فرانسیسیوں کا حلیف سلطان شاید دھوکا دے کر واگیہ اور اس کے ساتھیوں کو سرنگاپٹم طلب کر رہا ہے اور یہ سارے کے سارے دریائے کاویری کے ٹاپو میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لیے جائیں گے اور فرانسیسی خواتین ان سے بجبر چھین کر فرانسیسیوں کے حوالے کر دی جائیں گی۔

روزی نے اپنے خانے پر بکھرے ہوئے سنہری بالوں کو گھوڑے کی دم کی طرح باندھ لیا اس وقت اسے ایک گونا طمانیت حاصل ہو گئی تھی اسے یہ یقین تھا اگر وہ واقعی سرنگاپٹم پہنچ گئی تو یہ محکومی کی حالت نہیں باقی رہے گی کیونکہ ٹیپو فرانسیسیوں کا ہمدرد اور حلیف تھا۔ وہاں اس کے ہم وطن پہلے سے موجود ہوں گے اور انہی میں پامر بھی ہو گا۔ واگیہ کے لئے اس کے دل میں جذبۂ احترام ضرور پیدا ہو گیا تھا کیونکہ اس نے قرآن اور جنگی چھاپہ مار ہونے کے باوجود روزی کو ستایا نہیں تھا۔ اس نے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر ٹیپو نے اسے واقعی دھوکے سے بلا کر گرفتار کر لیا تو وہ اپنے ہم وطنوں کے اثرات استعمال کر کے کم از کم واگیہ کو رہائی ضرور دلائے گی۔

واگیہ نے روزی سے بطور خاص کہا: "روزی! ہم لوگ سرنگاپٹم چل رہے ہیں!"

"سمجھے معلوم ہے!" روزی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

واگیہ کچھ کہنے کے لئے الفاظ اور اسلوب تلاش کرنے لگا۔ کچھ تامل سے پوچھا: "کیا تم پامر کو بھلا نہیں سکتیں؟"

"نہیں!" روزی نے جواب دیا: "اس کا سوائی ہی نہیں پیدا ہوتا!"

"اگر وہ فرانس واپس چلا جائے تو تمہیں چھوڑ کر، تب تم کیا کرو گی؟"

روزی نے جواب دیا۔ "میں بھی فرانس چلی جاؤں گی!"
"اگر وہ یہیں ہندوستان میں رہ کر تمہیں بھلا دے تو؟"
"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"
"اگر وہ مر جائے تو؟"
"تو میں بھی مر جاؤں گی!" پھر آہستگی سے واگیہ کو دیکھ کر کہنے لگی۔ "لیکن تمہیں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔"
واگیہ پھر کسی فکر میں ڈوب گیا۔ پھر پوچھا۔ "پامر کی عمر کیا ہوگی؟"
روزی نے جواب دیا۔ "یہی چوبیس پچیس سال!"
"کیا اس کی بائیں کنپٹی کے نیچے کسی گہری چوٹ کا پکا نشان بھی پایا جاتا ہے؟"
"ہاں!" روزی چونک کر بولی۔ "کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟"
"تمہیں!" واگیہ نے کہا۔ "کیا اس کی انگلیاں چھوٹی چھوٹی اور گرہ دار ہیں؟"
روزی چوکنے انداز میں، دہشت زدگی سے واگیہ کو گھورنے لگی، بولی "بات کیا ہے واگیہ جی، تم مجھے جب کچھ صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے؟"
واگیہ نے افسوس سے جواب دیا۔ "مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اس حلیے کا اور نام کا ایک غیر ملکی سرنگاپٹم جاتے ہوئے کسی پہاڑی سے پھسل کر ہلاک ہو گیا اس کی انگلی میں جو انگوٹھی تھی، اس پر حرف آر کھدا ہوا تھا؟"
روزی چیخ مار کر رونے لگی۔ "تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو اس لئے کہ میں پامر کو بھلا کر تم سے محبت کرنے لگوں، لیکن واگیہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں، میں تمہارے الو جھوٹ پر کسی قیمت پر بھی یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں!"
واگیہ نے دھوتی کے پھینٹے سے پامر کی انگوٹھی نکال کر روزی کے آگے پھینک دی۔ بولا "میں جھوٹ نہیں بول رہا روزی۔ اس انگوٹھی کو پہچانو کہ یہ کس کی ہے؟"
روزی نے پھرتی سے انگوٹھی اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی اور یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ یہ وہی انگوٹھی ہے جو پامر اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنے رہتا تھا۔
روزی نے مذبذب لہجے میں پوچھا۔ "یہ تمہیں کہاں ملی؟"
واگیہ نے جواب دیا۔ "میں اس شخص کو پہچانتا تھا نہیں لیکن وہ ہمارے پاس یہ پیغام کہ سنو رآیا تھا کہ چاغرنای فرانسیسی کسی پہاڑی سے پھسل کر ہلاک ہو گیا، پھر اس نے پامر کا وہ حلیہ بیان کیا۔ جو میں نے تمہارے سامنے بیان کیا۔ وہ دراصل تم سے ملنا چاہتا تھا، تمہاری تلاش

یہاں تک آگیا تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ تم سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو تمہارے نام ایک
م اور انگوٹھی دے کر واپس چلا گیا!"

روزی نے شک و شبہے سے دریافت کیا: "وہ پیغام کیا تھا؟"

واگیہ نے جواب دیا: "پامر نے مرتے وقت تمہارے نام یہ پیغام چھوڑا ہے کہ اس کے بعد
زاد ہر جس سے چاہو شادی کر لو۔"

روزی نے غصے میں کہا۔ "تم اپنے مقصد کے لئے جھوٹ بول رہے ہو، میں تمہاری
کا یقین نہیں کر سکتی!"

واگیہ نے کہا: "تمہاری مرضی یقین کر دیا نہ کرو، مجھے جو پیغام ملا تھا تمہیں پہنچا دیا!"

روزی نے کہا: "تم مجھے کسی بھی طرح سر لنکا پٹم تک پہنچا دو، اس خبر کی میں خود تصدیق
ں گی اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گی!"

اسے اپنی طرف مائل کرنے کا اس تدبیر کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

دھوندو جی واگیہ کا شہرہ اس سے پہلے ہی سر لنکا پٹم میں پہنچ چکا تھا۔ یہ لوگ جب جنوب
سوری دروازے سے سر لنکا پٹم میں داخل ہوئے تو انہیں دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ جمع
چکے تھے۔ ٹیپو نے انہیں یہ عزت بخشی کہ چند امراء ان کے استقبال کو آئے۔ اس وقت سلطان
ے دیوان عام دریا دولت باغ کی بالائی منزل میں موجود تھا۔ سلطان کے امراء واگیہ کے آدمیوں
نیچے چھوڑ کر اسے سلطان کے روبرو لے گئے، واگیہ نے سلطان کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے
یکھا۔ ایک آبنوسی تخت پر سرخ مخملی گاؤ تکیے کے سہارے گندمی رنگ اور قدرے پانچ فٹ
ٹھ انچ قامت کا پر رعب انسان بیٹھا ہے، اس کی ناک خم دار تھی اور آنکھیں بڑی بڑی پرآب
یں، چہرے کے خط و خال نازک تھے اور ہاتھ پاؤں بھی چھوٹے چھوٹے تھے، داڑھی منڈی ہوئی
ی اور گردن پر بٹیں پڑی ہوئی تھیں، واگیہ فرط عقیدت سے سلطان کے روبرو جھک گیا۔ سلطان
ے واگیہ کو دیکھتے ہی معمول سی حرکت کی اور چہرے سے خوشی کا اظہار کیا۔

واگیہ کو سلطان کے روبرو بیٹھنے کی عزت بخشی گئی۔

اسی وقت وزیر اعظم سلطنت خداداد میر صادق اور دیوان پورنیا سلطان کے روبرو
یش ہوئے، پورنیا بھاری جسم کا بنیا تھا۔ اس کے لمبے کاندھے پر پادر سے کچھ چھوٹا کپڑا پڑا ہوا
تھا اور سر پر مرہٹوں جیسی ٹوپی رکھی تھی، میر صادق کی مونچھیں، باچھوں کے اس پاس نیچے
ھوڑی کی طرف جھک گئی تھیں، اور اس کی آنکھوں سے بے خیالی اور خود غرضی مترشح تھی۔
اڑھی ندارد تھی۔

سلطان کی ایما پر اس کے معتمد نے واگیہ کا میر صادق اور پورنیا سے تعارف کرایا۔ صادق بظاہر خوش ہوا۔ اس نے سلطان سے کہا: "حضور والا! یہ وہی بدنام زمانہ دھوند واگیہ ہے نا جس کی رہزنی کا دور دور شہرہ ہے؟"

واگیہ کو میر صادق کا یہ انداز گفتگو ناگوار گزرا۔ سلطان نے بھی اسے محسوس کر لیا۔ "ہمیں اس کی انگریز دشمنی اور حب الوطنی پسند ہے دوسرے یہ ایک غیر معمولی صلاحیت کا آ ہے اور ہماری خواہش پر مر مٹنے کا پیغام لایا ہے۔"

میر صادق نے دوسرا وار کیا۔ بولا۔ "اس نے ایک آدھ بار سلطنت خداداد کی پر بھی تو حملہ کر کے لوٹ مار کی ہے؟"

"درست، لیکن اب واگیہ ہمارا دوست اور مہمان ہے!"

پورنیا ابھی تک خاموش تھا۔ اب اس نے بھی زبان کھولی لیکن میر صادق کی سما اور واگیہ کی مخالفت میں، بولا۔

"اعلیٰ حضرت! تقریباً دو ہفتے پہلے اس شخص نے سلطان کے حلیف فرانسی ایک قافلے پر حملہ کر کے ان کی عورتوں کو چھین لیا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک اعلیٰ حضرت کے م اور ان کی عورتیں آج اور اس وقت بھی دریا دولت باغ کے باہر واگیہ کے ساتھیوں کے موجود ہیں!"

سلطان نے شاکی نظروں سے واگیہ کو دیکھا اور پوچھا: "کیا یہ درست ہے؟"

"ہاں حضور والا!" واگیہ نے جواب دیا۔ "اگر حضور والا کو فرانسیسیوں پر اعتماد ہے یہ ناچیز بھی ان پر اعتماد کر کے ان کی عزت کرے گا۔ ان کی جو عورتیں ہمارے پاس ہیں ہم انہیں کر دیں گے!"

پورنیا نے دلیری اختیار کی، بولا۔ "لیکن تم اعلیٰ حضرت کو پہلے یہ یاد دلا دو کہ ان حلیف فرانسیسیوں کے ساتھ تم اور تمہارے ساتھیوں نے جو انتہائی ناشائستہ حرکت کی ہے کے لئے تم لوگ سلطان کی سزا کے مستحق نہیں ہو!"

واگیہ کا غصے سے چہرہ تمتما گیا۔ بولا۔ "اس ایوان وام میں سلطان کے روبرو ادب مانع ہے اگر مجھ سے یہی سوال جواب باہر کیے جائیں تو میں ان کے منہ توڑ جواب د سکوں گا!"

میر صادق نے سلطان کو مخاطب کیا۔ "حضور والا! اس کی سرکشی اور باغیانہ سرشت فرمائیں، اسے آداب سلطانی تک کا خیال نہیں، پھر حضور والا اس پر کس طرح اعتماد کریں گے

داگیہ نے اپنی فطری دلیری سے جواب دیا "یہاں میں اپنی مرضی اور خواہش سے نہیں آیا
، مجھے سلطان نے بلایا ہے اب جبکہ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر سرنگاپٹم میں داخل ہو چکا
تم سب کو اپنے سلطان کے ہمانوں کی اس طرح اہانت اور بے عزتی نہیں کرنی چاہیئے۔"
سلطان ان کی تلخ باتیں ناگواری سے سن رہا تھا اس نے پورنیا اور میر صادق کو ڈانٹا
ہیں یہاں اس لئے نہیں طلب کیا گیا ہے کہ تم داگیہ کو اس کی فردِ جرم صاف۔ داگیہ کیا ہے اور یہ
ے کس سلوک کا مستحق ہے ہمیں خوب معلوم ہے!"
میر صادق نے جھک کر سلطان کو تعظیم دی اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "حضور والا! یہ
م قرآن پاک کی قسم کھا کر جناب کو یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ ناچیز نے داگیہ کی بابت جو کچھ بھی
اسنا ہے اس میں خلوص اور دیانت کا جذبہ کارفرما ہے، یہ غلام اس مملکتِ عظیم کا وزیر ہے اور
ن منصب کی ذمہ داریوں کے پیشِ نظر داگیہ سے صفائی طلب کر رہا تھا۔"
پورنیا نے عرض کیا "اگر اعلیٰ حضرت اپنے حلیفوں کے دشمنوں پر اسی طرح کرم فرماتے
ہے تو پھر وہ دن دور نہیں کہ اعلیٰ حضرت اپنے دوستوں کے اعتماد سے محروم ہو جائیں گے۔"
سلطان ان شاطروں کی چرب زبانی سے مات کھا گیا۔ اس نے داگیہ سے سوال کیا۔ "تم
ے ہمارے حلیف فرانسیسیوں پر تاخت کیوں کی؟ اور ان کی عورتوں کو ان سے کیوں چھین لیا؟"
داگیہ نے جواب دیا "سلطان خوب اچھی طرح واقف ہیں کہ ہم حق پرست لوگ نہ
کوئی ذاندان رکھتے ہیں نہ کوئی گھر بند ور، دکن کی حکومت ہماری دشمن ہے۔ مرہٹے ہمارے
خلاف ہیں انگریز ہمارے خون کے پیاسے ہیں، کچھ عرصے پہلے تک خود سلطان کا دل بھی ہماری
طرف سے صاف نہ تھا ان حالات میں ہمیں کہیں سر چھپانے کی جگہ تک نہیں مل سکتی۔ ہمارے
سپاہیوں کو سو رتیں درکار تھیں، ایک سردار کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں ان کی یہ ضرورت پوری
پوری کرتا۔ اب ہم ان عورتوں کو ان کے وارثوں کے حوالے کر دیں گے اور آئندہ اس قسم کی حرکتیں نہیں کریں گے۔"
سلطان نے پورنیا کو حکم دیا "داگیہ کے ساتھی آج سے ہمارے فوج میں اٹھہیں تین
ماہ کی تنخواہیں پیشگی ادا کر دی جائیں۔" پھر میر صادق کو حکم دیا۔ "سرنگاپٹم کے مشرقی حصے کے انتظام
میں تم ان سب کی رہائش کا انتظام کرو۔" پھر اپنے معتمد سے کہا۔ "اور تم ان فرانسیسیوں کو
طلب کرو، جن کی عورتیں داگیہ کے قبضے میں ہیں!"
پورنیا، میر صادق اور سلطان کا معتمد تینوں سلطان کے حکم کی تعمیل کے لئے باہر
چلے گئے۔
سلطان نے داگیہ سے کہا "داگیہ! تم ان کی باتوں سے بددل نہ ہونا۔ یہ دونوں ہمارے

بہترین خیر خواہ ہیں اور تمہیں چاہئے کہ ہم کسی طرح اور کسی وجہ سے، کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں، انہوں نے تم سے جس قسم کی باتیں کیں، اس میں بدنیتی کو کوئی دخل نہیں!"

صاف گو داگیہ نے اپنی آزادانہ مرشت کے ماتحت جواب دیا: "اگر سلطان انہیں اپنا خیر خواہ اور مخلص تصور فرماتے ہیں تو انہیں کون کیسی طرح ٹوک سکتا ہے لیکن اس ناچیز کی رائے میں یہ دونوں نمک حرام اور غدار ہیں ان سے وفاداری کی امید رکھنا ایسا ہے جیسے ہوا سے آم کی توقع لگانا۔"

سلطان نے ناگواری سے داگیہ کو دیکھا: "اپنے خدمت گاروں کو ہم بہتر سمجھیں گے وہ لوگ ہیں جنہوں نے انہیں پہلی بار دیکھا ہو!"

داگیہ نے سلطان کی ناراضی کی پروا کئے بغیر پوچھا: "پورنیا اور میر صادق کی بابت اس ناچیز نے یہ عام شہرہ سن رکھا ہے کہ سلطان کے والد نواب حیدر علی خلد آشیاں نے آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ ان دونوں کو فوراً قتل کر دیا جائے!"

سلطان نے کہا: "ہاں والد مرحوم نے ان دونوں کے خلاف یہ حکم دیا تھا لیکن ہم انہیں اپنا خیر خواہ اور دکھ سکھ کا ساتھی تصور فرماتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ والد مرحوم کی رائے سو فیصد درست ہی ہو!"

داگیہ نے بے بسی سے جرمن کیا: "سلطان اپنے خدمت گاروں سے اچھی طرح واقف ہیں ہم کیا کہہ سکتے ہیں!"

اسی دوران سلطان کے روبرو شہر کوتوالی اس جرم میں پیش کیا گیا کہ شہر میں کسی جگہ چوری ہو گئی تھی اور شہر کوتوال چوروں کو پکڑنے میں ناکام رہا تھا جس کا مالی چوری ہوا تھا۔ اس نے دکو بتایا کہ تقریباً دو ہزار پگوڈوں کا سامان چوری ہوا ہے۔ سلطان نے چشم زدن میں یہ فیصلہ سنا دیا کہ دو ہزار پگوڈے شہر کوتوال اپنے پاس سے ادا کرے کیونکہ یہ چوری یا چوروں کا پتہ نہ اور ان سے مال برآمد کر کے صاحب سامان کے حوالے کرتا۔ چونکہ شہر کوتوالی اس میں ناکام رہا تھا، اس لئے سلطانی قوانین کی رو سے یہ رقم شہر کوتوالی کو ادا کرنی چاہئے۔"

داگیہ کو سلطان کا یہ طریقہ بہت پسند آیا۔

فرانسیسی عورتیں ان کے مردوں کو واپس کر دی گئیں، داگیہ کے ساتھی سلطان کی فوج میں شامل کر دیئے گئے خود داگیہ کو کوئی عہدہ بھی نہ حاصل کر سکا۔ روزی اپنے ہم وطنوں میں اپنے شوہر کو تلاش کرتی رہی جہاں اسے بس اتنا علم ہو سکا کہ یام زادہ صحت ہو جانے کے بعد

تنے کے ہمراہ تیل گری گیا تھا جو واگیہ کو سلطان کے پاس لایا ہے واگیہ نے اس کی ہلاکت کا واقعہ بیان کیا تھا اس کی تصدیق کوئی بھی نہ کر سکا۔

واگیہ کو آہستہ آہستہ یہ محسوس ہونے لگا کہ اس نے سر نگاپٹم آ کر عقل مندی نہیں کی اور سلطان کی سرد مہری کا شکار تھا۔ اس سے روزی بھی جدا ہو گئی، علاقہ گنجام کے ایک مکان کسمپرسی اور بے بسی کی زندگی گزار رہا تھا اسے سلطان سے شکایت تھی کہ وہ یہاں سلطنتِ کی خواہش پر اس کی مدد کرتے آیا تھا۔ اور وہ مسلمان ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن سلطان سرداروں میں گھرا ہوا اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ اس نے سلطان کو ایک خط لکھا:۔

"قبلۂ عالم! بندہ تو حضور والا کی خواہش پر اس خیال سے سرنگاپٹم آیا تھا کہ اس سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کوئی خدمت لی جائے گی لیکن یہ ناچیز اب تک حضور کی عدم التفاتی کا شکار ہے۔ خادم نے حضور کی تائید اور ہمدردی حاصل کرنے کے لئے یہاں تک فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے آبائی دھرم کو چھوڑ کر حضور والا کا مذہب اختیار کر لے لیکن حضور کی بے توجہی کی وجہ سے یہ خاکسار اب تک لوک پرلوک کی یہ نعمت بھی حاصل نہ کر سکا یہ حاجز چاہتا ہے کہ حضور کو اس کی بابت جو فیصلہ بھی کرنا ہے جلد از جلد اس کا انکشاف فرما دیں۔ بندہ حد درجہ شکر گزار ہو گا۔"

سلطان نے یہ خط اپنے امراء کے سامنے رکھ دیا اور ان سے مشورہ لیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے؟

میر صادق نے جواب دیا "حضور والا! یہ غلام قرآن پاک کی قسم کھا کر یقین دلانے کو تیار ہے کہ دھونڈو جی واگیہ فریبی ہے اور اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں بھی کوئی مکر ہے، قرآن کی قسم جب تک آپ کا یہ غلام وزارت کے عہدے پر فائز ہے کسی لیڈے کو حضور والا کے مزاج میں دخیل نہ ہونے دے گا۔"

پورنیا نے دبے لفظوں میں کہا "حضور خود ہی فیصلہ فرما لیں کہ جو شخص اتنی آسانی سے اپنا مذہب ترغیب کے بغیر اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑنے پر آمادہ ہے وہ حضور کا یا اسلام کا کتنا وفادار ہو گا۔ واگیہ پیدائشی رہزن ہے ایک رہزن کا اسلام قبول کر لینا اس پورے دھرم کے لئے فرت و آبرو کی بات تو نہیں!"

سلطان نے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ واگیہ کو کسی نہ کسی منصب سے سرفراز ضرور کریں ہم اسے ایک دم کوئی بڑا منصب نہیں دینا چاہتے اگر وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے تو اسے پہلے مسلمان ہو

جاتے دیں گے اس کے بعد ایک عالم دینی اسور کی تعلیم پر متعین کر دیا جائے گا اور جب وہ مذہب اسلام اور شعائر اسلامی سے واقف ہو کر ان پر کاربند ہو جائے گا تو اسے کوئی اچھا سا منصب عطا فرما دیں گے!"

میر صادق نے سلطان کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کچھ کہنا تو ضرور چاہتا ہے پوربیا وغیرہ کی موجودگی میں کہنا نہیں چاہتا، سلطان نے موضوع بدل دیا اور بعض دوسرے امور زیر بحث آ گئے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ سلطان فرانسیسیوں کی تعریف اور انگریزوں کی مذمت کر رہا تھا لیکن میر صادق نے دونوں کی مخالفت کی، کہنے لگا "حضور والا! قرآن پاک کی رو سے دونوں ہی ناقابل اعتبار ہیں، وہ انگریز ہو یا فرانسیسی دونوں تاجر ہیں، دونوں ہی زر اور برادر شغال ہیں، نہ انگریزوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے نہ فرانسیسیوں پر حضور والا سمجھے تو دونوں ہی سے نفرت ہے!"

پوربیا تے دست بستہ ہو کو سلطان سے جانے کی اجازت چاہی جو دے دی گئی۔ جب پوربیا چلا گیا تو سلطان نے میر صادق سے کہا۔

"تنہائی میں صاحب! تم اس وقت داگیہ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے تھے، مصلحتاً نہ کہہ سکے تھے بولو، وہ کیا بات تھی جو تمہاری زبان پر آتے آتے رہ گئی؟"

میر صادق نے جواب دیا "حضور والا! داگیہ کے سلسلے میں آپ کے غلام کے ذہن میں تجویز آئی ہے اگر حضرت اس کو عمل کی بھٹی سے گزار دیں تو داگیہ کی خیت کا کھرا کھوٹا پن فوراً سامنے آ جائے گا!"

سلطان نے حکم دیا "بیان کرو!"

میر صادق نے عرض کیا "حضور والا! یہ غلام جو کچھ عرض کرے گا وہ سلطان کی محبت اور خلوص میں ڈوب کر عرض کرے گا!"

سلطان نے کہا "میر صاحب! ہمیں تمہاری محبت اور خلوص پر اعتماد ہے جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہہ دیں!"

میر صادق نے کہا "حضور والا! جیسا کہ داگیہ نے اپنے خط میں اسلام سے اپنی محبت کا ذکر کیا ہے، حضور اسے فوراً مسلمان کر لیں، حضور والا اسے شرف ملاقات بخشنے کے لئے طلب فرمائیں جیسے ہی داگیہ یہاں آئے حضور والا کے خدام جبراً اپنے قالبوں لا کر اس کی سنت کر دیں، یہ کلمے کے ساتھ ہی ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری رسم ہے!"

سلطان نے میر صادق کی اس تجویز کو اچنبھے سے سنا۔ میر صادق جلدی جلدی بولا۔

ہم حضور والا! سنت کے بعد داگیہ کی یہ مجال نہ ہوگی کہ اسلام یا حضور سے انحراف کرے
حضور والا کا یہ فعل گراں گزرا تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ داگیہ موقع پرست ہے
لام یا حضور سے کوئی محبت نہیں!"

سلطان نے پیر صادق کو کوئی جواب تو نہ دیا لیکن کسی سوچ میں ضرور پڑ گیا۔ اسے میر
کے خلوص پر اعتماد تھا اس لئے اس کی تجویز سے اختلاف نہ کر سکا۔

روزی اپنے ایک ادھیڑ عمر ہم وطن کے ساتھ داگیہ کے دروازے پر پہنچ کر اس کے
روسی سے پوچھنے لگی "کیوں جناب! کیا داگیہ ہی اس مکان میں رہتے ہیں؟"

داگیہ اپنی بیٹھک کا باہری دروازہ بند کیے کسی سوچ میں گم تھا۔ روزی کی آواز سن
دروازہ کھول دیا اور سر باہر نکالتا ہوا بولا "کون؟ روزی! اندر آجاؤ۔ میں یہاں موجود ہوں"

روزی اپنے ادھیڑ عمر ساتھی کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔ داگیہ نے انہیں تیلے رنگ
وٹے گدے کے فرش پر احترام سے بٹھا دیا اور خود بڑھ کر ٹیک لگانے کے لئے دو گاؤ
یش کر دیے۔

روزی کچھ بولے بغیر اپنے ساتھی کے ساتھ، خاموشی سے یوں بیٹھ گئی جیسے اس میں کوئی
لوفان پھٹ پڑنے کے لئے اندر ہی اندر مچل رہا ہو۔

داگیہ بھی ان دونوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بولا "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نہیں یاد آگیا
تم میرے پاس بن بلائے آگئیں؟"

روزی نے غمگین آواز میں کہا "داگیہ! اس وقت میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں
نہیں پامر کی بابت جو کچھ بھی معلوم ہے مجھے سچ سچ بتا دو!"

داگیہ کے چہرے کی خوشی کافور ہوگئی۔ ہونٹ یوں اینٹھنے لگے جیسے ان سے کوئی تلخ شے
را گئی ہو۔ بولا "روزی! پامر مر چکا ہے، تم اس پر یقین کیوں نہیں کرتیں؟"

روزی جذباتی ہوگئی اور زور سے بولی "میں اس کی موت کا کس طرح یقین کر لوں،
اگیہ! اس کی لاش کہاں ہے؟"

داگیہ نے جواب دیا "لاش کا مجھے خود بھی کوئی علم نہیں، کیونکہ اس کی موت میرے
سامنے نہیں واقع ہوئی!"

روزی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا، روتی ہوئی بولی "داگیہ! تم جھوٹ بول
رہے ہو، میرا دل مجھے بار بار یقین دلا رہا ہے کہ تم سچ نہیں بول رہے، کم از کم۔ پامر کے معاملے

میں تم ضرور جھوٹے ہو!"

واگیہ نے بدمزگی سے کہا۔ "اگر تم میری بات پر یقین نہیں کر رہیں تو نہ کرو تمہیں اس کا اختیار ہے اور اگر تم مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہو تو مجھ سے سچ بلوا لو کسی طرح!"

روزی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر تمہیں سچ بولنے پر مجبور کر دینا میرے اختیار میں ہوتا تو واگیہ تم ہرگز اس طرح جھوٹ نہ بول سکتے!"

واگیہ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ عجیب نظروں سے روزی کو دیکھنے لگا۔ اب اس کے ادھیڑ عمر ساتھی نے بولنے کے لئے کندھے اچکائے، بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "مسٹر واگیہ! جیسا کہ مجھے اپنی بھتیجی روزی کے ذریعے معلوم ہوا کہ آپ ایک بہادر اور باکردار انسان ہیں کچھ دنوں پہلے روزی مکمل آپ کے اختیار میں تھی لیکن آپ نے اس سے کوئی ناشائستہ سلوک نہیں کیا یہ بڑے ظرف اور کردار کی بات ہے۔ مسٹر پامر روزی کا منگیتر ہے اگر اس کی بابت آپ کچھ جانتے ہیں تو بتا دیں!"

واگیہ نے جواب دیا۔ "میں پامر کی بابت جو کچھ جانتا تھا، روزی کو بتا چکا ہوں، اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں جانتا!"

روزی کے چچا نے کہا۔ "لیکن مسٹر واگیہ! پامر تو سلطانی دستے کے ساتھ تمہارے پاس گیا تھا پھر وہاں سے وہ واپس نہ آیا۔ اور تم نے روزی کو یہ بتایا ہے کہ اس کی موت کی اطلاع تمہیں کس شخص نے دی تھی، ہم دونوں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کون تھا جس نے تمہیں پامر کی موت کی خبر اور اس کی انگوٹھی دی تھی، تم نے روزی سے پامر کا حلیہ جس طرح بیان کیا تھا اس سے بھی یہی شبہ گزرتا ہے کہ تم خود پامر سے ملے ہو اور وہ جہاں بھی ہے تم اس سے واقف ہو!"

واگیہ نے مختصر جواب دیا۔ "میں کچھ بھی نہیں جانتا!"

روزی نے روتے ہوئے کہا۔ "واگیہ! چچا دل کہتا ہے کہ پامر زندہ ہے اور تم نے اس پر قابو پا کر کہیں قید کر دیا ہے۔ تم میری وجہ سے اسے قید میں رکھنا چاہتے ہو اور اس کی موت کا یقین دلا کر تم مجھے اپنی طرف ملتفت کرنا چاہتے ہو!"

واگیہ نے درشت لہجے میں کہا۔ "بکواس بند کرو لڑکی! میرا دماغ نہ خراب کرو!"

روزی کے چچا نے مایوسی سے کہا۔ "روزی! ہمیں واگیہ کی بات پر یقین کر لینا چاہئے!"

روزی نے جھنجلا کر کہا۔ "میں ہرگز یقین نہ کروں گی اور ایک نہ ایک دن واگیہ کو سچ بولنے پر مجبور کر دوں گی!"

واگیہ نے اندر ونی کمرے سے اپنے آنکھیں بند کر لیں، جیسے وہ کسی بہت بڑے بوجھ

باشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ماحول پر کچھ دیر سکوت طاری رہا ایسا سکوت جیسے کوئی سوت واقع ہو گئی ہو۔

پھر اشکبار آنکھیں اٹھیں اور روزی نے واگیہ کو مخاطب کیا۔ "واگیہ! بس چند باتیں
ہادر کروں گی اس کے بعد چلی جاؤں گی۔"

واگیہ نے اسے رحم آمیز نظروں سے دیکھا، بولا۔ "کہو!"

روزی نے پوچھا۔ "تم نے چند دن پہلے جس بلند کرداری کا ثبوت دیا تھا کیا تم حقیقتاً
ہی ہو کیونکہ وہ تمہارے پیشے کی نفی کرتا ہے؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "روزی! میں ناٹک کا اداکار نہیں، سپاہی ہوں۔"

روزی نے کہا۔ "تب میں تم سے ایک درخواست کروں گی!"

واگیہ اس کی صورت دیکھنے لگا۔

روزی لمحے بھر کے سکوت کے بعد بولی۔ "میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں واگیہ!"

"میرے ساتھ؟!۔ تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟ آخر کیوں؟" واگیہ حیرت زدہ رہ گیا۔

"ہاں میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں لیکن ایک یقین دہانی پر ایک شرط پر۔"

ی غیر یقینی انداز میں واگیہ کی صورت دیکھ رہی تھی۔

روزی کا چچا بھی حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

واگیہ نے نرمی سے پوچھا۔ "لیکن تم میرے ساتھ کیوں رہنا چاہتی ہو؟"

روزی نے جواب دیا۔ "اپنے رشتے داروں میں رہنے سے یا مر یاما آتا ہے، میں اسے
ں جانا چاہتی ہوں!"

واگیہ کو کچھ امید بندھی، آہستہ سے بولا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں جب سے چاہو
ے ساتھ رہنا شروع کر دو!"

روزی کے چچا نے ناگواری سے کہا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم سب کے ہوتے ہوئے
یہاں مسٹر واگیہ کے پاس رہو!"

روزی نے جواب دیا۔ "یہ اس طرح ممکن ہے کہ یہاں میں رہنا چاہتی ہوں!"

واگیہ نے خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "میں وقت سے پہلے ہی تمہیں خوش آمدید کہنے
تیار ہوں!"

روزی نے کہا۔ "لیکن پہلے مجھے یہ یقین دلا دو کہ تم مجھے اسی طرح رکھو گے جس طرح
دن پہلے بھی مجھے رکھ چکے ہو!"

"وعدہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں روزی!" واگیہ کہنے لگا "تم یقین رکھو کہ کوئی بھی وہ کام جس کا تمہاری ذات سے کسی بھی قسم کا تعلق ہوگا تمہاری مرضی کے خلاف یا خواہش کے بغیر نہ ہوگا!"

"مجھے تم پر اطمینان ہے!" روزی نے جواب دیا۔

روزی کا چچا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

روزی نے واگیہ سے کہا: "کیا تھوڑا سا پانی پلا سکتے ہو؟"

واگیہ اندر جاتا ہوا بولا "تھوڑا کیا بہت دیو۔ افسوس کہ میں شراب نہیں پیش کر سکتا کیونکہ مملکتِ خداداد کی حدود میں شراب قانوناً ممنوع ہے!"

روزی نے تلخی سے ہنس کر کہا: "اسی لئے تو پانی مانگ رہی ہوں!"

واگیہ بولا: "ابھی آیا چند منٹ میں!" وہ اندر چلا گیا۔

روزی جلدی جلدی چچا کو سمجھاتی ہوئی بولی "میرے یہاں رہنے کے فیصلے سے آپ ذرا بھی پریشان نہ ہوں! یہاں رہنے میں ایک مصلحت ہے میرے خیال کے مطابق اگر پارسا قافلہ کہیں قید میں نہیں ہے تو پارسا مرکے بارے میں جو کچھ بھی واگیہ کو معلوم ہوگا ایک نہ ایک دن اسے اگلوا لوں گی بس تباہی ایک دو جہ ہے یہاں رہتے کی!"

چچا نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ "روزی تم ایک لڑکے کے عہد پر کب تک یقین کرو گی!"

"اس طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیں!" روزی اتنا کہہ کر چپ ہو رہی کیونکہ سامنے سے واگیہ آ رہا تھا، پانی کا برتن اس کے ہاتھ میں تھا کٹورے تھا لیکن اس سے ذرا بڑا۔

روزی نے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی، بولی "واگیہ جی! میں اپنا سامان لے کر کل آ رہی ہوں، اسی وقت!"

واگیہ نے خوشی کو دباتے ہوئے کہا "روزی! میں تمہارا انتظار کروں گا۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم اپنا سامان لے کر آج ہی یہاں آ جاؤ!"

"کوشش کروں گی!" یہ کہتے ہوئے روزی نے چچا کا ہاتھ پکڑا اور سیدھے سے باہر آ گئی۔

رات کی تاریکی میں ایک دو گھوڑوں والی گاڑی واگیہ کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ واگیہ، روزی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، گاڑی کے رکتے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر گیا اور روزی کے استقبال کو آگے بڑھا۔

یہ، گاڑی میں سے ایک گٹھے جسم کا مندر اترا۔ اور اس نے اترتے ہی ایک دوسرے بھاری بھرکم شخص کو اترنے میں مدد دی۔ اجنبی مندر نے پوچھا۔ "کیا واگیہ بھی یہیں رہتے ہیں؟"

"ہاں!" واگیہ نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "میں ہی وہ ہوں مندر جی واگیہ ہوں!"

بھاری بھرکم شخص بولا۔ "تم ہمیں اندر لے چلو۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں!"

اس نے یہ آواز کہیں اور بھی سنی تھی، وہ ان دونوں کو اندر بیٹھک میں لے چلا گیا۔

وہاں ایک دوانچ موٹی دھوم بتی جل رہی تھی، واگیہ نے اس بھاری بھرکم شخص کو فوراً ہی پہچان لیا

"پرنام جی آپ! آج ہے نصیب، جو پورنیا جی ہمارے گھر تشریف لائے!"

"چپ رہو!" پورنیا نے شفقت سے ڈانٹا۔ "پہلے یہ بتا کہ اس گھر میں تیرے سوا اور کون کون رہتا ہے؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "یہاں میں تنہا رہتا ہوں۔ کیوں؟ کیا کوئی خاص بات؟"

"ہاں ہمیں تجھ سے کچھ خاص باتیں کرنا ہیں۔"

"تو کیجئے۔" واگیہ نے اجازت دے دی۔

پورنیا نے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ "جاؤ، باہر جا کر کھڑے رہو، اور اس بات کی نگرانی کرتے رہو کہ یہاں کوئی ایسا ویسا آدمی تو نہیں آ رہا!"

پورنیا کا آدمی باہر چلا گیا۔ تب پورنیا نے رازداری سے اپنی زبان کھولی۔ "کیوں شری دھورندھر واگیہ! کیا میں چند ذاتی نوعیت کی باتیں تم سے کر سکتا ہوں؟"

"نہایت شوق سے!" واگیہ نے کہا۔

پورنیا کم سے کم نرم لہجے میں بولا۔ "احمق تو اپنے آقاؤں کا انتخاب آخر کس طرح کرتا ہے؟ مجھے بھی تو بتا دے!"

واگیہ اس کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ بولا۔ "پورنیا جی جو کہنا ہے صاف صاف بتا دیجئے زیادہ وقت برباد کرنے سے فائدہ!"

پورنیا نے کہا۔ "یہ خبر سچی ہے کہ تو اسلام قبول کرنے والا ہے؟"

"ہاں یہ بغیر درست ہے!"

پورنیا کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں، بولا۔ "تو ہندو دھرم کا دشمن ہے اگر تو کہے گا تو ہم تجھے میسور کے اصل راجا کے دربار میں کوئی منصب دلا دیں گے!"

واگیہ اس کا مطلب نہ سمجھنے کے انداز میں بولا۔ "میسور کا اصل راجا کہاں ہے؟"

پورنیا نے جواب دیا۔ "تجھے جب کچھ غیر قریب معلوم ہو جائے گا، یہ بات اپنے

تک رکھنا کہ مملکتِ خداداد عنقریب ہستی سے نیست میں جانے والی ہے!"

واگیہ نے حیرت سے سوال کیا: "وہ کس طرح پورنیا جی؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ!"

پورنیا نے کہا: "میسور پر پہلے ہندوؤں کا راج تھا لیکن بعد میں اس پر سلطان کے باپ حیدر علی نے زبردستی قبضہ کر لیا اب حیدر علی کے بعد سلطان حکومت کر رہا ہے لیکن میرے اندر بیٹھا کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ حکومت پھر اپنے اصل حکمرانوں کے ہاتھ میں جانے والی ہے اور ہم سب ہندو، ملک کی بڑی طاقتوں سے مل کر غاصبوں کو ہٹانے کی کوششوں میں مصروف ہیں!"

واگیہ کا تیز ذہن پورنیا کی بات کا مطلب سمجھ گیا، بولا: "تو تم سلطان کا نمک کھا کر اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہو! تھو ہے تم پر پورنیا جی! تم غدار ہو!"

پورنیا نے جواب دیا: "مٹری واگیہ جی! میں پہلے ہندو ہوں اس کے بعد کچھ اور! اور تمہیں بھی یہی ہونا چاہیئے، میں نے جب سے یہ سنا ہے کہ تم ہندو دھرم چھوڑ کر سلطان کی خاطر مسلمان ہونے والے ہو، پریشان ہو گیا ہوں، میرے دل نے چاہا کہ تم سے ہندو دھرم چھوڑنا!"

واگیہ نے جواب دیا: "میں اپنی مرضی کا مالک ہوں پورنیا جی! آپ ناحق پریشان ہوتے ہیں!"

پورنیا نے اپنے چوڑے ہاتھ کی ہتھیلی واگیہ کے سامنے کر دی، بولا: "واگیہ جی! اس ہاتھ پر اپنا سیدھا ہاتھ رکھ کر تم مجھ سے یہ عہد کرو کہ تم اپنی زندگی کی آخری سانس تک ہندو ہی رہو گے!"

واگیہ نے جواب دیا: "میں ایسا کوئی عہد نہیں کروں گا جس پر میرا دل آمادہ نہیں کرتا!"

پورنیا نے کہا: "اچھا، میں چلتا ہوں لیکن میری یہ بات نہ بھولنا کہ اب تم دربار میں ہرگز نہ جانا، اگر غلطی سے تم وہاں چلے بھی گئے تو جانتے ہو اس کا کیا انجام ہو گا؟"

"نہیں جانتا!" واگیہ بولا: "کچھ تمہی ہماری رہنمائی کرو کہ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

پورنیا بولا: "سلطان تمہیں جبراً مسلمان بنانے کی قسم میں ہے تم جس دن بھی وہاں گئے سلطان کے متعینہ آدمی تمہیں زبردستی مسلمان کر لیں گے!"

"جھوٹ!" واگیہ بولا: "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟"

پورنیا بولا: "میں نے جو کچھ کہا ہے اس کی سچائی کا تجھے بہت جلد ثبوت مل جائے گا!"

واگیہ نے جواب دیا: "مجھے تو کچھ دیکھے بغیر ہی اللہ پر بھروسا ہے!"

پورنیا عاجز آکر یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ "ہمیں اپنے ساتھیوں کو سخت سزائیں دلوانا کیا پسند ہے پھر اس کے لئے تو ....." بات نامکمل رہ گئی اور واگیہ اس عجیب و غریب غدار انسان کی بابت سوچتا ہی رہ گیا۔

روزی اپنا قیمتی سامان لے کر واگیہ کے گھر پہنچ گئی واگیہ نے اسے ایک بال کمرہ اس لئے دے دیا کہ وہ اس میں اپنا زیادہ سے زیادہ سامان رکھ کر اطمینان سے رہ سکے۔

ان دنوں سلطنتِ خداداد آتش فشاں کے دہانے پر اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی، تقریباً اڑتیس سال قبل ۱۷۶۱ء میں نواب حیدر علی نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ یہاں پہلے ایک ہندو راجا تھا اور اسی راجا کے تصرف و اقتدار میں صرف تینتیس گاؤں تھے۔ جس کے مجموعے کو ریاست میسور کہا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ ریاست، سلطنتِ خداداد میں ضم ہوئی تو اس کی حدود ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت اختیار کر گئیں جس کا اپنا ایک نظام تھا۔ اپنی ایک طاقتور فوج تھی، اپنی ایک آزاد خارجہ پالیسی تھی، ان دنوں امریکہ اپنے انگریز آقاؤں کے خلاف جنگ آزادی میں مشغول تھا۔ جارج واشنگٹن نے اپنے ملک سے انگلستانی اقتدار کو نکال باہر کیا اور کارنوالس امریکہ کی زمام حکومت وہاں کی تیرہ ریاستوں کے حوالے کر کے احساسِ شکست خوردگی اور ندامت لئے جب وطن واپس گیا تو انگلستان کی وزارتِ عظمیٰ پوری دنیا کا نقشہ پھیلا کر بیٹھ گئی اور ان خطوں کی جستجو کرنے لگی جن کو اپنی نوآبادیات میں لا کر امریکہ کا نعم البدل فراہم کیا جا سکتا ان کی نگاہیں ہندوستان پر جم گئیں، انہوں نے کارنوالس کو سیاسی گناہ کے کفارے کے لئے ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا یہ ہندوستان آیا اور تھوڑی سی مدت میں سازش اور سیاست کے وہ بیج بو گیا کہ جب یہ پودے بڑے ہو کر پھلے پھولے تو ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں نفاق و اتفاقی کا شکار ہو گئیں، اودھ، بنگال، اڑیسہ، گوالیار، حیدرآباد، ارکاٹ اور پیشوائے پونا سبھی اس کے زیرِ دام آ چکے تھے لیکن ان میں تنہا ٹیپو کی نظریں ہندوستان کے مستقبل پر لگی ہوئی تھیں، خود رزبوں، غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہندوستان۔

کہتے ہیں کہ انسانی آنکھ کی پتلی کے پیچھے ایک لچکدار محدب عدسہ ہوتا ہے خدا نے یہ عدسہ شیشے کے بجائے ایک مخصوص قسم کی جھلی میں بھری ہوئی شفاف رطوبت سے بنایا ہے جن لوگوں کی آنکھ کا یہ عدسہ ضرورت سے کم محدب ہوتا ہے وہ دور کی چیزیں تو صاف دیکھ سکتے ہیں مگر قریب کی چیزیں نہیں دیکھ سکتے۔ سلطان ٹیپو کو جس فوج کی سیاسی اور ملکی نظم و نسق کی بصیرت عطا ہوئی تھی اس میں اسے دور و نزدیک کی چیزیں تو صاف نظر آ رہی تھیں لیکن جو کچھ ملک

کے اندر یا اس کے آس پاس ہو رہا تھا وہ اس کی سیاسی بصیرت سے اوجھل تھا۔ اس کی سیاسی بصیرت نے یہ تو دیکھ لیا کہ یورپ میں انگلستان اور فرانس آپس میں برسرپیکار ہیں اور فرانسس سے تعلقات استوار کر کے انگریزوں کو زک پہنچائی جا سکتی ہے لیکن اندرونی ملک جو سازشیں ہو رہی تھیں انہیں نہ دیکھ سکا۔ اس کی سیاسی بصیرت نے یہ تو دکھا دیا تھا کہ ترکی، افغانستان، ایران اور بعض دوسری مسلم حکومت قائم کی جا سکتی ہے لیکن اسے میر صادق و میر اعظم مملکت خداداد، میر قمر الدین سپہ سالار اور میر غلام علی لنگڑا امیر البحر اور انسپکٹر جنرل قلعہ جات کی حاسد سازشیں اور غداریاں نہیں نظر آ رہی تھیں، وہ میر یہاں پورنیا کو نہیں پہچان سکا تھا جو میسور کی سابقہ دائی اور ہندو ریاست کی بحالی کی سرگرم کوششوں میں مشغول تھا۔

انگریزوں نے سلطنت خداداد کے خلاف حیدر آباد، ارکاٹ اور مرہٹوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ کارنوالس اپنے حصے کا کام ختم کر کے انگلستان واپس چلا گیا۔ اس کے بعد سر جان شور آیا اور پانچ سال کے عرصے میں اس نے شمالی ہند کی حکومت اودھ کو سیاسی حیثیت سے مفلوج کر کے رکھ دیا۔ اسی دوران بنگال کے انگریز نواسی قسموں نے بغاوت کی اور وہاں کی حکومت پر قبضہ کر لینا چاہا۔ سر جان شور نے سختی کے بجائے نرم رویہ اختیار کیا اور باغیوں کی بہت سی شرائط مان لیں، اسی دوران سلطان ٹیپو یورپ کے فرانسیسی فاتح نپولین سے انگلستان کے خلاف تعلقات استوار کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ انگلستان کے حکمران ان حالات میں سر جان شور جیسے مصلحت اندیش اور نرم سیاستداں کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے سر جان شور کو انگلستان واپس بلا لیا اور اس کی جگہ لارڈ ولزلی کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ لارڈ ولزلی کی فرانسیسی بیوی نے ہندوستان جانے سے انکار کر دیا اور شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ زخم خوردہ ولزلی فرانس اور اس کے درستوں سے سخت نفرت ہو گئی۔

جب وہ جنوبی افریقہ کے راستے ہندوستان آ رہا تھا تو راس امید میں اس کی ان انگریز جنرلوں سے ملاقاتیں ہوئیں جو ٹیپو کی انواع سے کئی جگہ شکستیں اٹھا چکے تھے، انہیں اس کی حیدر آباد کے انگریز ریذیڈنٹ میجر کرک پیاٹرک سے بھی ملاقات ہوئی، جس نے ولزلی کو یہ سنکتے کی بات بتائی کہ جب تک ہندوستان میں فرانسیسی موجود ہیں، انگریز ناکام رہیں گے۔ انہیں اس نے سر جان شور کے وہ خطوط دیکھے جن میں اس نے اپنے انگلستانی آقاؤں کو لکھا تھا: "افسوس کہ میں ٹیپو کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نہیں روک سکا۔"

ہندوستان پہنچتے پہنچتے ولزلی، یہاں کی ساری تفصیلات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ سلطان نے فرانسیسی حکومت کو، مارشیس میں سفارت بھیج کر جو عہد و پیمان

ے تھے، پورنیا نے اس کی ایک نقل نے گورنر جنرل ولزلی کو بھجوا دی، دوسری طرف میر غلام علی
گرد کے ذریعے سلطان ٹیپو کی سے جو خط وکتابت ہوتی تھی اس کی نقلیں بھی انگریزوں کو پہنچ چکی
ھیں، لارڈ ولزلی کی آمد کی اطلاع سلطان کو بھی ہو چکی تھی۔ وہ انگریزی عدد دہ میں ہونے والے
دہ بدل کو تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی تشویش کا اظہار اپنے امراء پر بھی کیا۔ میر
صادق نے سلطان کی تشویش کو ہنسی میں اڑا دیا۔ بولا "اللہ پاک کی قسم حضور والا! یہ فرنگی
کتی ہزار میل کا سفر کر کے یہ ہزار پریشانی دخرابی ہندوستان تک پہنچتے ہیں، یہ بھکی ہاری قوم
حضور والا کی بہادر افواج کا کس طرح مقابلہ کر سکتی ہے بھلا، آپ بے فکر رہیں آپ کے غلام ہیں
وہ مزہ چکھائیں گے کہ بھاگ کر اپنے وطن ہی میں دم لیں گے جا کر!"

سلطان نے کہا "اگر یہ قوم بہادر ہوتی تو ہم ہرگز فکر مند نہ ہوتے، یہ ایک مکار قوم
ہے جو میدان جنگ کے بجائے سازشی تلے تصیر کر کے عیاری اور مکاری کے ہتھیاروں سے لڑتی ہے"

"یہ اور بھی اچھا ہے!" میر صادق نے جواب دیا۔ "قسم کلام پاک کی حضور والا! کا ٹھ کی
ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی، ان کی سازش اور سیاست بار بار تو کامیاب ہوتے سے رہی، جب ان
کا یہ طریقہ ہمارے بچے بچے کو معلوم ہو جائے گا تو گویا ان کا یہ حربہ بالکل بے کار ہو جائے گا اور
اس وقت یہ کیا کریں گے؟"

سامنے میر غلام علی لنگڑا بھی ٹانگیں پھیلائے آداب سلطانی کا خیال کئے بغیر بیٹھا تھا۔
سلطان اس سے مخاطب ہوا۔ "پورنیا کیوں میر صاحب! تمہارا کیا خیال ہے کیا ہم انگریزوں کو ان
کے ناپاک منصوبوں میں ناکام بنا دیں گے؟"

غلام علی نے جواب دیا "حضور والا! یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اگر یہ ناچیز
ثبات میں دے گا تو ممکن ہے اسے خود ستائی اور چاپلوسی میں شمار کیا جائے اور اگر نفی میں دے گا
تو یہ دروغ گوئی ہو گی۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ میر صادق نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی تائید
کر دی جائے!"

پورنیا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ سلطان نے اسے بھی بولنے کی اجازت دی۔ کہا
"پورنیا! کیا تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں خداوندا!" پورنیا ادب سے گویا ہوا۔ "اس ناچیز کی تو یہ رائے ہے کہ خداوند
انگریزوں سے خواہ مخواہ خائف ہیں، یہ جو نظام دکن، دائی ارکاٹ اور مہیشوائے پونا اور انگریزوں
میں اتحاد اور یگانگت کی عبریں گرم ہو رہی ہیں، سب افواہیں ہیں، معلوم نہیں یہ افواہیں کون
چھوڑتا ہے اس غلام کا تو یہ خیال ہے کہ فرنگی خود یہ افواہیں پھیلا رہے ہیں تاکہ حضور والا ان سے

خوفزدہ ہو جائیں اور اپنے چڑھ سیدا کی دشمنی مول لے لیں!"

سلطان نے جواب دیا۔ "خدا کرے تم جو کہہ رہے ہو وہی درست ہو لیکن ہمیں اس کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔" پھر وہ میر قمر الدین سپہ سالار سلطنت خداداد کی طرف رجوع ہوا۔ اسے حکم دیا۔ "قمر الدین! لوگوں کو ہر وقت تیار رکھو معلوم نہیں کس وقت نقارہ جنگ بج جائے!"

آزمودہ کار قمر الدین نے جواب دیا۔ "حضور بالکل بے فکر رہیں، اب جو جنگ ہوگی وہ ہماری آخری جنگ ہوگی!"

میر صادق نے آہستہ سے نیاز مندانہ عرض کیا۔ "حضور والا! واگیہ کا کیا بتا ہے؟"

سلطان نے حکم دیا۔ "اسے کل مابدولت کے روبرو حاضری کا حکم دیا جائے!"

میر صادق نے نیاز مندی سے کہا۔ "بہت خوب حضور والا! اور اس غلام کی رائے میں، کل ہی اسے نعمت اسلام سے بھی نواز دیا جائے۔ قرآں پاک کی قسم بڑا نیک کام ہوگا۔"

پورنیا نے ناگواری سے منہ بنایا لیکن میر صادق کے علاوہ کوئی اور اسے محسوس نہ کر سکا۔

روزی، بیکار واگیہ کے پاس بیٹھی گھنٹوں باتیں کرتی رہتی۔ وہ فرانس کے شمالی صوبے نارمنڈی کے دیپ نامی شہر سے تعلق رکھتی تھی جہاں جون آف آرک کو جادوگر قرار دے کر زندہ جلا دینے کے ایک عرصے بعد ولی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے وطن میں سیبوں سے بڑا پیار کیا جاتا تھا۔ وہ وہاں کی ہر شے کا نہایت عقیدت اور محبت سے ذکر کرتی، وہ دریائے سین کی پر لطف روانی کا ذکر اس طرح کرتی جیسے وہ کسی بہشتی دیبا کا ذکر کر رہی ہو جب اسے اچانک یاد آتا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی کیونکہ اس تصور میں اس کے ساتھ پامر موجود ہوتا جو معلوم نہیں کہاں لاپتہ ہو گیا تھا۔

روزی اپنے پامر کی کچھ یادگاریں سامنے رکھ کر اس کا والہانہ ذکر کر رہی تھی اس نے ایک نارنجی رنگ کے رومال کو اٹھا کر پیشانی سے لگایا۔ بولی۔ "جب پامر کے سر میں درد اٹھتا تھا تو وہ ہمیشہ اسے اپنی پیشانی کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا!"

واگیہ نے سنی ان سنی کے انداز میں روزی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

روزی نے ایک چوڑے کناروں والا ہیٹ اٹھایا۔ بولی۔ "وہ یہاں کی دھوپ سے بہت پریشان ہو جاتا تھا، جب باہر نکلتا تو اسے ضرور پہن لیتا تھا!"

داگیہ نے بے توجہی سے کہا۔ "اب ان باتوں سے فائدہ؟ مرے ہوئے انسان کو یاد کرنے سے فائدہ!!"

روزی اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگی، بولی۔ "داگیہ! تم مجھ سے کچھ چھپاتے ہو۔ معلوم نہیں کیوں، تم مجھ سے پامر کی بابت جو کچھ کہتے ہو اس پر مجھے یقین نہیں آتا!"

"یہ اس لئے کہ تم پامر کی محبت میں پاگل ہو گئی ہو، ایک معمولی ناتجربے کار نوجوان سے اتنی محبت! حماقت نہیں تو اور کیا ہے!"

روزی سے پھر سے غیر متوقع سوال کیا۔ "اگر میں تم سے یہ وعدہ کر لوں کہ اپنے دل سے پامر کا خیال نکال کر تمہیں اپنے دل میں بسا لوں گی تو کیا تم میری چند باتیں مان لو گے؟"

داگیہ نے غیر یقینی انداز میں روزی کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ تم پامر کی جگہ مجھے کس طرح دے دو گی!"

"لیکن تم میری بات کا یقین کر لو!" روزی کہنے لگی۔ "میں ہندوستان چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ مجھے یہاں کچھ اچھا نہیں لگتا۔ کیا تم میرے ساتھ فرانس چلو گے، وہاں ہم دونوں دریائے سین کے کنارے اپنی زندگیاں گزار دیں گے!"

"ناممکن!" داگیہ نے جواب دیا۔ "میں اپنے وطن کو دشمنوں کے حوالے کر کے کس طرح جا سکتا ہوں!!"

روزی نے کہا۔ "تم اپنے وطن کو انگریزوں سے کس طرح بچا لو گے؟"

داگیہ نے جواب دیا۔ "کل کا حال کسے معلوم ہے، میں تو کس ایک بات جانتا ہوں وہ یہ کہ اگر میں بدقسمتی سے انگریزوں اور مان کے حلیفوں کو شکست نہ دے سکا تو انہیں تنگ ضرور کرتا رہوں گا۔ میرے پاس نہ تو خطۂ زمین ہے نہ کوئی قلعہ، میں شب و روز اپنے ساتھیوں کے ساتھ وطن دشمنوں پر تاخت کرتا رہوں گا یہاں تک کہ ایک دن شاید میں خود بھی اپنے وطن پر قربان ہو جاؤں۔"

روزی حیرت سے اس سرپھرے جیالے کی باتیں سنتی رہی، بولی۔ "داگیہ! تم اپنے کردار اور باتوں سے میرے دل میں گھر کرتے جا رہے ہو اگر تم چاہو تو میں تمہاری خاطر اسی ملک میں رہ سکتی ہوں لیکن میں اس دلکش حلقے میں نہیں رہنا چاہتی تم مجھے شمالی ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں لے چلو، ہمالیائی بستیوں میں، میں اپنی یقیہ زندگی گمنامی میں گزار دینا چاہتی ہوں!"

"روزی! میرے سامنے ایک عظیم الشان مقصد ہے، اس مقصد کو نظر انداز کر کے

تمہیں کس طرح حاصل کر سکتا ہوں!!"

"تب پھر تم ایسا کرو واگیہ کہ مجھے کسی طرح پامر سے ملا دو، میں اس سے کہہ دوں گی کہ اب میں تم جیسے معمولی انسان سے محبت نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے واگیہ جیسا بہادر اور صاحب کردار مل گیا ہے، میں پامر کے عہد و پیماں اسے واپس کر دینا چاہتی ہوں!"

واگیہ نے روزی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، بولا "میں سمجھا تمہارا مطلب! خوب!!" اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ واگیہ باہر نکلا تو پتہ چلا "قبلہ عالم سلطان ٹیپو نے یاد فرمایا ہے ہیں!"

واگیہ اندر گیا اور روزی سے بولا "مجھے سلطان نے یاد کیا ہے اب شاید میں کچھ کارآمد ہو جاؤں، اگر موقع ملا تو پامر کی بابت کچھ اور باتیں ہو جائیں گی!"

اس کے بعد واگیہ چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ روزی اسے بے چینی سے دیکھتی رہی، جب کہانی رنگ پر آئی تو داستان گو محفل سے اٹھ گیا۔

واگیہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا جب شاہی ڈیوڑھی پر پہنچا تو اچانک اس پر کئی آدمی ٹوٹ پڑے، یہ حبب بھاری بھرکم اور تن و توش کے لوگ تھے انہوں نے واگیہ کو قابو میں کر کے زنجیر سے جکڑ دیا۔ شاہی جراح ان کے ہمراہ تھا، یہ واگیہ کو لے کر شاہی ڈیوڑھی کے ایک بند حصے میں چلے گئے وہاں شاہی جراح اپنا استرا لے کر بے بس واگیہ کی طرف بڑھا۔

واگیہ نے حیرت سے پوچھا "کیا تم لوگ مجھے ہلاک کر دینا چاہتے ہو؟"

"نہیں!!" شاہی جراح نے جواب دیا "مجھے وزیر اعظم میر صادق نے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہاری اسلام پسندی کے پیش نظر سنت کر کے مسلمان بنا لوں، میرا خیال ہے میرا یہ فعل تمہیں گراں نہیں گزرے گا!"

بے بس واگیہ نے آنکھیں بند کر لیں، پوچھا "کیا اس میں سلطان کی مرضی بھی شامل ہے؟"

"ہاں!" شاہی جراح نے جواب دیا "سلطان نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں میر صادق کے حکم کی تعمیل کروں!"

واگیہ نے آہستہ سے کہا "تم سلطان کا حکم پورا کرو!"

اور فوراً بعد واگیہ، دھوندو جی واگیہ کے بجائے شیخ احمد ہو چکا تھا۔ سنت کے بعد ایک عالم دین نے اس سے کلمہ پڑھوایا اور اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا۔

واگیہ نے عالم دین سے کہا "حضرت! آپ سلطان سے اس غلام کا سلام عرض کر دیں

ہیں کہ مجھے اپنا اسلامی نام شیخ احمد پسند تو ہے لیکن میں چاہتا ہوں مجھے ملک جہاں خان کے
اب سے بھی سرفراز کیا جائے!"

تھوڑی دیر بعد سلطان نے اسے اس کا پسندیدہ خطاب بھی عطا فرما دیا۔

چند دنوں بعد جب ملک جہاں خان کی سالگرہ منائی گئی تو سلطان کی طرف سے ایک عالم
پابندی سے حاضر ہوتے لگا اور ملک جہاں خان کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے لگا۔

روزی کو بھی اس واقعے کا علم ہو گیا وہ کانپ گئی اور اس نے ملک جہاں خان سے پوچھا
گیہ بھی! کیا تم اب بھی سلطان کے وفادار ہو؟"

ملک جہاں خان نے جواب دیا۔ "براہ کرم تم مجھے اب واگیہ جی نہ کہو۔ اب میں مسلمان ہو
ا ہوں اور میرا اسلامی نام ملک جہاں خان ہے!"

روزی نے پوچھا۔ "کیا تم مسلمان ہو جانے پر خوش ہو؟"

"بالکل خوش ہوں، میں ہمیشہ سے اسلام کو پسند کرتا ہوں اور میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے
ں میں سلطان سے زیادہ میر صادق کا عناد کا قرار ہے اور میں اسے کسی طرح بھی کامیاب نہ ہونے
ں گا!"

جب وہ بالکل اچھا ہو گیا اور تعلیمات اسلامی سے بھی بہرہ ور ہو گیا تو سلطان کو اس
بڑا رحم آیا اس نے میر صادق کو حکم دیا۔ "میر صاحب! ملک جہاں خان ہر طرح یہ ثابت کر چکا ہے
وہ بھلا وفادار ہے، اب ہمیں اسے کسی قلعے کی سرداری سونپ دینی چاہیئے تم اسے کل ہی کسی
لعے پر روانہ کر دو!"

میر صادق نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے، بولا۔ "قبلہ عالم! اگر آپ اسے کوئی
تے داری دے رہے ہیں تو بشوق دیں لیکن اگر اس غلام کی رائے معلوم کریں گے تو اللہ پاک کی قسم
ہر ناچیز یہی کہے گا کہ اس جیسے راہزن کو کوئی ذمہ داری کا منصب عطا فرمانا سخت غلطی ہو گی وہ
ایک ڈاکو ہے جو اپنے چند اوباشوں کے ساتھ حیدر آباد، پونا اور خود حضور والا کے قلمروؤں پر
چھاپے مار کر گزر بسر کرتا رہا ہے ایسے دانی اور ناقابل اعتبار شخص کو مطلق العنان بنا دینا مصالح
ملکی کے خلاف ہے کیونکہ اس کا اندر یہ ہے کہ آگے چل کر وہ ایسا فتنہ برپا کرے گا کہ اس کا تدارک
دشوار ہو جائے گا!"

میر صادق کی باتیں اثر کر گئیں اور سلطان نے ملک جہاں خان کو کوئی منصب بھی نہ دیا۔

ملک جہاں خان جب بالکل مایوس ہو گیا تو اس نے ایک دن سلطان سے درخواست
کی کہ اسے سلطان کے بڑے بیٹے فتح حیدر سلطان کی ملازمت میں چلا جانے دیا جائے پھر جب

سلطان کو ضرورت ہوگی ملک جہاں خان آجائے گا!"

سلطان نے اس بات کی اجازت دے دی۔

ملک جہاں خان نے روزی سے کہا۔ "روزی! میں سرنگاپٹم کے باہر شہزادے حیدر کی ملازمت میں جارہا ہوں، ظاہر ہے تم میرے ساتھ نہیں چل سکو گی، بولو، کہاں پسند کرو گی؟"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی!" روزی نے جواب دیا۔ "شہزادے کی نوکر میں بہ فرانسسی موجود ہیں، ان دنوں میرے چچا بھی وہیں گئے ہوتے ہیں!"

روزی ملک جہاں خان کے ساتھ سرنگاپٹم کے باہر کمری گنبد کے پہاڑی علاقے چلی گئی۔

سلطان نے فرانس کے لئے جو سفارت مارشیس بھیجی تھی واپس آچکی تھی اور دو ہفتے پہلے ولزلی نے سلطان کو لکھا تھا۔

"آپ یہ خبر سن کر خوشی محسوس کریں گے کہ یورپ میں انگلستان نے فرانس کو شکست دے دی ہے!"

سلطان کو خوب معلوم تھا کہ یہ خبر اسے جلانے کے لئے بھیجی جارہی ہیں۔

سلطان کو ۱۸ نومبر (۱۷۹۸ء) کو ایک خط اور حوصول ہوا۔ لارڈ ولزلی نے لکھا

"یہ ناممکن ہے کہ آپ یہ سمجھ رہے ہوں مجھے اس خبر کی اطلاع نہیں ہے کہ آپ کچھ دشمن فرانس سے کس قسم کی خط و کتابت کر رہے ہیں۔ معاملے کی تحقیق کے لئے میجر ولڈن کو جارہا ہے اور اسے یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ کمپنی کے تحفظ کے لئے سلطان سے جو علاقہ چاہے طلب کر لے۔"

سلطان، ولزلی کے مقصد سے آگاہ ہوگیا اور اس نے جنگ کی تیاری شروع کر دی سلطان فوجیں لے کر سدا سیر پہنچا اور انگریزی فوجوں سے نبرد آزما ہوگیا۔ وہیں اس نے یہ تشویشناک خبر سنی کہ انگریزی افواج سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہی ہیں، سلطان اپنی افواج کے ساتھ سرنگاپٹم آگیا۔

میر قمرالدین جسے انگریزوں کی سرکوبی کے لئے ایک دوسرے محاذ پر متعین کیا گیا تھا وہ انگریزی فوج کے پیچھے پیچھے جنگ کئے بغیر اس طرح آیا گویا وہ انگریزی فوج کا بارہواں حصہ ہو۔

انگریزی فوجیں کسی مدافعت یا رکاوٹ کے بغیر سرنگاپٹم کے چاروں طرف پھیل

کے ساتھ، ان کے حلیف بھی تھے، سلطان کے ایک منصب دار میر قاسم علی نے انگریزی
، قلعے کے جنوب مغربی گوشے کے اس حصے میں رہنمائی کی جو قلعے کا سب سے کمزور حصہ
یزی توپیں قلعے کے گرد مورچے مضبوط کر کے گولہ باری کرنے لگیں، اب سلطان محصور
ھا اور اس بات پر حیران تھا کہ اس کے جرنیل موثر مدافعت کیوں نہیں کر رہے اس موقع
سلم ملک جہان خان یاد آیا جو اس سے دل برداشتہ ہو کر ان کے بڑے بیٹے فتح حیدر
کری گڑھ کے پہاڑی علاقے میں چلا گیا تھا اس نازک موقع پر سلطان نے فرانسیسی
طلب کیا اور ان سے مشورہ چاہا۔ فرانسیسی جرنیل موسیو پیرو کو مخاطب کرتے ہوئے
نے کہا۔

"میرے غیر ملکی دوستو! تم دیکھ رہے ہو کہ ہم ایسی نازک حالات سے دوچار ہیں
لینان نہیں کیا جا سکتا جنہیں ہم اب تک اپنا معتمد اور یار غار جانتے تھے ان کی وفاداری
ی حیرت سے دیکھ رہے ہیں، غنیم کا زور روز بلکہ ساعت بساعت بڑھتا جا رہا ہے
ت میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

موسیو پیرو نے شدت جذبات سے جواب دیا۔ "حضور والا! ہم نے آپ کا نمک کھایا
حضور والا نے ہمیشہ ہی ہم پر بھروسہ کیا ہے ہم ہر وقت اپنا خون بہانے کو تیار ہیں، ان
حالات میں ہم یہی رائے دے سکتے ہیں کہ حضور والا جواہرات کی پیٹیاں، اشرفیاں اور نقد
قیمتی سامان لے کر، خواتین حرم سرا کے ساتھ، نصف رات کے بعد شمال صوبے سرا پاچنل
چلے جائیں، باہر دس ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادہ فوج جاں نثاری کو موجود ہے وہ آپ کو
ت سرا پاچنل ورگ تک پہنچا دے گی۔"

سلطان نے پوچھا۔ "اور سرنگاپٹم کس پر چھوڑ جائیں؟"

موسیو پیرو نے جواب دیا۔ "سرنگاپٹم اور قلعے کو فدوی اور فدوی کے ہم وطن سپہ سالار
لاں کے سپرد فرما جائیں ہم اس کا وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک ہم میں سے ایک بھی زندہ رہے
ور کے ادائے حق نمک میں کوتاہی نہ کرے گا۔"

موسیو پیرو اتنا کہہ کر ایک دم چپ ہو گیا۔ سلطان نے کہا۔ "ہاں ہاں" اور اور تم چپ
گئے؟ بولو تم اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"

موسیو پیرو نے سر جھکا رکھا تھا۔ سلطان سے نظریں ملائے بغیر بولا۔ "اگر حضور والا
دی کی اس تجویز سے اختلاف ہو تو انگریزوں کو دوست بنا لینے کی ایک اور تجویز بھی فدوی
س موجود ہے۔"

سلطان نے کہا۔ "بیان کرو!"

موسیو سپیو نے عرض کیا۔ "انگریزوں کو ہم فرانسیسیوں کے ساتھ کینہ و پرخاش زیادہ ہے، حضور والا ہم فرانسیسیوں کو انگریزوں کے حوالے فرما دیں، ہمیں یقین ہے کہ ہماری گرفتاری کے انگریز مصالحت پر آمادہ ہو جائیں گے!"

سلطان، موسیو سپیو کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ نہایت دکھ سے کہنے لگا۔ "ہم تم غریب الوطن ہماری طلبی پر یہاں آئے ہو اور ہمیشہ ہمارے وفادار اور رفیق رہے ہو۔ پھر یہ طرح ممکن ہے کہ تم جیسا شریف، بہادر، نمک حلال اور وفادار دوست دشمنوں کے حوالے کر دیا اگر ہماری پوری سلطنت تلف و تاراج ہو جائے تو بھی ہمیں افسوس نہ ہوگا لیکن یہ ناممکن ہے تمہیں انگریزوں کے حوالے کر دیں!"

سلطان نے اندر جا کر جواہرات، خزانہ اور توشک خانے کا قیمتی سامان یک جا ان کے لئے ہاتھیوں اور ساتھیوں کا انتظام بھی کو لیا گیا۔ مستورات کے لئے تیز رفتار میلوں اور کا انتظام بھی ہو گیا۔

اس کے بعد سلطان نے پورنیا اور میر صادق سے فرانسیسیوں کی تجویز کا ذکر کیا اور ا مشورہ طلب کیا کہ ان حالات میں سلطان کو کیا کرنا چاہیئے؟

میر صادق نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "اللہ پاک کی قسم حضور والا۔ ہم نمک خوار جب زندہ ہیں حضور والا کے پسینے پر اپنا خون بہا دیں گے رہا تو م فرانس کی تجویز کا مسئلہ، تو اللہ پاک کی قسم اس قوم نے کس سے وفا کی ہے جو آپ کے ساتھ کرے گی۔ یہ غلام پہلے ہی عرض ہے کہ فرانسیسی اور انگریز الگ الگ نہیں ہیں، دونوں ایک ہیں "ایک سگ زرد ہے تو دا ہمدرد شغال"

سلطان نے پورنیا کی طرف دیکھا، اس نے عرض کیا۔ "حضور والا کو یہ یقین دلا چاہیئے کہ جیسے ہی حضرت سرنگاپٹم کا قلعہ فرانسیسیوں کے حوالے کریں گے یہ لوگ انگریزوں حوالے کر دیں گے!"

سلطان نے کہا۔ "تب پھر تم لوگ انگریزوں سے صلح کی بات کرو!"

پورنیا نے جواب دیا۔ "ہاں یہ آسان اور ممکن ہے!"

میر صادق نے کہا۔ "وہ صلح کی بات ہو یا نہ ہو لیکن حضور والا کو یہ یقین کو لینا چاہیئے انگریز قوم حضرت سے جنگ میں نہیں جیت سکتی، ہاں عیاری اور مکاری میں البتہ اسے وال پر تفوق حاصل ہے!"

سلطان کا ایک وفد صلح کی درخواست لے کر انگریز جرنیل بارس کے پاس گیا اسے پہلے ہی سے یہ خفیہ ہدایت مل چکی تھی کہ سرنگاپٹم کے فتح ہونے تک صلح کی گفت و شنید نہ کی جائے جنرل بارس سلطان کے مزاج سے واقف تھا۔ اس نے سلطان کے وفد کے سامنے صلح کے لئے ایسی شرائط رکھ دیں جنہیں سلطان کسی قیمت پر بھی نہ مان سکتا تھا۔

جنرل بارس نے کہا۔ "سلطان تمام فرانسیسیوں کو برطرف کر کے، تمام ساحلی علاقے ہمارے حوالے کر دے اور غیر مشروط اطاعت کا اقرار کرے تو صلح کی جا سکتی ہے اگر یہ تینوں شرطیں چوبیس گھنٹوں کے اندر مان لی گئیں تو صلح ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔"

جنرل بارس کی شرائط صلح جب سلطان کے سامنے بیان کی گئیں تو اس نے حقارت سے انہیں مسترد کر دیا۔

توپوں کے چلنے کی آوازیں پورے سرنگاپٹم میں گونج رہی تھیں، مختلف سمتوں سے انگریزی افواج کے گولے سرنگاپٹم میں برسا ہی چاہتے تھے۔ ادھر سلطانی افواج کے گولے فضا میں تن اور مٹی بکھیر رہے تھے کیونکہ ان گولوں میں بارود کی جگہ سن اور مٹی بھری ہوئی تھی۔

سلطان نے جواہرات، خزانے اور توشک خانے کے قیمتی سامان اور حرم سرا کے ساتھ جانے سے پہلے اپنے امراء کو فیصلے سے آگاہ کیا۔ کہا۔ "فرانسیسی دوستوں کی رائے مناسب تھی ہم سرا پتا چتیل ورگ دوانز ہو سے ہیں کیونکہ سرنگاپٹم کی جنگ میں اب کچھ نہیں رہا۔"

بدرالزمان نامی ایک خدمتگار نے سلطان کو اس فرانسیسی تجویز پر عمل کرنے سے روکا۔ اس نے کہا۔ "قبلۂ عالم! آپ یہ کیا غضب فرما رہے ہیں، حضور والا کے جاں نثاروں کو جیسے ہی یہ معلوم ہوگا کہ حضرت اپنی حرم اور خزانے کے ساتھ سرنگاپٹم سے باہر تشریف لے گئے ہیں ہمیں ہار بیٹھیں گے اور سارا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ ان حالات میں آپ کا یہ غلام، حضور والا کے اس غیر شاہانہ اور شایانِ ہمت کے خلاف عمل کی تائید نہ کرے گا۔"

سلطان نے بدرالزمان کے جواب پر اپنے سامنے موجود امراء کی صورتیں دیکھیں وہ بھی سر جھکائے کھڑے تھے، اور ان میں سلطان سے آنکھیں ملانے کی بھی ہمت نہ تھی۔

سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "رضائے مولا بر ہمہ اولیٰ!"

اور اس نے تمام بندھا ہوا سامان توشک خانے میں رکھوا دیا۔

۴ مئی کی صبح دس بجے نجومیوں نے حاضر ہو کر سلطان کو بتایا کہ آج کا دن حضور

کے لئے بہت منحوس ہے، سلطان نے تحوست دور کرنے کے لئے ایک ہاتھی کالے تخلی جھول سمیت جس کی چھالر میں کئی سیر موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ فقراء میں تقسیم کر دیا۔ اسے خبر ملی تھی کہ قلعے کی شمالی فصیل ٹوٹ چکی ہے، سلطان قصیل کے معائنے کر پہنچا اور وہیں آم کے سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر خاصہ طلب کیا۔ اس کے آس پاس جو امراء اور وزراء موجود تھے وہ سلطان سے نظریں چرا رہے تھے۔ کھانا آیا۔ سلطان نے پہلا لقمہ منہ میں رکھا ہی تھا کہ جنوب سے آہ و واویلا کا شور بلند ہوا۔ سلطان نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پوچھا۔ "معلوم کیا جائے کہ یہ لوگ آہ و واویلا کیوں مچا رہے ہیں؟"

واویلا کرنے والے جنوب مغربی محاذ کے سپاہی تھے۔ انہوں نے پیاندہ ناک خبر سنائی کہ جنوب مغربی محاذ کا دفادار جرنیل سید فقار شہید ہو گیا سلطان نے ہاتھ کا لقمہ رکھ دیا اور اپنے امراء اور وزراء پر نظر ڈالی۔ سبھی مطمئن اور بے فکر سر جھکائے کھڑے تھے سلطان نے انہیں شاید پہلی بار ملامت کی، کہا "غداروں تمہیں اپنی غداری کا جو صلہ ملے گا ہمیں معلوم ہے ہندوستان غیر ملکیوں کی غلامی میں چلا جائے گا۔ یہاں کی صنعت و معیشت تباہ ہو جائے گی۔ تمہارے پسینے اور خون کی مہنگی انگور مزدور کے چہرے پر جھلکے گی۔ تم اور تمہاری نسلیں اس ملک میں محتاج اور ذلیل ہو کر ایک ایک دانہ چادل اور پیاز کی ایک ایک گانٹھ کو ترسیں گی۔"

سلطان کھڑا ہو گیا۔ تلوار پر تلے میں ڈالی اور دونالی بندوق لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا، اور ڈڈھی نامی دروازے سے باہر نکلا۔ سلطان کے امراء اور وزراء ایدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ سلطان کے باہر نکلتے ہی میر صادق نے ڈڈھی دروازے کو بند کرا دیا اور وزیر اعظم کی حیثیت سے پہرے داروں کو حکم دیا۔ "خبردار جو یہ دروازہ اب کھولا گیا۔ وہ سلطان ہی کیوں نہ ہو یہ دروازہ اب کسی کے لئے بھی نہ کھلے گا کیونکہ کمزور سپاہیوں، سلطان کے بہانے کون یہاں داخل ہونے کی کوشش کرے۔"

ان ہدایات کے بعد میر صادق شہر کی مشرقی سمت روانہ ہو گیا۔ یہاں اس کی کوٹھی تھی، میر صادق فاتحین کو اپنی کوٹھی میں خوش آمدید کہنا چاہتا تھا۔

ڈڈھی دروازے کا احمد خان نامی ایک وفادار سپاہی میر صادق کے احکامات کو شک و شبہے سے سن کر اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ پہلے اس کا یہ خیال تھا کہ میر صادق، سلطان کے عقب میں محاذ جنگ پر جائے گا لیکن جب اس نے اس غدار کو اپنی کوٹھی، علاوہ ازیں گنجام کی طرف جاتے دیکھا تو گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس کے سر پر جا پہنچ گیا اور اسے للکارا۔ "او غدار! کہاں جا رہا ہے؟"

میر صادق نے پلٹ کر دیکھا۔ احمد خان ـــــ کی تلوار بجلی کی طرح کوندی اور میر

صادق کا سر اڑا کر واپس آ گئی۔ میر صادق کا بے جان لاشہ گھوڑے سے گر کر پھڑکنے لگا۔

سلطان اپنے محافظ دستے کے ساتھ شہر کے شمال مغربی حصے میں دہلی دروازے پر پہنچا۔ یہاں اس کی ایک انگریزی دستے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کے امراء جنگ میں شریک ہونے کی بجائے، دور سے رومال ہلا ہلا کر انگریزوں کو یہ بتا رہے تھے کہ سلطان میدان میں آ چکا ہے اسے فوراً ہی محاصرے میں لے کر کھیل ختم کیا جا سکتا ہے۔

کسی وفادار نے اطلاع دی "قبلۂ عالم! انگریزی سپاہ جنوبی اور جنوب مغربی فصیل سے اندر داخل ہو چکی ہے۔"

سلطان نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ "میر معین الدین کیا کر رہا ہے۔ اور وہاں کی سپاہ کہاں چلی گئی؟"

مخبر نے عرض کیا۔ "میر معین الدین کا کچھ پتہ نہیں اور ان محافظوں کی سپاہ کو پورنیا نے تنخواہیں دینے کے بہانے دو گھنٹے پہلے ہی اپنے پاس بلا لیا ہے۔"

انگریزوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ سلطان کے محافظ ایک ایک کر کے شہید ہوتے جا رہے تھے، جب اس محاذ کو قالو سے نکلتے دیکھا تو سلطان لڈی دروازے پر واپس آیا۔ لیکن یہ بند ہو چکا تھا۔ سلطان نے اسے کھولنے کا حکم دیا تو کسی غدار نے اندر سے کہا۔ "دروازہ نہیں کھل سکتا۔ حضور والا خود کو انگریزی سپاہ کے حوالے کر دیں!"

سلطان دانت پیستا، قلعے میں شہر کے شرق میں بڑے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے ماتحت طرف اس کا محل تھا جس کے اندر گھر بارود کی سرنگ بچھی ہوئی تھی، سلطان اپنے محل کو اڑا دینا چاہتا تھا لیکن ان ہنگامی حالات میں اسے اس کا موقع نہ مل سکا۔

جب وہ شہر کے بڑے دروازے پر پہنچا۔ اس وقت مشرقی فصیل سے بھی انگریزی سپاہ اندر داخل ہو چکی تھی، اب وہ تین طرف سے محصور ہو چکا تھا۔ مشرق، مغرب اور جنوب سے آنے والی انگریزی افواج نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ سلطان نے بھرپور کوشش کی کہ بڑے دروازے میں داخل ہو کر دوسری طرف نکل جائے لیکن یہاں بڑا ہجوم تھا۔ سلطان گولیاں چلاتا آگے بڑھتا رہا آخر ایک گولی سلطان کے سیدھے بازو میں پیوست ہو گئی۔ سلطان تین چار قدم آگے بڑھ گیا اور تلوار کو دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے دوسری گولی کو بھی بچا لیا لیکن تیسری گولی پھر وہیں پیوست ہو گئی اور گھوڑا بھی زخمی ہو گیا۔ راجا خان نامی ایک سردار اس کے ساتھ تھا۔ سلطان نے راجا خان سے کہا۔ "ہم زخمی ہو گئے ہیں، ہمیں گھوڑے سے اتارو اور گھوڑے سے پانی کا انتظام کر دو!"

راجا خان نے کہا۔ "حضور والا! اب مقابلے کا وقت نہیں رہا۔ بہتر یہی ہے کہ حضرت

خود کو انگریزوں پر ظاہر کر دیں۔"

سلطان نے حقارت سے کہا۔ "کیا تم دیوانے ہو گئے ہو، خاموش رہو! کیا تم نہیں جانتے کہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے!"

راجا خان نے سلطان کو گھوڑے سے اتارنا چاہا لیکن وزن برداشت نہ کر سکا اور وہ دونوں ایک ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ سلطان کے دو سرے جانثاروں نے اسے ایک پالکی میں لٹا دیا۔ اس دوران انگریزی سپاہ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ایک انگریز سپاہی سلطان کی پالکی کے قریب پہنچا اور اس کی پیٹی اور شمشیر پر قبضہ کرنا چاہا۔ سلطان نے تلوار کے پھریلوار سے انگریز کو لنگڑا کر دیا۔ انگریز سپاہی نے گرتے گرتے اپنی بھری ہوئی بندوق سلطان پر خالی کر دی، اور شام مشرق کے بقول ملّتِ اسلامیہ ہند کی ترکش کا خدنگِ آخریں بھی غداروں کے ہاتھوں ضائع گیا۔ ٹیپو، جس نے کئی بار اپنے دشمنوں کی متحدہ قوتوں کو شکست دی تھی، اپنے دوستوں اور منصب داروں کے اعتبار اور اعتماد پر شہید ہو گیا۔ سفینے والوں نے اپنے ناخدا کو طوفان کی ہلاکت خیزیوں کے حوالے کر کے، بخوشی غیر ملکیوں کی زنجیرِ غلامی اپنے گلے میں ڈال لی تھی۔ کوئی نہیں جانتا کہ اگر دل اور جمعیتِ مذہبی کے پیکر ٹیپو کو اپنے منصوبے میں کامیابی حاصل ہو جاتی تو برصغیر کا سیاسی نقشہ کیسا ہوتا؟ جس انگریز سپاہی نے سلطان کو شہید کیا تھا اسے کیا معلوم تھا کہ اس نے اپنی چند گولیوں سے ڈیڑھ سو سال کے لئے ہندوستان کی آزادی سلب کر لی ہے کیونکہ ٹیپو کے بعد پھر ایسا شجیع اور حریت مند بیوت ہندوستان نے نہیں جنا۔

سلطان کی ادھ کھلی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی حسرت اور بے کسی زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ آہ میں وہ جلا ہوا کھنڈر ہوں جسے گھر والوں ہی نے جلا کر تباہ و برباد کر دیا۔

ایک انگریز افسر چند سپاہیوں کے ساتھ محل کے دروازے پر پہنچا۔ ایک سفید جھنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے محل کے حفاظتی دستے سے کہا۔ "اب جنگ ختم ہو چکی محل کا دروازہ کھول دو اور سلطان کو ہمارے حوالے کر دو!"

حفاظتی دستے کے افسر نے کہا۔ "سلطان کے حکم کے بغیر دروازہ نہیں کھل سکتا!"

انگریز افسر نے سفید جھنڈا لہراتے ہوئے کہا۔ "یہ امن کا جھنڈا ہے، دروازہ کھول دو!"

انگریز افسر نے محافظ افسر کی یقین دہانی کے لئے اپنی تلوار نیام سے نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ محافظ افسر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد محل کا دروازہ کھل گیا اور انگریزوں نے سلطان کو ہر کہیں تلاش کر ڈالا لیکن سلطان نہیں ملا۔

قلعہ دار نے عرض کیا۔ "جنابِ والا! سلطان محل میں نہیں ہے بلکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ

وہ قلعہ کی اندرونی فصیل کے بڑے دروازے پر زخمی پڑا ہوا ہے۔"

انگریز افسر نے غصے میں کہا۔" اگر تیری یہ اطلاع غلط نکلی تو تجھے قتل کر دیا جائے گا!"

شام ہو چکی تھی اور پھر یہ شام رات کی سیاہی میں غائب ہو گئی۔ مشعلیں لئے انگریز افسر قلعے کے بڑے دروازے پر پہنچے۔ یہاں لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لاشوں کو کھینچ کھینچ کر سلطان کو تلاش کیا جانے لگا۔ یہیں راجا خان بھی زخمی پڑا ہوا تھا۔ جب سپاہیوں نے اسے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تو وہ چلایا۔" صاحبان! میں زندہ ہوں تم کسے تلاش کر رہے ہو؟"

قلعے دار نے جواب دیا۔" قبلۂ عالم کہاں ہیں؟"

راجا خان نے جواب دیا۔" وہ تو جان بحق ہو چکے!"

انگریز افسر نے بے چینی سے پوچھا۔" سلطان کی لاش کہاں ہے؟"

راجا خان نے انہیں سلطان کی لاش کے قریب لے جا کر کھڑا کر دیا۔ قلعے دار نے لاش کو پہچان لیا اور زار و قطار رونے لگا۔ اس وقت بھی سلطان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لارڈ ولزلی کا بھائی کرنل ولزلی بھی وہیں موجود تھا۔ اسے شبہ گزرا کہ سلطان ابھی زندہ ہے۔ اس نے جلدی سے سلطان کی نبض دیکھی، ہاتھ کو گرم پایا لیکن نبض ساکت تھی۔ سلطان کے جسم پر گولیوں کے چار زخم موجود تھے۔ تین جسم کے مختلف حصوں پر ایک سیدھے کان کے نیچے۔ اس وقت سلطان جسم پر سفید قمیض اور پھولدار پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور ایک سرخ ریشمی پٹکا کمر سے کسا ہوا تھا۔

افواجِ انگریزی کے جنرل بارس کے حکم پر سلطان کی لاش کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ شہزادوں اور ندیموں نے لاش کا آخری دیدار کیا۔ سلطان کے جنازے کے ساتھ مقامی لوگوں کے علاوہ انگریزوں کی چار کمپنیاں بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھیں، نواب حیدر علی کی قبر کے پاس یہ ہجوم ٹھہر گیا۔ یہیں نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ جنرل بارس بھی یہیں پہنچ گیا۔ سلطان کی لاش کو دیکھ کر فرطِ مسرت میں چلایا۔" آج سے ہندوستان ہمارا ہے!"

انگریزی کمپنیاں دو رویہ وصف بستہ کھڑی ہو گئیں، سلطان کا جنازہ ان کے درمیان سے گزار کر قریب تک پہنچایا گیا۔ ہوا کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ تھوڑی دیر بعد کی چمک اور کڑک شروع ہو گئی۔

پھر فوج کو آخری سلامی کا حکم دیا گیا۔ بندوقیں سر ہوئیں، مالچی توپیں چھوڑنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی بادلوں اور بجلی کی چمک کڑک میں شدت پیدا ہو گئی، اس قدر تو توپ کے آوازیں اتنی شدید تھیں کہ انگریزی توپوں کی آوازیں دب گئیں، سلطان کے دیوان خانے، محل سرا

اور سلطان کی تعمیر کردہ مسجد اعلیٰ پر بجلی گری۔ اس بجلی سے انگریزی کیمپ بھی نہ بچا، جس سے دو نامی افسر اور چند سپاہی ہلاک ہو گئے۔

مرنگا پٹم پر پوری طرح قابض ہو جانے کے بعد انگریزوں نے میر قمر الدین اور پورنیا کو شہزادہ فتح حیدر کے پاس روانہ کیا کہ وہ دونوں شہزادے کو سمجھا بجھا کر جنگ سے باز رکھیں۔

شہزادہ فتح حیدر اپنے باپ کی شہادت کی خبر سن چکا تھا۔ جب پورنیا اور قمر الدین اس کے پاس پہنچے تو اس نے دریافت کیا۔ "اب تم لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

پورنیا نے سر جھکا کر عرض کیا "صاحب عالم! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب جنگ فضول ہے اگر آپ انگریزوں کی اطاعت پر آمادہ ہو جائیں تو آپ کو حکومت مل سکتی ہے!"

قمر الدین نے کہا۔ "مجھ سے انگریز افسروں نے یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر شہزادے نے جنگ نہ کی تو شہید سلطان کی حکومت آپ کے حوالے کر دی جائے گی!"

شہزادے نے جہاں خان کی طرف دیکھا اور پوچھا "تم کیا کہتے ہو؟"

ملک جہاں خان نے کہا "آپ چاہیں تو ان غداروں کی باتوں پر اعتبار کر لیں، ورنہ میری ناقص رائے تو یہ کہتی ہے کہ گر مرنگا پٹم نکل گیا ہے تو پروا نہیں، ابھی سلطنت خداداد کے دوسرے قلعوں سے جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے، اور میں شہزادے کے یہ یقین دلانے پر تیار ہوں کہ زندگی کی آخری سانس تک اس کا ساتھ دوں گا!"

لیکن شہزادہ انگریزوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شہزادہ اپنی فوج کو پورنیا اور قمر الدین کے ساتھ لے کر مرنگا پٹم انگریزوں کی اطاعت کرنے روانہ ہو گیا۔

ملک جہان جان باہر نکلا اور رمزی کو ساتھ لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے چلتے چلتے شہزادے سے کہا "شہزادے! میں ان غداروں پر اعتماد نہیں کر سکتا اس لئے مجبوراً شہزادے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

کیپٹن کے سامنے جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ حصے بخروں کے بعد بچا کھچا حصہ کس کے حوالے کیا جائے تو بعض انگریز افسروں نے سلطان کے کمسن بیٹے کو تخت نشین کر دینے کی سفارش کی اس موقع پر سلطان کے میر البحر میر غلام علی نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ "سانپ کو ہلاک کر کے اس کے بچوں کی پرورش کرنا کہاں کی عقل مندی ہے!"

لیکن پورنیا نے ادب سے عرض کیا "جناب والا! ریاست میسور اڑتیس سال پہلے ایک چھوٹی ریاست تھی، اس ریاست کے حقیقی وارث ابھی موجود ہیں کیوں نہ یہ ریاست انہی کے

حوالے کر دی جاتے!"

انگریزوں نے پورنیا کی بات مان لی اور ریاست قدیم ہندو راجا کے خاندان کے حوالے کر دی گئی اور پورنیا کو اس ریاست کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔

نذرانے کے صلے میں میر غلام علی کی تین ہزار طلائی پگوڈا ماہانہ پنشن مقرر ہوئی جسے وہ بارہ سال تک وصول کرتا رہا۔

میر معین الدین ۱۷۳۳ء میں کے ہنگامے ہی میں مارا گیا۔ میر فرالدین سپہ سالار انواب سلطانی کو گرم کنڈ کی جاگیر عطا کی گئی جہاں وہ مرض جذام میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ میر صادق کی قبر پر لوگ جا جا کر تھوکتے اور غلاظت کے ڈھیر لگاتے لگے۔

ملک جہاں خان اس توقع پر کری گڑھ سے نکلا تھا کہ وہ کچھ ساتھی فراہم کر کے انگریزوں کو تنگ کرتا رہے گا اور روزی اس امید پر اس کے ساتھ ہو گئی تھی کہ شاید ان نازک حالات میں یہ بہادر انسان قیدی پامر کو رہا کر دے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ دو ایک دوسرے کے دشمن مصیبت زدہ ایکسان مصیبت کے ہاتھوں دوست ہو جاتے ہیں۔

وہ اونچی نیچی پہاڑیوں کی پر پیچ راہوں طے کرتا میسور کی جنوبی حدود سے گزر کر نیلگری میں داخل ہوا تو روزی نے خوفزدہ ہو کر دریافت کیا۔ "ملک جہاں خان! یہ تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟"

ملک جہاں اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے جہاں خان نے سر اٹھایا اور بے معنی انداز میں پہاڑی سلسلے پر نظریں جما کر بولا۔ "تمہارے محبوب پامر کے پاس!"

روزی کا مارے خوشی کے چہرہ دمکنے لگا۔ بے تابی سے دریافت کیا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"گھبراؤ نہیں، میں تمہیں وہیں لے چل رہا ہوں!"

جب وہ روزی کو لے کر اس درخت کے نیچے پہنچ گیا جہاں پامر کی لاش چھوڑ گیا تھا تو وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور ہاتھوں کا سہارا دے کر روزی کو بھی اتار لیا۔ روزی کو جہاں خان کی نیت پر شبہ گزرا۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تم یہاں کیوں رک گئے؟"

جہاں خان نے کہا۔ "میں پامر کو یہیں چھوڑ گیا تھا!"

روزی نے بے چینی سے کہا۔ "یہاں کہاں، یہاں تو کوئی سر چھپانے کی جگہ تک نہیں؟"

"ہاں روزی تم صحیح کہہ رہی ہو" پھر ایک طرف جاتا ہوا بولا۔ "ادھر آؤ تمہارے ساتھ مجھے یقین ہے کہ میں پامر کو ضرور تلاش کر لوں گا تم مایوس نہ ہو!"

روزی اب بھی اس کی طرف سے مطمئن نہ تھی، اس کے خیال میں آج جہان خان گمراہ ہو گیا تھا اور وہ اس کی عزت آبرو لوٹنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں تھا۔

وہ بھاگ کر ایک کھلی جگہ پر چلی گئی، بولی "میں کہیں نہیں جاؤں گی، آخر تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

جہان خان نے ہونٹ بھینچ لئے، بولا "ناداں لڑکی! مجھ پر شک نہ کر، میں یہاں تیرے پامر کی تلاش میں آیا ہوں۔"

روزی سہمی ہوئی وہیں کھڑی رہی، ادھر جہان خان تنہا ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا، ایک دیودار کے سائے میں ہڈیوں کا ایک پنجر اس طرح پڑا تھا کہ اس کا سر ایک یتیم مدور پتھر کے نیچے لٹک رہا تھا اور جسم کے دوسرے اعضا جنگلی درندے نوچ نوچ کر کھا گئے تھے، اسی نے جھک کر پنجر کے شانے کی ہڈی کا اس نشان کو تلاش کیا جو اس کی گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔ وہاں کی ہڈی جھڑی ہوئی تھی پھر اس نے زخمی پنڈلی کا نشان بھی تلاش کر لیا اور چیختا ہوا روزی کی طرف دوڑا۔

"روزی جلدی آؤ، تمہارا پامر مل گیا، ادھر آؤ۔ یہاں دیکھو۔ دیکھو یہاں دیودار کے نیچے تمہارا پامر پڑا ہوا ہے!"

روزی سہمی ہوئی دل نہ چاہنے کے باوجود جہان خان کے پاس چلی گئی۔ جہان خان نے اسے ہڈیوں کے پنجر کے سرہانے کھڑا کر دیا اور کہا "یہ رہا تمہارا پامر، اگر پہچان سکتی ہو تو پہچان لو۔"

روزی کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ شاید جہان خان کا دماغی توازن جاتا رہا ہے، وہ سہمے سے تو کچھ بھی نہ بولی بس رحم آمیز نظروں سے جہان خان کو دیکھنے لگی۔

جہان خان نے ٹھہرے ٹھہرے غمزدہ لہجے میں پامر سے مقابلے کی ساری روداد بیان کر دی، اس کے بعد بولا "میں نے یہیں بے گور و کفن چھوڑ دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر میں سال بعد بھی یہاں آؤں گا تو اس کا پنجر یہیں کہیں نہ کہیں مل ضرور جائے گا۔ کیونکہ یہاں کون ہے جو کسی کی تجہیز و تکفین کرے؟"

روزی نے یقین نہ کرنے کے انداز میں پوچھا "لیکن تم ہمیشہ یہ بات چھپاتے کیوں رہے؟"

جہان خان نے جواب دیا "صرف اس لئے کہ مجھ سے غلطی میں جو سرزد ہو گیا تھا تم پر اس کا اظہار کر کے تمہیں رکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔"

روزی نے کہا "لیکن اب بھی میں یہ کس طرح یقین کر لوں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو

وہ بیچ ہے!"

"تمہاری مرضی!" جہاں خان نے کہا۔ "یقین نہ کرنے سے تم زندگی بھر یا مرکا انتظار کرتی رہو گی اور کچھ نہیں، اور میں تمہیں انتظار کی ان جان لیوا سا عتوں سے بچانا چاہتا ہوں!"

روزی آہستہ آہستہ روتی رہی، سامنے حدِ نظر تک پھیلا ہوا نیلگوں آسمان، اپنے بے کراں خلا اور لامتناہی وسعتوں سے روزی کی تنہائی اور دل کے خلا میں گھاؤ ڈال رہا تھا۔

جہاں خان نے اچانک پیچھا چھڑانے والے انداز میں سوال کیا۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

روزی ہکا بکا اس کی صورت دیکھنے لگی، بولی "میں کیا بتاؤں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا!"

جہاں خان نے کہا۔ "میں تمہیں کالی کٹ لئے چلتا ہوں، وہاں تمہیں کسی بحری جہاز میں بٹھا کر فرانس روانہ کر دوں گا۔ تم اپنے وطن واپس جاؤ کیونکہ اب فرانس والوں کے لئے اس ملک میں کوئی گنجائش نہیں رہی!"

روزی کی نیت کچھ اور تھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نہیں کہہ سکی بولی۔ "اگر میں یہیں اسی ملک میں رہنا چاہوں تو؟"

جہاں خان نے کہا۔ "یہاں تم کس کے پاس رہو گی؟"

روزی نے پوچھا۔ "تم کہاں جاؤ گے؟"

جہاں خان نے جواب دیا۔ "کچھ پتہ نہیں، لیکن یہ طے ہے کہ ان حالات میں، میں تمہارا ساتھ نہیں نبھا سکتا!"

روزی نے کہا۔ "پھر تم مجھے کالی کٹ پہنچا دو، میں وطن واپس جاؤں گی!"

جہاں خان نے اسے کالی کٹ پہنچا دیا وہاں اس نے روزی کو ایک تجارتی جہاز پر سوار کر کے فرانسیسی حکومت کے نام خاصا بھاری رقم کا ڈرافٹ بھیج دیا۔ ڈرافٹ سے فرانسیسی حکومت نے اسے فرانس روانہ کر دیا۔ جہاں وہ نارمنڈی کے شہر روون چلی گئی جہاں اس کا آبائی مکان اس کا منتظر تھا۔ اس نے ہندوستان سے چلتے وقت جہاں خان کو اپنا روون کا پتہ دے دیا تھا جسے اس نے بے دلی سے لے لیا تھا۔

کالی کٹ سے غائب ہو کر، کچھ عرصے بعد جہاں خان بیس پچیس ہزار سواروں کے ساتھ مرہٹوں کی سرحد پر نمودار ہوا اور ان کے سردار کو کھلے اور پرسرار کے سمندوں کو نیزے پر چڑھا کر سلطان شہید کے دشمنوں کو لرزا دیا۔ انگریز اس کی تلاش میں اپنی توجہیں لئے سرگرداں رہے لیکن جہاں خان کے پاس چونکہ کوئی قلعہ یا قطعۂ زمین نہ تھا اس لئے یہ آوارہ گرد چھاپہ مار کوہستانی

سلسلوں اور جنگلوں کی خاک چھانتا ہوا، اچانک یوں غائب ہوا کہ تاریخ اس کے انجام کی ستی نشان دہی سے آج تک قاصر ہے۔

دوسری طرف لندن میں، دریائے سین کے کنارے روزی یہ آس لگائے جیتی رہی کہ ہو سکتا ہے کسی دن پائرلے تلاش کرتا ہوا لندن پہنچ کر اسے ششدر کر دے اور اس کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جائیں، روزی کے دل میں کہیں جہاں خان بھی موجود تھا جسے اس نے چلتے وقت اپنا پتہ دے دیا تھا۔ روزی کا خیال تھا کہ یہ آوارہ گرد، مایوس ترین انسان، ممکن ہے کسی دن انتہائے ناامیدی اور روزی کی محبت میں فرانس کا رخ کرے، اور اپنی بقیہ زندگی روزی کی قربت میں گزارنے پر آمادہ ہو جائے لیکن یہ دونوں ہی بے وفا نکلے اور انہوں نے روزی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انتظار کی کشاکش میں مبتلا رکھا۔

(ختم شد)